اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

سنت کے مطابق نماز پڑھنا
نماز ۔ مناجات الٰہی کا نام
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
نیک لوگوں کی صحبت
عبدیت کاملہ
امت میں اختلاف کا سبب
جدید تعلیم کے نتائج
بغیر علم کے مسئلہ بتانا
گیارہویں شریف
تعلق مع اللہ اور تصوف

جلد ہشتم

مکتبہ لدھیانوی

www.shaheedeislam.com

اصلاحی مواعظ

شہیدِ اسلام

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

باہتمام: محمد طلحہ طاہر

نبیرہ شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

ناشر

مکتبہ لدھیانوی

سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

03212115502

www.shaheedeislam.com

اصلاحی مواعظ

تالیف : شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ہمارے دادا جان شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ جہاں تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء کے امام تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو وعظ وتقریر اور زبان و بیان کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپؒ کے مواعظ و بیانات نہایت سادہ ،موثر، عام فہم اور مسحور کن ہوتے تھے۔ اندازِ بیان میں ناصحانہ و مشفقانہ رنگ غالب ہوتا،مسلمانوں کی خیرخواہی کے جذبہ سے سرشاراور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے وہ موثر مواعظ و بیانات جن سے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا، انہیں کیسٹ میں محفوظ کرلیا گیا تھا جسے بعد میں ڈیجیٹائز کیا گیا۔ جو کہ ''شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم پر دستیاب ہیں۔ان میں سے تقریباً ۱۳۵ کیسٹوں سے ۸ ضخیم جلدیں ''اصلاحی مواعظ'' کے نام سے مرتب کی گئیں۔جن میں تخریج کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ پر اعراب کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔اس طرح آٹھ جلدوں پر مشتمل یہ خوبصورت گلدستہ تیار ہوگیا ہے جو کہ علماء، طلبا، خطبا، مقررین، واعظین اور عوام الناس کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

حضرت شہیدِ اسلامؒ کی دیگر تصانیف کی طرح ''اصلاحی مواعظ'' (آٹھ جلدوں پر مشتمل اس گلدستے کو بھی ''شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم سے عام کرنے پر ہم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سر بسجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ہمارے اکابر کے علوم و فیوض کو عام فرمائے ، خلقِ خدا کے لیے نافع اور ہمارے اکابرین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔آمین

جن حضرات کی دعاؤں،توجہات اور سرپرستی سے اس اہم کام کی تکمیل ہو پائی،میں ان کا بے حد شکرگزار ہوں،خصوصاً میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد سعید لدھیانوی دامت برکاتہم،شاہینِ ختمِ نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا دامت برکاتہم اور شیخ ڈاکٹر ولی خان المظفر حفظہ اللہ،جن کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمر میں برکت عطا فرمائے اور صحت و عافیت کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔اسی طرح حافظ محمد طلحہ طاہر(ناظم مکتبہ لدھیانوی) جناب امجد رحیم چوہدری سمیت تمام معاونین کہ جن کا کسی بھی طرح تعاون حاصل رہا،تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا و رضوان سے نوازے۔آمین

محمد الیاس لدھیانوی
بانی و منتظم ''شہیدِ اسلام پورٹل''

www.shaheedeislam.com

info@shaheedeislam.com

+92 321 9264592

۱۵/۹/۱۴۴۷ھ - ۵/۳/۲۰۲۶ء

نوٹ: Mobile اور iPad وغیرہ میں بہتر طور پر دیکھنے کے لیے Adobe Acrobat کو PDF Reader کے طور پر استعمال کریں۔

فہرست مقالات

تفصیلی فہرست

نماز کا بیان

نماز کی فضیلت

نماز کا سیکھنا

نماز مناجاتِ الٰہی کا نام ہے

سنت کے مطابق نماز پڑھنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرنا

عبدیتِ کاملہ کی ضرورت

تعلق مع اللہ اور تصوف

نیک لوگوں کی صحبت

لڑائی جھگڑا کرنا مؤمن کی شان نہیں

اُمت میں اختلاف کا سبب

علم سے زیادہ عمل کا اہتمام

بغیر علم کے مسئلہ مت بتاؤ

جدید تعلیم اور اس کے نتائج

گیارھویں شریف

نجات دینے اور ہلاک کرنے والے اعمال

نماز کا بیان

نماز کی ایک خصوصیت اور ایک امتیاز دُوسری عبادات سے یہ ہے کہ نماز نام ہے حق تعالیٰ شانہٗ سے مناجات کا، مناجات بھی تنہائی میں، خلوَت میں، کوئی تیسرا درمیان میں نہیں ہے، یہ اپنے مولائے کریم سے جو کہنا چاہتا ہے کہے، اور جو مولائے کریم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے براہِ راست سنے، ان جسمانی اور حسی کانوں کو متوجہ کردے قراءت کی طرف، اور دِل کے کانوں کو بھی متوجہ کردے اور سراپا گوش بن جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

شیخ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ۔"

(کنز العمال ج:۷ ص:۲۸۴، حدیث نمبر:۱۸۸۸۹)

ترجمہ:... "نماز دِین کا ستون ہے۔"

دِین میں نماز کا مقام:

آپ جانتے ہیں کہ جب خیمہ کھڑا کرتے ہیں تو اس کے چاروں کونوں پر رسیاں باندھ دیتے ہیں، اور اس کے درمیان میں ایک چوب اور لکڑی ہوتی ہے، اس کے اُوپر خیمہ کھڑا ہوتا ہے، اس درمیان کی چوب، لکڑی اور بانس کو عماد کہتے ہیں، یا عمود کہتے ہیں، اگر وہ قائم ہو تو خیمہ قائم رہتا ہے، اگر اس کو بیچ سے کھینچ لیا جائے تو خیمہ گر جاتا ہے، یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دِین کی خیمے کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے اور فرمایا کہ نماز اس کا ستون ہے، یعنی نماز دِین کی چوب، درمیان کا بانس اور لکڑی ہے، جس پر یہ دِین کا خیمہ قائم ہے۔

جس کی نماز نہیں اس کا دِین نہیں:

جس شخص کی زندگی میں نماز قائم نہ ہو، اس کا دِین قائم نہیں۔ چنانچہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ۔"

(کنز العمال ج:۷ ص:۲۸۰، حدیث نمبر:۱۸۸۷۶)

ترجمہ:... "جس نے جان بوجھ کر نماز کو چھوڑ دیا وہ کافر ہوگیا۔"

علماء اس کی تأویل کرتے ہیں کہ جس نے نماز چھوڑی اس نے کفر کا کام کیا، یا کفر کے قریب پہنچ گیا، لیکن حدیث کے الفاظ یہی ہیں۔ اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ:

"اَلْفَرْقُ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔"

(ترمذی شریف ج:۲ ص:۸۶)

ترجمہ:... "آدمی اور کفر کے درمیان فاصلہ اور فرق کرنے والی چیز نماز ہے۔"

نماز سے حقِ رُبوبیت کی ادائیگی:

تو شیخؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، وتروں کی نماز واجب ہے، اور ان پانچ نمازوں کے ذریعے حق تعالیٰ شانہٗ کا حقِ رُبوبیت ادا کرنا ہے، انہیں پانچ نمازوں کے ذریعے بندے کا بندہ ہونا ثابت ہوگا اور انہی پانچ نمازوں کے ذریعے حق تعالیٰ کی رُبوبیت کا حق ادا ہوگا، تو جو شخص نماز کا تارک ہو، پنج گانہ نماز کا تارک ہو، وہ اپنے ہاتھ میں بندگی کی کوئی سند نہیں رکھتا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اور دُوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رَبّ ہونے کا کوئی حق ادا نہیں کرتا۔

تمام عبادات نماز کی تائید:

فرماتے ہیں کہ: صرف یہی ایک نماز ہے جس سے رُبوبیت کا حق ادا ہوتا

ہے اور بندگی کے معنی ثابت ہوتے ہیں، باقی تمام عبادتیں اسی نماز کی تائید کے لئے ہیں، نماز کے اندر جو مضمون پایا جاتا ہے اسی کی تاکید یا تائید کرنے کے لئے باقی سب عبادتیں ہیں۔

حضرت سہلؒ کا مقام:

حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ صوفیاء کے اِمام ہیں، حضرت جنید بغدادیؒ کے پیر و مرشد اور ماموں بھی ہیں، سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ سات سال کے تھے جب ان کی والدہ نے ان کو اپنے بھائی کے سپرد کردیا تھا کہ ان کو بھی کچھ اللہ تعالیٰ کا نام سکھاؤ۔ حضرت سہلؒ نے کہا کہ: بیٹا! یہ تسبیح لے لو اور ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' پڑھتے رہو، سات دن کے بعد مجھے بتانا کہ کیا کیفیت ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے سات دن کے بعد بتایا کہ حضرت! ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کا مضمون ایسا راسخ ہوگیا کہ مجھے اپنے وجود میں بھی تردّد ہے کہ میرا وجود ہے بھی کہ نہیں؟ کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ کے بغیر تو کوئی موجود نہیں۔ حضرت سہلؒ نے فرمایا کہ: کام بن گیا!

حضرت جنیدؒ کی ذہانت:

ایک رات حضرت جنید بغدادیؒ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، ان کے ماموں حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے ہاں صوفیاء کا اجتماع تھا اور گفتگو ہو رہی تھی مقامِ شکر پر، کہ شکر کس کو کہتے ہیں؟ سب اپنی اپنی بات کہہ رہے تھے، حضرت سہلؒ نے حضرت جنید بغدادیؒ کو بلایا کہ بیٹا: اِدھر آؤ! حضرت جنید بغدادیؒ کھیلتے ہوئے آگئے، حضرت سہلؒ نے پوچھا کہ: شکر کس کو کہتے ہیں؟ یہ حضرات جو یہاں تشریف فرما ہیں یہ کہہ رہے ہیں کہ شکر اس کو کہتے ہیں کہ کھانے کو مل جائے تو آدمی کھالے اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرے، نہ ملے تو پھر صبر کرے، اللہ تعالیٰ سے کوئی شکایت نہ کرے، حضرت جنید بغدادیؒ کہنے لگے کہ: یہ تو کوئی شکر نہ ہوا، یہ تو بلخ کے کتے بھی کرتے ہیں، ٹکڑا مل

جائے تو ٹھیک ہے، نہیں تو بیٹھے ہیں بے چارے۔ حضرت سہلؒ نے کہا کہ: بیٹا! تمہارے نزدیک شکر کے کیا معنی ہیں؟ حضرت جنیدؒ کہنے لگے کہ: میں تو یہ سمجھا ہوں کہ نہ ملے تو شکر کرے اور مل جائے تو لوگوں کو دیدے، ایثار کردے، اپنی پیٹ پوجا سے پہلے دُوسروں کا خیال رکھے۔

سنن، نوافل اور مستحبات کا مقام:

تو غرضیکہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ بہت اُونچے اکابر میں سے ہیں، یہ ارشاد فرماتے تھے کہ: حق تعالیٰ شانہٗ نے سنتیں جو رکھی ہیں یہ فرائض کی تکمیل کے لئے رکھی ہیں، تاکہ فرضوں کی تکمیل ہوجائے اور نوافل رکھے ہیں سنتوں کی تکمیل کے لئے اور آداب و مستحبات رکھے ہیں نوافل کی تکمیل کے لئے، جو شخص نوافل کا اہتمام نہیں کرتا وہ سنتوں کا اہتمام نہیں کرے گا، اور جو سنتوں کا تارک ہو، رفتہ رفتہ فرائض بھی اس سے غائب ہوجائیں گے۔ اور ساتھ ہی فرمایا ہے کہ: نوافل رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے سنتوں کی تکمیل کے لئے۔

بڈھے ہوگئے مگر نماز نہ سیکھی۔ شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت سہلؒ نے جو کچھ فرمایا ہے، یہی مضمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ: ایک آدمی کی اسلام میں مونچھیں سفید ہوجاتی ہیں ...داڑھی پہلے سفید ہوتی ہے، مونچھیں بعد میں سفید ہوتی ہیں ...لیکن اس کو نماز پڑھنا نہیں آئی، ساری عمر ٹکریں مارتا رہا لیکن نماز نہ پڑھنی آئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

”وَمَا أَكْمَلَ لِلّٰهِ صَلَاةً اَنَّ رَجُلًا يُشِيْبُ عَارِضَاهُ فِي الْاِسْلَامِ۔“

یعنی ایک آدمی کے رُخسار سفید ہوجاتے ہیں اسلام میں لیکن اس نے پوری عمر میں کامل ایک نماز بھی اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں پڑھی۔ عرض کیا گیا کہ: ”وَكَيْفَ ذَاكَ؟“ حضرت! یہ کیسے؟ فرمایا: ”لَا يُتِمُّ خُشُوْعُهَا وَتَوَاضُعُهَا وَاِقْبَالُهَا اِلَى اللّٰهِ“

نماز میں خشوع، نماز کے اندر تواضع اور نماز کے اندر اقبال الی اللہ یعنی توجہ الی اللہ جیسی چاہیے ویسی نہیں کرتا۔ ساری عمر نماز پڑھی، کبھی ایک نماز میں بھی ایسا اہتمام نہیں ہوا کہ آج میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر نماز پڑھنی ہے، آئے چار ٹھونگے لگا کر چلے گئے، بس ختم! گویا یوں کہو کہ بوڑھے ہوگئے لیکن نماز پڑھنی نہیں آئی۔

جیسے بہت سارے آدمی ہیں مگر قرآنِ کریم پڑھنا نہیں جانتے، بہت سارے اَن پڑھ ہیں، ان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا، کیوں؟ سیکھا ہی نہیں، بچپن سے سیکھنے کا اہتمام ہی نہیں کیا، حالانکہ بڑے ہوکر سیکھ لیتے تو تھوڑا بہت تو لکھنا پڑھنا آہی جاتا لیکن نہیں سیکھا، تو اس شخص نے یعنی بڑے میاں نے جس کی مونچھیں سفید ہوگئی ہیں، پوری عمر نماز نہیں سیکھی، پہلے دن جیسی نماز پڑھتا تھا ویسے ہی آج بھی پڑھ رہا ہے۔

نمازی براہِ راست اللہ تعالیٰ کے دربار میں:

حالانکہ نماز پڑھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا، اور وہ براہِ راست اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

’’اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ فُتِحَتْ لَہٗ أَبْوَابُ الْجِنَانِ وَکُشِفَتْ لَہُ الْحجبُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ رَبِّہٖ۔‘‘

(کنز العمال ج:۷ ص:۲۹۸، حدیث:۱۸۹۶۷)

ترجمہ:... ’’بندہ جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے درمیان اور اس کے درمیان سے پردہ اُٹھادیتے ہیں۔‘‘

زہے قسمت ان لوگوں کی کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے درمیان اور ان کے درمیان پردہ اُٹھادیں، ان کو تنہائی میں بلالیں اور ان سے گفتگو فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہِ طور پر گفتگو فرمائی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معراج میں گفتگو فرمائی تھی، کتنا ہی خوش نصیب ہے وہ

بندہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے درمیان اور اس کے درمیان کا پردہ اُٹھا کر اس سے فرمائیں کہ: ہاں! کہو کیا کہتے ہو؟ اور اپنے چہرۂ انور کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ اس کی طرف متوجہ ہوجائیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

”اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا قَامَ یُصَلِّیْ أَقْبَلَ اللهُ عَلَیْهِ بِوَجْهِهٖ۔“ (کنز العمال ج:۷ ص:۲۸۶، حدیث:۱۸۹۰۵)

نمازی کے سر سے آسمان تک فرشتے:

جب بندہ نماز شروع کرتا ہے، ملائکہ اس کے دونوں کندھوں سے فضاء تک پھیل جاتے ہیں، نماز میں اس کی اقتدا کرتے ہیں اور اس کی دُعا پر آمین کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہزاروں فرشتے اس کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جب یہ نماز میں کوئی دُعا کرتا ہے تو فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں اور آسمان کی بلندی سے اس نمازی کے سر کی چوٹی پر حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتوں کی باران ہوتی ہے، رحمت نثار ہوتی ہے، اور ایک پکارنے والا پکارتا ہے: اگر نمازی کو یہ معلوم ہوجاتا کہ وہ کس سے مناجات کر رہا ہے تو نہ وہ کسی اور کی طرف اِلتفات کرتا اور نہ ہی اس سے واپس ہوتا۔

نماز مناجاتِ اِلٰہی کا ذریعہ:

میں نے عرض کیا تھا کہ نماز کی ایک خصوصیت اور ایک امتیاز دُوسری عبادات سے یہ ہے کہ نماز نام ہے حق تعالیٰ شانہٗ سے مناجات کا، مناجات بھی تنہائی میں، خلوَت میں، کوئی تیسرا درمیان میں نہیں ہے، یہ اپنے مولائے کریم سے جو کہنا چاہتا ہے کہے، اور جو مولائے کریم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے براہِ راست سنے، ان جسمانی اور حسی کانوں کو متوجہ کردے قراءت کی طرف، اور دِل کے کانوں کو بھی متوجہ کردے اور سراپا گوش بن جائے۔

ایک رکعت میں کائنات کی عبادتیں:

شیخ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے نماز کی ایک رکعت میں تمام فرشتوں کی عبادتیں جمع فرمادی ہیں، بلکہ تمام کائنات کی عبادتیں اللہ تعالیٰ نے جمع فرمادی ہیں، اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے ایسے ہیں جو قیام کی حالت میں ہیں، جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اسی طرح کھڑے ہیں، نہ حس و حرکت، نہ اِدھر اُدھر دیکھنا، نیت باندھ کر کھڑے ہیں، اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھ رہے ہیں، کچھ فرشتوں کو جب سے پیدا فرمایا جب سے اب تک رُکوع کی حالت میں ہیں، اور کچھ فرشتوں کو جب سے پیدا فرمایا وہ اس وقت سے اب تک سجدے کی حالت میں ہیں، انسان کی ایک رکعت میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام فرشتوں کی عبادتوں اور ہیئتوں کو جمع کردیا ہے۔ جو فرشتے قیام کرنے والے ہیں انسان قیام کی حالت میں ان کے ساتھ شریک ہوگیا، جو رُکوع کرنے والے ہیں رُکوع میں ان کے ساتھ شریک ہوگیا، اور سجدے کی حالت میں سجدے والوں کے ساتھ شریک ہوگیا۔

پھر کائنات میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جو قیام کی حالت میں ہیں، جیسے درخت ہیں، عمارتیں ہیں، ستون ہیں، قیام کی حالت میں کھڑے ہیں، اور کچھ مخلوق ایسی ہے جو رُکوع کی حالت میں ہے، جیسے چوپائے ہیں، اور کچھ مخلوق ایسی ہے جو سجدے کی حالت میں ہے، جیسے زمین پر پھیلنے والی بیلیں وغیرہ، اور کچھ مخلوق ایسی ہے، جو قعدے کی حالت میں ہے جیسے پہاڑ ہیں، اور یہی ان کی عبادت ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:

”وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰـكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔“ (بنی اسرائیل:۴۴)

ترجمہ:... ”اور نہیں ہے کوئی چیز مگر وہ تسبیح کہتی ہے اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو۔“

نماز جامع تو انسان بھی نسخۂ جامع:

تو نماز کے اندر اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی عبادتوں کو سمو دیا، اس لئے کہ یہ حضرت انسان بھی نسخۂ جامع تھا، پوری کائنات اور کائنات کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ اس حضرتِ انسان کے اندر موجود ہے، سورج اور چاند اس کے اندر موجود ہیں، پہاڑ اس کے اندر موجود ہیں، نہریں اس کے اندر موجود ہیں اور چل رہی ہیں، کھیتیاں اس میں لہلہا رہی ہیں، آسمان کی کیفیات اس کے اندر موجود ہیں، زمین کی کیفیتیں اس کے اندر موجود ہیں، یہ حضرت انسان کائنات کا نسخۂ جامع ہے، اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کچھ کچھ نمونے، اور پوری کائنات کے نسخے اس کے اندر جمع کر دیئے ہیں، فرشتوں کی صفت اس کے اندر موجود ہے، درندوں کی صفت اس کے اندر موجود ہے، پرندوں کی صفت اس کے اندر موجود ہے، نباتات کی صفت اس کے اندر موجود ہے، جمادات کی صفت اس کے اندر موجود ہے، علویات کی صفت اس کے اندر موجود ہے۔

ہمارے حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کی ایک تقریر اس موضوع پر بہت تفصیل کے ساتھ ہے، حضرت نے اس مضمون کو ذکر فرمایا، میرا مقصود اس مضمون کو بیان کرنا نہیں، صرف شیخ کی بات کی شرح کرنا ہے۔

خدائی مہمان کو خدائی تحفہ:

فرماتے ہیں کہ: یہ نماز جامع ہے تمام فرشتوں کی عبادتوں کے لئے اور اسی کے ساتھ جامع ہے تمام کائنات کی عبادتوں کے لئے، یہ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں ویسے ہی اللہ تعالیٰ نے تحفہ نہیں دیا، اس کے اندر کوئی چیز تھی، اس نماز کے اندر کوئی خاص راز تھا جو واپسی پر شاہی مہمان کو بطور تحفہ دیا، شاہی مہمان نہیں، بلکہ خدائی مہمان کو واپس آتے ہوئے تحفہ عطا فرمایا، صرف نماز نہیں، بلکہ اور بہت سارے تحفے دیئے تھے، ان میں سے ایک تحفہ نماز کا ہے، جو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا تھا۔

پانچ پر پچاس کا ثواب:

اور یہ تحفہ بھی پچاس نماز روزانہ، عشاق کو اس پر سبحان اللہ کہنا چاہئے، پچاس بار حاضری کی اجازت ہے، نہیں، بلکہ پچاس نماز کا تحفہ لے کر آرہے تھے، راستے میں چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، چنانچہ حدیث میں ہے:

”.... قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: فَفَرَضَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰی أُمَّتِی خَمْسِیْنَ صَلٰوۃً، فَرَجَعْتُ بِذٰلِکَ حَتّٰی مَرَرْتُ عَلٰی مُوْسٰی فَقَالَ: مَا فَرَضَ اللّٰہُ لَکَ عَلٰی أُمَّتِکَ؟ قُلْتُ: فَرَضَ خَمْسِیْنَ صَلٰوۃً، قَالَ: فَارْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَاِنَّ أُمَّتَکَ لَا تُطِیْقُ، فَرَاجَعْتُ فَوُضِعَ شَطْرُھَا فَرَجَعْتُ اِلٰی مُوْسٰی قُلْتُ: وُضِعَ شَطْرُھَا، فَقَالَ: رَاجِعْ رَبَّکَ فَاِنَّ أُمَّتَکَ لَا تُطِیْقُ ذٰلِکَ، فَرَاجَعْتُ فَوُضِعَ شَطْرُھَا فَرَجَعْتُ اِلَیْہِ، فَقَالَ: اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ فَاِنَّ أُمَّتَکَ لَا تُطِیْقُ ذٰلِکَ، فَرَاجَعْتُہٗ فَقَالَ: ھِیَ خَمْسٌ وَّھِیَ خَمْسُوْنَ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ، فَرَجَعْتُ اِلٰی مُوْسٰی فَقَالَ: رَاجِعْ رَبَّکَ، فَقُلْتُ: اِسْتَحْیَیْتُ مِنْ رَّبِّیْ ثُمَّ انْطَلَقَ بِیْ.....“ (بخاری ج:۱ ص:۵۱)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: کیا ملا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پچاس نمازیں ملی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آپ کی اُمت اس کی طاقت نہیں رکھے گی، اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی درخواست کیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ہاں واپس گئے، اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں معاف کردیں، پینتالیس رہ گئیں، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بارگاہِ ربّ العزت کے درمیان نو چکر لگے، جب پانچ نمازیں رہ گئیں تو حق تعالیٰ شانہٗ

نے ارشاد فرمایا: یہ پڑھنے میں پانچ ہیں اور اجر و ثواب میں پچاس، میرے یہاں بات تبدیل نہیں ہوتی، تمہیں یہ بتانے کے لئے پانچ پچاس کی جگہ ہی ہیں، پچاس فرض کی گئی تھیں، لیکن اصل مقصود پانچ ہی کا فرض کرنا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور فرمایا کہ: پانچ رہ گئی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: تخفیف کی درخواست کرو، واپس جاؤ، میں نے بنی اسرائیل کا تجربہ کیا ہے، آپ کی اُمت اس کی طاقت نہیں رکھے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اب تو اتنی بار میں نے اپنے رَبّ سے رُجوع کیا، اب تو مجھے شرم آنے لگی ہے، جاتے ہوئے مجھے شرم آنے لگی ہے۔

تو یہ تحفہ معراج ہے، کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ یہ یوں ہی تو نہیں، اس کے اندر کوئی رمز تھا، کوئی راز تھا، یہ تحفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا اور یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بوجھ نہیں ڈالا تم پر، تمہیں عطیہ دیا ہے، اب ہماری بدمذاقی کا کیا علاج کہ ہمارے لئے یہ عطیہ بوجھ بن گیا ہے، نعوذ باللہ من ذالک! استغفر اللہ!

گناہوں کی نحوست:

اکابر فرماتے ہیں کہ گناہوں کی پہلی نحوست یہ ہے کہ طاعات اور عبادت کی لذت چھین لی جاتی ہے، اب ہمارے لئے نماز میں لذت نہیں رہی، الا ماشاء اللہ، یہ نماز ہمارے لئے تو بوجھ اور ایک بیگار بن گئی ہے کہ گویا بہت ہی سخت کام ہے، جو ہمارے ذمے ڈال دیا گیا ہے، کیا محبوب سے باتیں کرنا بوجھ ہوتا ہے؟ ... اللہ تعالیٰ کی شان!... حالانکہ جب کبھی اَذان میں دیر ہوجاتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

”یَا بِـلَالُ! أَقِمِ الصَّلٰوۃَ أَرِحْنَا بِھَا۔“

(کنز العمال ج:۷ ص:۲۹۴ حدیث:۱۸۹۴۶)

ترجمہ:... ”بلال! اَذان کہو، ہمیں راحت پہنچاؤ۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے، صحابہ کرامؓ کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے مقبول

بندوں کے لئے نماز عطیہ اور تحفہ ہے، اور ہماری بدمذاقی نے اس کو بوجھ بنالیا ہے، ہم اس کا ایک بوجھ اُتارتے ہیں۔

عبادات پہلے دوا بعد میں غذا:

ہمارے حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے تھے کہ:

”یہ عبادات جب تک کہ آدمی کے اندر رچ نہ جائیں
اس وقت تک ان کو دوا سمجھو، اور جب یہ رچ جاتی ہیں تو پھر یہ
غذا بن جاتی ہیں۔“

حضرتؒ کے اس ارشاد کی شرح یہ ہے کہ دوا تو آدمی پیتا ہے ناگواری کے ساتھ، لیکن بھوک لگی ہوئی ہو تو کھانا ناگواری کے ساتھ نہیں کھاتا، نہایت شوق اور رغبت کے ساتھ کھاتا ہے، اس لئے کہ یہ کھانا اس کے لئے غذا بن گیا ہے، اس کی غذا ہے، اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اور بیمار آدمی کو گھر والے کہتے ہیں کہ دوائی کھالو، کہتا ہے کہ: میں نہیں کھاؤں گا، زبردستی اس کو کھلاتے ہیں، چنانچہ مریض اگر بچہ ہوتا ہے تو گھر والے اس کے ساتھ زبردستی کرتے ہیں، اگر بڑا ہوتا ہے تو ایسی دوائی پینے کے لئے، جس سے منہ کا ذائقہ خراب ہوجائے، گھر والے منّت سماجت کرتے ہیں، حضرت فرماتے ہیں کہ: جب تک نماز تمہیں گراں گزرتی ہے اس وقت تک اس کو دوا سمجھو اور جب اس کی گرانی ختم ہوجائے اور اس میں لذت آنے لگے تو پھر یہ غذا بن جائے گی۔

شیخ فرماتے ہیں کہ: تم نے سنا ہے کہ کچھ فرشتے قیام میں ہیں، کچھ سجدے میں ہیں، اس قیام میں، اس رُکوع میں، اس سجدے میں ان کو ایک خاص ہیئت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں، تم نماز کے ہر رُکن میں فرشتوں کی اس ہیئت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرو، وہ ہیئت تمہارے اندر راسخ ہوجائے۔

نماز کی فضیلت

حدیث شریف میں ہے:

’’جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہوتے ہیں، جب بندہ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری طرف سے نظر ہٹا کر کس کی طرف دیکھ رہے ہو؟ ...میں تو تمہارے سامنے ہوں میری طرف سے توجہ ہٹا کر کسی اور کی طرف اِلتفات کر رہے ہو؟ کس کی طرف دیکھ رہے ہو وہ تمہارے لئے مجھ سے بہتر ہے جس کو دیکھ رہے ہو؟ میری طرف اِلتفات کرو، میں تمہارے لئے ان سے بہتر ہوں جن کی طرف تم اِلتفات کر رہے ہو۔‘‘

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

فلاح اور کامیابی کے لئے شرط ہے نماز میں خشوع ہونا، اگر نماز میں خشوع نہ ہوتو کامیابی بھی نہیں ہوگی اور حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

”وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ“ (طٰہٰ:۱۴)

ترجمہ:...”اور قائم کیجئے نماز کو میری یاد کے لئے۔“

جب نماز اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے ہے، تو اس میں بھول کیسے ہوسکتی ہے؟ بھولنا تو یاد کے خلاف ہے نا! جب نماز ہوتی ہی یاد کے لئے ہے، تو اس میں بھولنا نہیں چاہئے، نماز میں اسی بھول سے بچنے کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں:

”یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔“ (النساء:۴۳)

ترجمہ:...”اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے اس حال میں کہ تم مدہوش ہو، یہاں تک کہ تم جان لو وہ چیز جو تم کہہ رہے ہو۔“

یہ اس وقت کی بات ہے جب نشہ حلال تھا، حرام نہیں ہوا تھا، اسی لئے فرمایا: جب تم نشے میں ہوتو نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ تمہیں معلوم نہ ہونے لگے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

نماز میں غفلت کی ممانعت:

تو معلوم ہوا کہ جب آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ مجھ سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں؟ اس کو نماز کے قریب نہیں جانا چاہئے؟ اس کی نماز نہیں ہے، تو جو لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے منہ سے کیا الفاظ نکل رہے ہیں؟ وہ کیسے نماز پڑھتے ہیں؟ جس طرح مدہوش آدمی عقل کے ہوتے ہوئے نماز نہیں پڑھ سکتا، یعنی جب اس کی عقل حاضر نہ ہو، اس حالت میں وہ نماز نہیں پڑھ سکتا ٹھیک اسی طرح غیر مدہوش غافل آدمی کو بھی حضورِ عقل کے ساتھ نماز نہیں پڑھنی چاہئے، کیونکہ اس طرح تو غافل اور مدہوش دونوں برابر ہوئے۔

خشوع کا ادنیٰ درجہ:

اس لئے خشوع کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی یہ جانتا ہو کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟ اور اگر خیال کسی اور طرف گیا ہوا ہے اور زبان سے الفاظ نکل رہے ہیں تو یہ زبان قابلِ اعتبار نہیں۔

بارگاہِ الٰہی میں اِستحضار کی تلقین:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ طور پر تشریف لے گئے تھے تو ان کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ:

”فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی۔“
(طٰہٰ:۱۲)

ترجمہ:...”اپنے دونوں جوتے اُتار دو، تم وادیٔ مقدس طویٰ میں ہو۔“

یہی وجہ ہے کہ یہودی لوگ جوتوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے، موزے پہنے ہوئے ہوں تو نماز نہیں پڑھتے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جوتے اُتارنے کا حکم دیا تھا۔

یہودیوں کی مخالفت:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”عَنْ یَعْلَی بْنِ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ عَنْ أَبِیهِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: خَالِفُوا الْیَهُوْدَ فَإِنَّهُمْ لَا یُصَلُّوْنَ فِیْ نِعَالِهِمْ وَلَا خِفَافِهِمْ۔“ (ابوداؤد ج:۱ ص:۹۵)

ترجمہ:...”حضرت یعلیٰ بن شداد بن اوس اپنے باپ اوس بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ ...جوتوں میں نماز پڑھا کرو... یہودیوں کی مخالفت کرو کیونکہ وہ جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔“

جوتوں کے ساتھ نماز کا مسئلہ:

ہمارے اہلِ حدیث بھائی اس پر عمل کرتے ہیں، یعنی جوتوں کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، یہ مسئلہ درمیان میں آگیا تو عرض کردوں کہ بھائی جوتے اگر پاک ہوں تو نماز ان میں ہوجائے گی، نجس نہ ہوں، پلید نہ ہوجائیں، اُوپر سے، نیچے سے، اندر سے، باہر سے پاک ہوں تو نماز جوتا پہن کر ہوجائے گی، اور حدیث پاک کا یہی منشا ہے کہ یہودی جوتوں کے اندر نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے، اہلِ حدیث سمجھتے ہیں کہ ہماری شریعت میں جوتے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن وہ جوتے کیسے ہیں؟ کہاں کہاں جوتے لے کر پھرتے ہیں؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہوگا۔ جوتے اگر پاک ہوں تو ان کو پہن کر نماز پڑھ سکتے ہیں، اور اگر جوتے ناپاک ہوں تو ان کو پہن کر کیسے نماز پڑھیں گے؟ اور جوتے کے ساتھ آپ گندگی لے کر جاتے ہیں، گندی جگہوں میں جاتے ہیں، ان کو مسجد میں کیسے لائیں گے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مسجدیں بنی ہوئی ہیں ماشاء اللہ بہترین قسم کے فرش لگے ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ نہیں ہوتا تھا، جیسے کوئی مسجد زیر تعمیر ہوتی ہے نا! تو باہر فرش میں لوگ جوتے لے کر آتے ہیں، اندر تک وہ فرش بنا ہوا نہیں ہوتا، کچی جگہ ہوتی ہے، خراب جگہ ہوتی ہے، حالانکہ وہ مسجد ہے لیکن لوگ وہاں جوتے لے کر آتے ہیں، کیونکہ فرش بنا ہوا نہیں ہوتا، جوتے پیچھے نہیں اُتارتے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں مسجد کا فرش بنا ہوا نہیں تھا، اس لئے لوگ جوتے لے کر مسجد کے اندر دالان تک آجاتے تھے۔ اور ہماری مسجد میں اگر کوئی جوتے لے کر آئے گا تو وہ فرش گندہ کرے گا، وہ کنکریوں کا فرش تھا، جیسا کہ اب بھی کچا فرش ہو تو لوگ آتے ہیں، اس کا مضائقہ نہیں سمجھا جاتا، بے ادبی نہیں سمجھی جاتی، یہاں اگر جوتے لے کر آئیں گے تو بے ادبی سمجھی جائے گی۔

جوتے کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھنا:

یہیں سے نمازِ جنازہ کا حکم معلوم ہوجائے گا کہ بہت سارے لوگ جوتوں کے اُوپر کھڑے ہوجاتے ہیں، اور بہت سارے لوگ جوتے پہن کر نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں، تو اگر جوتے اُوپر سے، نیچے سے، اندر سے اور باہر سے پاک ہوں تو ان کو پہن کر نماز پڑھ سکتے ہو، کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر اُوپر سے پاک ہوں اور نیچے سے پاک نہ ہوں تو ان کے اُوپر کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتے ہیں، پہن کر نماز نہیں پڑھ سکتے، اس کی مثال بالکل ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک چادر ہے، چادر کا ایک کونا یا ایک کنارہ ناپاک ہے ہم اس کو بچھا کر پاک جگہ پر نماز پڑھ لیتے ہیں، لیکن اس کو پہن کر نماز پڑھیں گے تو ٹھیک نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں یہ پوری چادر ہمارے تابع ہوگی، ادھر جوتے اگر پہنے ہوئے ہوں اور نیچے سے یہ ناپاک ہوں یا کسی جگہ سے ناپاک ہوں، تو ان کو

پہن کر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہوگا، اور اگر نیچے سے ناپاک ہیں اُوپر سے پاک ہیں تو ان پر کھڑے ہوکر نماز پڑھنا دُرست ہوگا، اور اگر اُوپر سے پاک ہونے کا بھی یقین نہیں ہے تو پھر جوتوں کو اُتار دینا چاہیئے۔

صوفیا کے ہاں ''اِخْلَعْ نَعْلَیْکَ'' کا مصداق:

تو شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ: آپ اپنے دونوں جوتوں کو اُتار دو، تم وادیٔ مقدس طویٰ میں ہو۔ اس کے معنی تو بالکل واضح ہیں۔

لیکن صوفی حضرات کچھ اور معنیٰ بھی کرلیا کرتے ہیں، اس معنیٰ کا بھی انکار نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ دو جوتوں سے مراد ہے بیوی اور بکریاں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی اہلیہ تھیں، انہیں کو کہا تھا کہ مجھے آگ نظر آرہی ہے، میں جاکر دیکھتا ہوں کہ کوئی آگ مل جائے یا وہاں سے کوئی راستے کا پتا چل جائے، راستہ بھی بھولا ہوا تھا، سردی بھی لگ رہی تھی، کپڑا پاس نہیں تھا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: مجھے آگ نظر آرہی ہے، میں جاکر دیکھتا ہوں، تم یہاں ٹھہرو، تو آگ لینے کے لئے گئے تھے، بقول شاعر:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے

تو بکریوں کا ریوڑ بھی ساتھ تھا اور بیوی بھی ساتھ تھیں، ان کو ایک جگہ بٹھاکر آگ لینے گئے تھے، وہاں سے آواز آئی:

''اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی۔ وَاَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی۔ اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔''

(طٰہٰ:۱۴)

ترجمہ:... ’’میں ہوں تیرا رَبّ سو اُتار ڈال اپنی جوتیاں، تو ہے پاک میدان طویٰ میں اور میں نے تجھ کو پسند کیا ہے، سو تو سنتا رہ جو حکم ہو، میں جو ہوں اللہ ہوں، کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے، سو میری بندگی کر اور نماز قائم رکھ، میری یادگاری کو۔‘‘

تو صوفیا نے نعلین کی یہ تفصیل کی ہے کہ ان دو جوتوں سے مراد ہے بیوی اور بکریاں، یعنی اب بیوی اور بکری کا خیال چھوڑ دو، کہتے ہیں کہ غریب التفسیر میں ہے کہ نعلین سے مراد ہے بیوی اور بکریوں کی فکر۔ اب نماز کے اندر کسی اور کی فکر یہ مدہوشی ہے۔

یہ بھی مدہوشی ہے:

شیخ فرماتے ہیں یہ بھی مدہوشی ہے، زبان پر تو تسبیح چل رہی ہے اور دِل میں گاؤ وخر ہے، یعنی گائے اور گدھا۔ بیوی ہو، بچے ہوں، دُکان ہو، دوست احباب ہوں، دُوسری چیزیں ہوں، یہ گاؤ وخر ہیں، تو نماز جب پڑھو تو ’’فَاخْلَعْ نَعْلَيْکَ‘‘ اپنے جوتوں کو اُتار دو، بیوی بچوں اور مال اور دولت کے خیالات کو ترک کردو، اُن میں مدہوش نہ رہو، ہوش میں آکر نماز پڑھو۔

صحابہؓ کے خشوع کا نقشہ:

نماز میں دائیں بائیں اور آسمان کی طرف دیکھنا بھی خشوع کے منافی ہے، جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ:

’’عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيْرِيْنَ قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْفَعُوْنَ أَبْصَارَهُمْ اِلَى السَّمَاءِ فِى الصَّلٰوةِ وَيَلْتَفِتُوْنَ يَمِيْنًا وَّشِمَالًا فَأَنْزَلَ اللهُ:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، فَقَالُوْا بِرُؤُسِهِمْ فَلَمْ يَرْفَعُوْا أَبْصَارَهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الصَّلٰوةِ وَلَمْ يَلْتَفِتُوْا يَمِيْنًا وَّشِمَالًا۔'' (درمنثور ج:۵ ص:۳)

ترجمہ:... ''محمد بن سیرینؒ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نماز میں اپنی نظروں کو آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے اور دائیں بائیں التفات فرماتے تھے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ آیت ''قَدْ اَفْلَحَ....'' نازل فرمائی، اس کے بعد صحابہ کرامؓ نماز میں نہ تو آسمان کی طرف نظر کرتے تھے اور نہ اِدھر اُدھر متوجہ ہوتے تھے۔''

یعنی شروع شروع میں نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی اجازت تھی، بولنے کی بھی اجازت تھی، چلنے کی بھی اجازت تھی، نماز کے پورے اَحکامات ابھی نہیں آئے تھے، تو صحابہ کرامؓ آسمان کی طرف بھی دیکھ لیا کرتے تھے، نماز میں دائیں بائیں بھی دیکھ لیا کرتے تھے، اس پر یہ آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں:

''قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔'' (المؤمنون:۱، ۲)

ترجمہ:... ''فلاح پائی اُن ایمان والوں نے، اپنی نماز میں جو خشوع کرنے والے ہیں۔''

اس کے بعد صحابہ کرامؓ کا معمول ہوگیا تھا کہ نظر سجدے کی جگہ رہتی تھی، دائیں اور بائیں کبھی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نہیں پائے گئے، زمین پر اور سجدے پر نظر رہتی تھی صحابہ کرامؓ کی۔

نمازی اللہ کے سامنے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاِنَّہٗ بَیْنَ عَیْنَیِ الرَّحْمٰنِ فَاِذَا الْتَفَتَ، قَالَ لَہُ الرَّبُّ: یَا ابْنَ اٰدَمَ! اِلٰی مَنْ تَلْتَفِتُ اِلٰی خَیْرٍ لَّکَ مِنِّیْ؟ اِبْنَ اٰدَمَ! أَقْبِلْ عَلٰی صَلَاتِکَ فَاَنَا خَیْرٌ لَّکَ عَمَّنْ تَلْتَفِتُ اِلَیْہِ۔“

(کنز العمال ج:۷ ص:۵۰۵، حدیث:۱۹۹۸۵)

ترجمہ:...”جب بندہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو رحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہوتے ہیں، جب بندہ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری طرف سے نظر ہٹا کر کس کی طرف دیکھ رہے ہو؟ ...میں تو تمہارے سامنے ہوں میری طرف سے توجہ ہٹا کر کسی اور کی طرف اِلتفات کر رہے ہو؟ کس کی طرف دیکھ رہے ہو وہ تمہارے لئے مجھ سے بہتر ہے جس کو دیکھ رہے ہو؟ میری طرف اِلتفات کرو، میں تمہارے لئے ان سے بہتر ہوں جن کی طرف تم اِلتفات کر رہے ہو۔“

ہاتھوں کا چلنا خشوع کے منافی:

ایک دفعہ ایک صاحب نماز پڑھ رہے تھے اور اپنی داڑھی کو دیکھ رہے تھے ...بہت لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ نماز پڑھتے ہوئے ان کے ہاتھ چل رہے ہوتے ہیں، کبھی کپڑے کو ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں، کبھی داڑھی کو ٹھیک کر رہے ہوتے ہیں...آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ کر فرمایا کہ: اگر اس کے دِل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء میں بھی خشوع ہوتا، سکون، وقار، اطمینان اس کے اعضاء میں بھی ہوتا۔

ہاتھوں کا اس طرح چلنا اور نماز کے ظاہری اعضاء میں سکون اور سکوت کا نہ ہونا علامت ہے اس بات کی کہ اس کے دِل میں بھی خشوع نہیں ہے۔

نماز کیسی ہو؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب نے کچھ نصیحتیں کرنے کو کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے کچھ نصیحتیں کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نصیحتیں فرمائیں اور ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی:

".... اِذَا قُمْتَ فِیْ صَلٰوتِکَ فَصَلِّ صَلٰوۃَ مُوَدِّعٍ ....." (مشکوٰۃ ص:۴۴۵ بحوالہ مسند احمد)

ترجمہ:... "اور جب تو نماز کے لئے اُٹھے تو رُخصت کرنے والے کی نماز پڑھ۔"

"مودّع" معنی رُخصت کرنے والا، وداع کرنے والا، الوداع کہنے والا، جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو الوداع کہنے والے کی نماز پڑھو، یہ الوداع کہنے والے کی نماز کا کیا مطلب؟ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔

ایک مطلب یہ کہ تم دُنیا سے رُخصت ہو رہے ہو اور سب کو الوداع کہہ رہے ہو اور آخری نماز پڑھنے کا موقع تمہیں دیا جارہا ہے، جب تم نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو تو اس طرح نماز پڑھو کہ بس دُنیا کی یہ میری آخری نماز ہے، بس اس کے بعد پھر موقع نہیں ملے گا۔

اور بعض حضرات نے جیسا کہ حضرت شیخؒ نے بھی لکھا ہے کہ "مودّع" کے معنی رُخصت کرنے والا کہ دُنیا کے تمام اشغال کو، افکار کو، خواہشات کو، ہر چیز کو، ما سوا اللہ تعالیٰ کے رُخصت کردو، جب نماز کے لئے کھڑے ہوگئے تو باقی سب سے رُخصت ہوگئے، یعنی اب صرف ایک اللہ تعالیٰ سے معاملہ ہے۔

نماز، اُنسِ اِلٰہی کا ذریعہ:

دراصل غیر اللہ سے کٹنے اور صرف ایک اللہ سے اُنس حاصل کرنے کا نماز کے ذریعے ہمیں تجربہ کرایا جاتا ہے، چنانچہ جیسے کہا گیا ہے نا کہ: ’’اے اللہ میری وحشت کو قبر میں اُنس سے بدل دیجئے!‘‘ تنہائی کی وجہ سے آدمی جو گھبراتا ہے اس کو وحشت کہتے ہیں، اب قبر میں اکیلا پڑا ہوا ہے، اور انسان اس کا عادی اور خوگر نہیں، اگر قبر میں دُوسرا کوئی عذاب نہ بھی ہو، تو یہ تنہائی، وحدت اور وحشت کا عذاب آدمی کے لئے کیا کوئی کم ہے؟ جیسے کسی شخص کو جیل میں بند کردیا جاتا ہے، جیل میں بند کرکے دروازہ لگادیا، جیل میں تو ایسا ہوتا ہے کہ سلاخیں ہوتی ہیں، آدمی باہر کی طرف دیکھ ہی لیتا ہے، کم از کم یہ بھی ایک اُنس کی چیز ہے، یعنی خود تو باہر نہیں جاسکتا لیکن کم از کم اس کی نظر تو باہر جاسکتی ہے، تو کچھ نہ کچھ اس میں ایسی سلاخیں لگاتے ہیں کہ کم از کم اس کو باہر کی چیزیں نظر آئیں، روشنی اور دُھوپ کو دیکھ سکے، لیکن قبر تو ایسا قیدخانہ ہے کہ یہاں تو کوئی چیز بھی نہیں ہے، اس کی مثال ایسے ہوگی کہ جیسے بالکل بند مکان میں کسی کو بند کردیا جائے، اور پھر جیل والوں کو کم از کم یہ اُمید تو ہوتی ہے کہ جیل کا عملہ کھولے گا، کوئی اس کو کھانے پینے کے لئے کچھ نہ کچھ دے گا، یا پھر یہ کہ یہ وقت گزر ہی جائے گا، کسی طرح رہائی مل ہی جائے گی، حتیٰ کہ کسی کو عمرقید ہوتی ہے ...اللہ تعالیٰ معاف فرمائے... تو اس کو بھی اُمید ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ معافی ملتے چودہ سال کے بعد رہائی مل ہی جائے گی۔ لیکن یہاں تو سالہا سال نہیں قرنہا قرن پڑے رہو، نہ اس کا دروازہ کھلے، نہ تمہارے پاس کوئی آئے، تو یہ جو کہا گیا کہ: ’’اے اللہ! میری قبر میں میری وحشت کو اُنس سے بدل دیجئے!‘‘ یہ کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس حاصل ہوگیا تو پھر مخلوق سے وحشت نہیں رہے گی، بہت سارے اولیاء اللہ جن کو لوگ پاگل کہتے تھے، آبادی سے بھاگ کر جنگل میں چلے جاتے تھے، ان کو مخلوق

سے وحشت تھی، اللہ تعالیٰ سے اُنس تھا، شیخ فرماتے ہیں کہ یہ جو نماز کے لئے ہم کھڑے ہوتے ہیں یہ ہمیں مشق کروائی جاتی ہے اسی اُنس مع اللہ کی اور یہی معنی ہیں صلوٰۃِ مودّع کے کہ رُخصت کرنے والوں جیسی نماز پڑھو، یعنی باقی سب کو رُخصت کردیا، اور سب سے وحشت ہوگئی۔

ہمارے خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمہ اللہ نے اپنے ایک شعر میں اسی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے جس پر ہمارے حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے ان کو فرمایا: خواجہ صاحب! میرے پاس پیسے نہیں ہیں، ورنہ میں آپ کو اس شعر پر ایک لاکھ انعام دیتا۔ وہ شعر یہ ہے:

ایک تجھ سے کیا محبت ہوگئی
ساری دُنیا ہی سے وحشت ہوگئی
ہر تمنا دِل سے رُخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوَت ہوگئی

تم نماز کے خلوَت خانے میں جاتے ہو تو ہر تمنا کو دِل سے رُخصت کردیتے ہو، یہ قلب کا خشوع ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔

نماز کا سیکھنا

حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب کوئی شخص اسلام لاتا، مسلمان ہوجاتا۔ ...مسلمان ہوتے ہیں کلمہ شہادت ’’اشھد ان لا اِلٰہ اِلَّا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ‘‘ پڑھ کے...تو سب سے پہلا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے وہ اس کو نماز کی تلقین کرتے، اس کو با قاعدہ نماز سکھاتے تھے۔‘‘

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:... ”عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: أَتٰی عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَجُلٌ فَقَالَ: یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! اِنِّیْ رَجُلٌ مِّنْ أَھْلِ الْبَادِیَةِ وَاِنَّ لِیْ أَشْغَالًا فَأَوْصِنِیْ بِأَمْرٍ یَّکُوْنُ لِیْ ثِقَةً وَّأَبْلَغُ بِہٖ، فَقَالَ: أَعْقِلْ وَأَرِنِیْ یَدَکَ! فَأَعْطَاہُ یَدَہٗ فَقَالَ: تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا، وَتُقِیْمُ الصَّلٰوةَ، وَتُؤْتِی الزَّکٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَحُجُّ، وَتَعْتَمِرُ، وَتُطِیْعُ، وَعَلَیْکَ بِالْعَلَانِیَةِ! وَاِیَّاکَ وَالسِّرَّ! وَعَلَیْکَ بِکُلِّ شَیْءٍ اِذَا ذُکِرَ وَنُشِرَ لَمْ تَسْتَحْیِیْ مِنْهُ وَلَمْ یَفْضَحْکَ، وَاِیَّاکَ وَکُلَّ شَیْءٍ اِذَا ذُکِرَ وَنُشِرَ اِسْتَحْیَیْتَ وَفَضَحَکَ، فَقَالَ: یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! أَعْمَلُ بِھِنَّ فَاِذَا لَقِیْتُ رَبِّیْ أَقُوْلُ: أَخْبَرَنِیْ بِھِنَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ! فَقَالَ: خُذْھُنَّ فَاِذَا لَقِیْتَ رَبَّکَ فَقُلْ لَّهٗ مَا بَدَا لَکَ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ ص:۱۵۶ حدیث:۴۴۱۹۱)

ترجمہ:... ”اِمام حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں جنگلی آدمی ہوں اور میرے کام بھی بہت

ہیں، بس مجھے کسی کام کی وصیت کیجئے! جو میرے لئے قابلِ اعتماد ہو اور میں اس کے ذریعے جنت میں پہنچ جاؤں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سن! سمجھ! اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے! اس کا ہاتھ پکڑ لیا، فرمایا: اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، حج و عمرہ کرو، اطاعت بجا لاؤ، یعنی جو حاکم تم پر مقرّر ہو کسی معروف کام میں اس کی نافرمانی اور خلاف ورزی نہ کرو۔ ...حضرات صحابہ کرام اور خصوصاً خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں کسی غلط کام کا حکم نہیں دیا جاتا تھا، ان حضرات کی طرف سے جو حکم بھی ہوتا تھا وہ معروف ہوتا تھا...اور ”اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ“ یعنی اللہ کی فرمانبرداری کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرو، اور تم میں جو صاحبِ اَمر ہیں یعنی حاکم ہیں ان کی فرمانبرداری کرو، ”وَعَلَیْکَ بِالْعَلَانِیَّۃِ!“ یعنی جو کام کرو ڈنکے کی چوٹ کرو، علانیہ کرو، اور چھپ کر کے کام کرنے سے بچو، اس لئے کہ آدمی چھپ کر اسی کام کو کرتا ہے جس میں کوئی دغدغہ ہوتا ہے،... ”وکرھت أن یطلع علیہ الناس“ اور تو ناپسند کرتا ہے اس کو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں... ”وعلیک بکل شیء اذا ذکر ونشر لم تستحی منہ“ اور ایسی چیز کو لازم پکڑو کہ جب اس کا تذکرہ آئے اور لوگوں میں وہ بات پھیل جائے تو تمہیں اس سے شرمندگی نہ ہو، اور تمہیں اس سے رُسوائی نہ ہو۔ اور ایسی چیز سے اجتناب کرو کہ جب اس کا تذکرہ آئے اور لوگوں میں وہ بات

پھیل جائے تو تمہیں شرمندگی ہو اور رُسوائی ہو۔ اس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! میں ان باتوں پر زندگی بھر عمل کروں گا، جب اللہ سے ملاقات کروں گا تو میں کہہ دوں گا کہ حضرت عمرؓ نے ان کے کرنے کی خبر دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ان کو لازم پکڑو اور جو مرضی ہو، اللہ سے کہہ دینا۔“

بُرائی کی علامت:

بُرائی کی ایک علامت یہ ہے کہ آدمی اس کو چھپ کر کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی کو اس کا پتا نہ چلے، اگر خدانخواستہ کوئی ایسی شکل پیدا ہوجائے کہ لوگوں کو اس کا پتا چل گیا اور وہ چیز پھیل گئی تو تم اس سے شرمندہ ہو، یہ علامت ہے بُرائی کی۔

”وایاک بکل شیء اذا ذکر ونشر استحیاک وفضحک“ اور ایسی چیزوں سے بچو جب وہ پھیل جائیں اور منتشر ہوجائیں، یعنی زبان زد عام و خاص ہوجائیں تو تمہیں اس سے شرمندگی ہو اور تمہارے لئے رُسوائی ہو، بس یہ چند چیزیں مجھ سے پکڑ لو اور ان پر عمل کرو۔

رمضان کے روزے کا تذکرہ نہیں آیا، غالباً اس کا تذکرہ بھی ہوگا، راوی سے شاید رہ گیا۔ اللہ کی عبادت کرو، نماز صحیح طور پر ادا کرو، جیسے ایک روایت میں آتا ہے: ایک آدمی نے نماز پڑھی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: میاں! تم کتنے عرصے سے نماز پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا: چالیس سال ہوگئے! فرمایا: چالیس سال سے یہ نماز سیکھنا نہیں آئی؟

تو نماز کو قائم کرو، اس کے آداب اور شرائط کے ساتھ نماز کو ٹھیک طرح پڑھو۔

نماز میں خیالات آنا:

اللہ کی شان یہ ہے کہ جب ہم نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو شیطان

اسی وقت ہمیں ساری چیزیں یاد دِلاتا ہے۔ وہ یاد دِلاتا ہے کہ تجھے فلاں کام بھی کرنا ہے، فلاں کام بھی کرنا ہے، ذرا جلدی کرو، نمٹاؤ اس کو۔ اب نماز کے لئے تو کھڑے ہوگئے تھے لیکن کام بھی اسی وقت آتے ہیں سامنے۔

بھولی چیزیں یاد کرنے کا نسخہ:

حضرت اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک صاحب حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا: حضرت! رقم میں نے کہیں دبادی تھی، اب میں نے بہت کوشش کی، بہت سی زمین بھی کھود ڈالی، لیکن وہ مل نہیں رہی، حضرتؒ نے فرمایا: طریقہ تو میں بتلادیتا ہوں لیکن نماز مکمل کرلینا۔ دو رکعت کی نیت باندھو اور دھیان رکھو کہ میں نے فلاں جگہ وہ چیز رکھی ہے، اس نے پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ پوری نہیں کی تھی کہ اس کو وہ چیز یاد آگئی اور وہیں فوراً نماز توڑ کر کے چلا گیا۔ تو ایسا نہ کرو، دُنیا بھر کی چیزیں نماز کے وقت تمہیں یاد آتی ہیں، اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ لو، پورے ارکان ادا کرو، اور اس کے بعد وہ چیزیں بھی یاد آجائیں گی، وہ کام بھی ہوجائے گا، ان شاء اللہ!

آدمی کو نماز اس طرح پڑھنی چاہئے کہ یہ میری آخری نماز ہے، پھر پتا نہیں موقع ملے گا یا نہیں؟ اس لئے دِل لگا کر نماز پڑھنی چاہئے، یہ جو ہم نماز پڑھیں گے اس کے بعد عصر کا وقت آئے گا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہماری کیا حالت ہوگی؟ نماز قائم کرو، حج وعمرہ کرو۔

میں نے عرض کیا کہ روزہ درمیان میں چھوڑ دیا، غالباً حضرت عمرؓ نے اس کا ذکر کیا ہوگا، راوی نے ذکر نہیں کیا، اور اُوپر والی روایت میں رمضان کے روزے کا بھی تذکرہ ہے۔

حاکم کی اِطاعت کرو:

ایک نصیحت یہ کی کہ اپنے حاکم کی اطاعت بجالاؤ، اور ان کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس حکم کو پورا کرو، شرط یہ ہے کہ وہ حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو، اگر ان کا حکم اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف ہو تو ”فلا سمع ولا طاعة“ پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

علانیہ کام کرنے کا مفہوم:

ایک نصیحت یہ کی کہ جو کام کرو، علانیہ کرو۔ جو چھپ کر کرتے ہو، سمجھو وہ نیکی نہیں کرتے، گناہ کا کام کرتے ہو۔ البتہ ایسا ہوسکتا ہے کہ کچھ اللہ کے بندے چھپ کر نوافل پڑھتے ہوں، ان کی بات نہیں ہو رہی، ہمارے جیسے لوگوں کی بات ہو رہی ہے، ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو رات کو چھپ کر تہجد پڑھتے ہوں گے، ان کے گھر والوں کو بھی پتا نہیں ہوگا، یہ تو نیکی کی بات ہے، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ نیکی کا کام علانیہ کیا جاتا ہے اور گناہ کا کام چھپ کر کیا جاتا ہے۔

جب یہ باتیں کرلیں تو وہ صاحب کہنے لگے کہ: امیر المؤمنین! آپ نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں اِن شاء اللہ! ان پر عمل کروں گا، اور اللہ رَبّ العزّت کی بارگاہ میں جب حاضر ہوں گا تو اللہ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ حضرت عمرؓ نے بتایا تھا، یہ باتیں عمرؓ نے بتائی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور فرمایا: عمل کرلو، اس کے بعد جو چاہو کہہ دینا، اللہ کی بارگاہ میں جاکے جو چاہو کہہ دینا۔

اسلام کے بعد سب سے پہلے نماز:

۲:... ”عَنْ أَبِیْ مَالِکٍ الْأَشْجَعِیّ عَنْ أَبِیْهِ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَسْلَمَ الرَّجُلُ

كَانَ أَوَّلُ مَا يُعَلِّمُنَا الصَّلٰوةَ أَوْ قَالَ: عَلَّمَهُ الصَّلٰوةَ۔"

(مجمع الزوائد ج:۲ ص:۹)

ترجمہ:... "حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب کوئی شخص اسلام لاتا، مسلمان ہوجاتا... مسلمان ہوتے ہیں کلمہ شہادت "اشھد ان لا الٰہ اِلَّا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ" پڑھ کے... تو سب سے پہلا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے وہ اس کو نماز کی تلقین کرتے، اس کو باقاعدہ نماز سکھاتے تھے۔"

صحابہؓ نماز سیکھتے تھے مگر ہم...!

وہ لوگ مسلمان ہوتے تھے، ان کو نماز سیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی، اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری سیکھی سکھائی ہے، کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اس کے سیکھنے کی۔ ہمیں ایک "الحمد شریف" اور ایک "قل ہو اللہ" آتی ہے اور وہ بھی جس طرح پڑھتے ہیں ہمیں معلوم ہے۔ کتنی بنا سنوار کے پڑھتے ہیں؟ کتنا صحیح پڑھتے ہیں؟ ان کا تلفظ کتنا صحیح ہوتا ہے؟ ہمیں معلوم ہے۔ اصل میں نماز کو ہم نے ایک فالتو چیز سمجھ رکھا ہے، صحیح آگئی، آگئی، نہ آئی نہ سہی، آپ سن رہے ہیں کہ جب کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آکر مسلمان ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اس کو نماز سکھاتے تھے، تاکہ نماز پڑھنی آئے۔

سب سے پہلے نماز کی پُرسش:

ایک چھوٹی سی کتاب ہے "نامِ حق" اس میں ایک شعر ہے:

روزِ محشر کہ جان گداز بود
اوّلیں پُرسشِ نماز بود

محشر کا دن جو کہ جان کو پگھلانے والا ہوگا، پسینہ نکل نکل کر لوگوں کے منہ تک آجائے گا، بلکہ منہ سے اُوپر چلا جائے گا، ہر ایک آدمی کا پسینہ اس کے اعمال کے مطابق ہوگا، سب سے پہلی پوچھ نماز کی ہوگی۔ جو معاملات ہیں ان میں سب سے پہلا مقدمہ خونوں کا ہوگا، جو لوگوں نے ایک دُوسرے کے خون کئے ہیں، اور عبادات میں سب سے پہلا مقدمہ نماز کا ہوگا۔ ہمارے نزدیک نماز کی کوئی حیثیت ہی نہیں، وقت مل گیا تو پڑھ لی، نہ ملا تو پھر پڑھ لیں گے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

میرے بھائیو! میں اگر کوتاہی کرتا ہوں تو اپنا نقصان کرتا ہوں، آپ کا نقصان نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے فرائض کو اللہ تعالیٰ کا فرض سمجھ کر ادا کرو، اور پورے اطمینان کے ساتھ، وقار کے ساتھ، سکون کے ساتھ ادا کرو۔

نماز کی تعلیم:

۳:..."عَنِ الْحَکَمِ بْنِ عُمَیْرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعَلِّمُنَا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَکَبِّرُوْا، وَارْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ وَلَا تَجُوْزُوْا اٰذَانَکُمْ وَقُوْلُوْا سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ۔"

(کنز العمال ج:۸ ص:۹۲، ۹۳ حدیث:۲۲۰۴۸)

ترجمہ:... "حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سکھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہا کرو، اپنے ہاتھوں کو

اُٹھاؤ، لیکن ہاتھوں کو اتنا نہ اُٹھاؤ کہ کانوں سے اُوپر چلے جائیں، اور پھر "سبحانک اللّٰھم .... الخ"...آپ پاک ہیں اے اللہ! اور میں حمد کرتا ہوں آپ کی اور آپ کا نام بہت بابرکت ہے، اور آپ کی بزرگی اور آپ کی شان بہت ہی برتر ہے، اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے... پڑھو۔"

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے نماز سکھاتے تھے، یہاں سے "سبحانک اللّٰھم" سے نماز شروع فرماتے تھے۔

ابوبکرؓ مسلمانوں کو تشہد سکھاتے:

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: كَانَ أَبُوْبَكْرٍ يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ عَلَى الْمِنْبَرِ كَمَا يُعَلِّمُ الْمُعَلِّمُ الْغِلْمَانَ فِي الْمَكْتَبِ۔"

(کنز العمال ج:۸ ص:۱۴۹ حدیث:۲۲۳۳۵)

ترجمہ:..."اور اِمام طحاویؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو تشہد سکھاتے تھے، اور اس طرح سکھاتے تھے جس طرح کہ قاری صاحب اسکول اور مدرسے میں بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ التحیات سکھاتے تھے، اور خوب جم کر سکھاتے تھے، جس طرح کہ بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔

دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور انہوں نے مجھے تشہد سکھائی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ان کو تشہد سکھلائی، ان کی تشہد یہ تھی:

”التحیات للہ والصلوات الطیبات المبارکات للہ“۔

صحابہ کرامؓ کے مختلف تشہد:

یہ جو ہم تشہد پڑھتے ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے علاوہ بہت سے صحابہؓ سے تشہد منقول ہے، ان کے الفاظ میں تھوڑا بہت فرق ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ابنِ مسعودؓ کو تشہد سکھانا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا، میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، اور آپ نے مجھے تشہد سکھائی اور اس طرح مجھے تشہد سکھائی جس طرح قرآنِ کریم کی آیت سکھائی جاتی ہے۔

ابنِ مسعودؓ کا تشہد:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد جو ہم پڑھتے ہیں اور بہت سے اکابر پڑھتے تھے، اس کی یہ خصوصیت ہے کہ صحاحِ ستہ میں اسی طرح ایک ایک حرف منقول ہے، اس میں ذرا بھی اختلاف نہیں کہ یہ آگے پیچھے ہو جائے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سکھلائی تھی اور وہ اپنے شاگردوں کو سکھاتے تھے اور ”واؤ“ اور ”فا“ اس پر بھی مؤاخذہ کرتے تھے کہ تم نے ”واؤ“ غلط پڑھی ہے، ”فا“ غلط پڑھی ہے، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی تھی اسی طرح آپ تلقین فرماتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ سکھاتے:

عسکری نے امثال میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کلام کے فواتح اور جوامع سکھایا کرتے تھے، یعنی جو

کلام شروع کرنا ہو اس کے ابتدائی کلمات کیا ہونے چاہئیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سکھاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حاجت کی نماز سکھاتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نکاح کا خطبہ سکھاتے تھے، یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باقاعدہ ہمیں سکھاتے تھے۔

حضرت حذیفہؓ کی نصیحت:

ایک آدمی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا، وہ نماز پڑھنے لگا، رُکوع اور سجدہ پورا نہیں کرتا تھا، ہونا تو یہ چاہئے کہ آدمی سجدے سے اُٹھے تو دونوں سجدوں کے درمیان بالکل سیدھا بیٹھے، لوگ ایسا نہیں کرتے۔ جب وہ نماز پڑھ کر جانے لگا تو حضرت حذیفہؓ نے اس کو بلایا اور فرمایا: بھائی! کتنا عرصے سے تم اس طرح نماز پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: چالیس سال تو ہوگئے ہوں گے! حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: چالیس سال سے نماز سیکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

انگریزی خط سیکھنے کی ضرورت مگر نماز....:

میرے پاس اگر ایک خط آئے اور میں اس خط کی زبان کو نہیں جانتا تو میں کسی سے پڑھواؤں گا، ہماری گورنمنٹ بے چاری سارا کام انگریزی میں کرتی ہے، کوئی میرے نام نوٹس بھیجے تو وہ انگریزی میں ہوگا، اور مجھے انگریزی آتی نہیں، تو میں کسی اور بھائی کی منّت سماجت کروں گا کہ بھائی! مجھے پڑھ کے سنادو، اس میں کیا لکھا ہے؟ وہ صاحب کہتے ہیں کہ چالیس سال ہوگئے ہیں رُکوع وسجدہ کرنا نہیں آتا، اور ہم میں سے بہت سے لوگوں کی داڑھیاں سفید ہوگئی ہیں، کسی اللہ کے بندے نے کسی کے پاس بیٹھ کر یہ نہیں کہا کہ مجھے نماز سکھادو یا سن لو، میں صحیح پڑھ رہا ہوں یا غلط پڑھ رہا ہوں؟

نماز جنت کا ٹکٹ:

نماز یہ جنت کا ٹکٹ ہے، اور اس ٹکٹ کو دِکھا کر ہم جنت میں جائیں گے، لیکن یہ نہیں دیکھا کہ جعلی تو نہیں ہے؟ یا غلط تو نہیں ہے؟

حضرت حذیفہؓ کا نماز سکھانا:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کو فرمایا کہ: میرا بھائی! تم یہ نماز کب سے پڑھ رہے ہو؟ اس نے کہا: چالیس سال سے! حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: اس کا مطلب ہے تم نے چالیس سال سے نماز نہیں پڑھی۔

”وَلَو مُتَّ وَھٰذِہٖ صَلٰوتُکَ مُتَّ عَلٰی غَیْرِ الْفِطْرَۃِ الَّتِیْ فَطَرَ اللّٰہُ عَلَیْھَا۔“

ترجمہ:...”تیری نماز اسی طرح رہی اور تو اسی حالت میں مرگیا تو جس فطرت پر تجھے اللہ نے پیدا کیا تھا اس فطرت کے خلاف پر تیرا انتقال ہوگا۔“

پھر حضرت حذیفہؓ خود اس کو نماز سکھلانے لگے، اور فرمایا: چاہے رکعتیں چھوٹی پڑھو لیکن رُکوع اور سجدہ پورا کرو، اگر رکعتیں لمبی پڑھتے ہو، قراءت لمبی کرتے ہو تو سبحان اللہ! کیا بات ہے، لیکن میں کہتا ہوں چاہے رکعتیں چھوٹی پڑھو لیکن رُکوع اور سجدہ اطمینان سے کرو یہ ضروری ہے۔

اپنی اپنی نماز کا جائزہ لو:

بھائی! ہم بھی اپنی اپنی نمازوں کو دیکھیں کہ ہم نماز میں کوتاہی تو نہیں کرتے؟ قاری صاحب تو ویسے بہت لمبی نماز پڑھاتے ہیں، میرے جیسا آدمی ویسے ہی تھک جاتا ہے، اتنی لمبی نماز تو نہ پڑھو لیکن اطمینان کے ساتھ رُکوع اور سجدہ تو کرلو، رُکوع اور سجدے کے درمیان بیٹھنا، دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا، اطمینان کے

ساتھ اور رُکوع کر کے کھڑا ہونا اطمینان کے ساتھ، یہ نماز کے واجبات میں سے ہے، اور اِمام شافعیؒ اور دُوسرے ائمہ کے نزدیک یہ فرض ہے، اگر کوئی شخص رُکوع کر کے سیدھا کھڑا نہیں ہوتا اطمینان کے ساتھ، یا کوئی شخص دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان کے ساتھ نہیں بیٹھتا تو اِمام شافعیؒ اور دُوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی نماز ہی نہیں ہوئی، اسی لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو فرمایا تھا کہ: چالیس سال سے تو نے نماز ہی نہیں پڑھی، رکعتیں چاہے لمبی نہ پڑھو میرے جیسے کمزور ہو، بیمار ہو تو قراءت مختصر کردو، لیکن رُکوع اور سجدہ اطمینان کے ساتھ کرو۔

پانچ ہزار بکریوں سے قیمتی دُعا:

ابن نجار نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ: تجھے پانچ ہزار بکریاں دے دوں یا پانچ باتیں سکھادوں؟ (ہم ہوتے تو ہم یہ کہہ دیتے کہ پانچ ہزار روپیہ دے دو) جن میں تیرے دِین اور دُنیا کی دُرستگی ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے کہا: یا رسول اللہ! پانچ ہزار بکریاں تو بہت ہیں، لیکن مجھے یہ پانچ باتیں سکھادیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دُعا کیا کرو:

”اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ وَوَسِّعْ لِیْ خُلُقِیْ وَطَیِّبْ لِیْ کَسْبِیْ وَقَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَلَا تُذْھِبْ قَلْبِیْ اِلٰی شَیْءٍ صَرَّفْتَهٗ عَنِّیْ۔“ (کنز العمال ج:۲)

ترجمہ:... ”اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف فرما، میرے اخلاق میں وسعت پیدا فرما، میری کمائی کو پاک بنا، رزق میں مجھے قناعت عطا فرما، اور جو چیز مجھ سے ہٹالی جائے میرے دِل کو اس کی طرف مائل نہ فرما۔“

یعنی اے اللہ! میرے لئے میرے تمام گناہوں کو معاف فرما، اور میرے اخلاق میں وسعت پیدا فرمادے، بات بات پر چڑ جاتے ہیں، یہ نہ ہو، اور میری کمائی پاک بنادے۔ آج کل پاک اور ناپاک کا تصوّر ہی نہیں ہے، ملنا چاہئے کھانے کو، کھانے کو ملنا چاہئے وہ پاک ہے یا ناپاک ہے، اس سے بحث نہیں، سود کا ہے، لاٹری کا ہے، اور بہت ساری اِسکیمیں نکلی ہوئی ہیں، آدمی راتوں رات لکھ پتی بن جاتا ہے۔

قناعت کا مفہوم:

اے اللہ! آپ نے جو مجھے رزق عطا فرمایا ہے اس پر مجھے قناعت عطا فرمادے، قناعت سمجھ میں نہیں آئے گی، یہ سمجھ میں نہیں آئے گی، وہ یوں ہے کہ میں نے روٹی کھالی، جتنی ضرورت تھی میں نے کھالی، اس کے بعد آپ بہت عمدہ قسم کا کھانا بنا کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تناول فرمالیجئے! میں کہتا ہوں: نہیں! اس وقت حاجت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ کھالیجئے! میں کہتا ہوں: نہیں! یقیناً میں کھا نہیں سکتا ہوں۔ بس قناعت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں جتنا اللہ نے مجھے رزق دے دیا ہے میں اس پر قانع ہوجاؤں کہ یا اللہ! تیرا بہت شکر ہے، مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہئے، حلال کا دے تو لینے سے انکار بھی نہیں، لیکن حرص نہیں ہے۔

اور اے اللہ! جو چیز آپ نے مجھ سے ہٹادی تھی میرا دِل اس کی طرف مائل نہ کر۔

ایک اور دُعا:

ایک اور روایت میں ہے، نسائی اور ابونعیم نے عبداللہ بن جعفر سے نقل کیا ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو یہ کلمات سکھایا کرتے تھے اور ان کو اس کا حکم کرتے تھے کہ وہ یہ کلمات ضرور پڑھا کریں، بتاتے تھے کہ یہ کلمات میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھے ہیں اور حضرت علیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہیں، اور آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم ان کلمات کو اس وقت کہتے تھے جب کوئی معاملہ آپ کے لئے پریشان کن ہوتا یا کسی چیز کی سختی پیش آجاتی، آپ فرماتے:

”لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، اَلْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، اَلْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔“

(کنز العمال ج:۲ ص:۶۸۱ حدیث:۱۵۰۵۹)

ترجمہ:... ”کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا، جو اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، جو بڑے حلم اور بڑے کرم والا ہے..... جو بلند و بالا عظمت والا ہے، اللہ وہ پاک ہے جو ساتوں آسمانوں کا رَبّ ہے، عرشِ عظیم کا رَبّ ہے، اور تمام تعریفیں اللہ رَبّ العالمین کے لئے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ یہ کلمات اپنی بچیوں کو سکھلاتے تھے اور ساتھ فرماتے: یہ کلمات مجھے حضرت علیؓ نے سکھلائے تھے۔

سوال:... انسان کے کامل یا ولی ہونے کی کیا نشانی ہے؟

جواب:... بھائی! میں خود بھی ولی نہیں ہوں، اور بزرگوں کا مقولہ ہے کہ: ”ولی را ولی می شناسد“ ولی کو ولی پہچانتا ہے، دُوسرا آدمی نہیں جانتا، اب آپ کو کیا بتاؤں؟

نماز مناجاتِ اِلٰہی کا نام ہے

اللہ تعالیٰ سے لینے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ اسباب کا ہے اور ایک طریقہ بغیر اسباب کا ہے۔ایک تو یہ کہ جن اسباب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان اسباب کو اِختیار کرو اور اَسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! جتنا میں کرسکتا تھا وہ میں نے کرلیا اور آگے آپ مدد فرمانے والے ہیں،دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ کہہ دو کہ یا اللہ! میرے لئے تو کوئی دُوسرا سبب بھی نہیں ہے،کوئی وسیلہ بھی نہیں ہے،صرف آپ ہی کی ذات میرے لئے سبب ہے،وسیلہ ہے، تو ہی مسبّب الاسباب ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

نماز کے اندر قراءت کا ذکر ہو رہا تھا کہ نمازی نماز میں الحمد شریف پڑھے، پھر اس کے بعد کوئی سورت پڑھے۔

پڑھنے کا کم سے کم درجہ:

پڑھنے کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی زبان سے جو کچھ کہتا ہے دِل سے اس کو سمجھے کہ میں زبان سے اللہ تعالیٰ کو یہ کہہ رہا ہوں۔

اس سلسلے میں میں نے عرض کیا تھا کہ نماز اوّل سے آخر تک اللہ تعالیٰ کی مناجات کا نام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنا اور بارگاہِ عالی میں کچھ عرض و معروض کرنا۔

سورۂ فاتحہ کے مضامین:

سورۂ فاتحہ کا ذکر کیا تھا کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے، اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے، اللہ تعالیٰ کی بزرگی ہے، بندہ کہتا ہے:

”اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔“

ترجمہ:... ”یا اللہ! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔“

نمازی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرتا ہے کہ ہم آپ کے سوا کسی کے بندے نہیں، بندہ آقا کا حکم مانتا ہے اور بندے پر آقا کا حکم چلتا ہے، ''اِیَّـاکَ نَـعْبُدُ'' ہم صرف آپ کے بندے ہیں، آپ کا حکم مانتے ہیں اور آپ کے مقابلے میں کسی کا حکم نہیں مانتے۔ ''وَاِیَّـاکَ نَسْتَعِیْنُ'' اور ہم آپ سے اپنے ہر کام میں مدد چاہتے ہیں، دُنیا کے کام میں بھی، آخرت کے کام میں بھی، دِین کے کام میں بھی اور عبادت کے کام میں بھی، کوئی کام ہم آپ کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتے، ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ''۔

فاتحہ کے مضامین کی تقسیم:

میں نے حدیث ذکر کی تھی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''.... قَالَ اللہُ تَعَالٰی: قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ، وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ۔ فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' قَالَ اللہُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ! وَاِذَا قَالَ: ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' قَالَ اللہُ تَعَالٰی: أَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ! وَاِذَا قَالَ: ''مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' قَالَ: مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ! وَاِذَا قَالَ: ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' قَالَ: ھٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ، وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ۔ فَاِذَا قَالَ: ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ، صِرَاطَ الَّذِیْنَ أَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' قَالَ: ھٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ۔ رواہ مسلم۔'' (مشکوٰۃ ص:۷۸، ۷۹)

یعنی حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کو اپنے درمیان اور بندے

کے درمیان تقسیم کردیا، جب بندہ کہتا ہے کہ: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ‘‘ تو حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ’’حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ‘‘ میری حمد کی میرے بندے نے۔ بندہ جب کہتا ہے: ’’اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم‘‘ تو حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں: ’’أَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ‘‘ میری تعریف کی میرے بندے نے۔ بندہ جب کہتا ہے: ’’مٰلِکَ یَوْمِ الدِّیْنِ‘‘ تو حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ: ’’مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ‘‘ میری بزرگی بیان کی میرے بندے نے۔ یہ تین آیتیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور چوتھی آیت: ’’اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْن‘‘ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ’’ھٰذا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ‘‘ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے، آدھی میری اور آدھی میرے بندے کی، ’’اِیَّاکَ نَعْبُدُ‘‘ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے لئے، ’’وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ‘‘ اور آپ سے مدد چاہتے ہیں، مدد چاہنا بندے کا کام ہے، عبادت لینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، عبادت، اللہ تعالیٰ کی اور مدد، بندے کی، اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ نے بندے کو شرف بخشا ہے کہ ایک ہی فقرے میں دونوں کو جمع کیا ہے۔

ہمارے دِین کی جان:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ ’’اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ‘‘ اس آیت پر بہت زور دیتے تھے، اس کو بہت بیان فرماتے تھے کہ آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں، آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ: یہ ہمارے پورے دِین کی جان ہے، ہماری عبدیت کی جان ہے۔

حال ہی میں میرے بڑے بھائی ... چوہدری عبدالباری... کا انتقال ہوا ہے، لوگ ان کی باتیں کر رہے تھے، میرے ایک بھانجے کہنے لگے کہ: میں اپنے کسی کام کے لئے ان کے پاس جاتا اور کہتا کہ: ماموں جی! یہ کام کرنا اور اس کے لئے میرے ساتھ جانا ہے۔ جب تک ان کی صحت متحمل تھی تو فرماتے کہ: مجھے لاد کر لے چلو، ان

کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ اور جب کبھی صحت متحمل نہ ہوتی اور ان کو تکلیف ہوتی، اور میں کہتا کہ فلاں کام کے لئے جانا ہے، تو کہتے کہ: ''جانے کی میری تو ہمت نہیں ہے، تم اللہ تعالیٰ کے فضل سے ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' پڑھتے چلے جاؤ، اس کو آزما کے دیکھو۔''

میرے بھائی! تم بھی اس کو اپنے دِل میں جماؤ، صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور بندہ اپنی بندگی کے مقام پر آجائے۔

''وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' اور صرف آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں، ہم لوگ اسباب و وسائل کے محتاج ہیں، لیکن حق تعالیٰ شانہٗ تو وسائل کے محتاج نہیں، وہ تو ان اسباب کے محتاج نہیں، یہ ان کی کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت ہے کہ اسباب کو پردہ بنالیا ہے، اسباب کے پردے میں مدد فرماتے ہیں۔

اللہ سے لینے کے دو طریقے:

یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے لینے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ اسباب کا ہے اور ایک طریقہ بغیر اسباب کا ہے۔

اسباب کے ذریعے:

ایک تو یہ کہ جن اسباب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان اسباب کو اِختیار کرو اور اَسباب اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! جتنا میں کرسکتا تھا وہ میں نے کرلیا اور آگے آپ مدد فرمانے والے ہیں، ان اسباب کے اندر کچھ نہیں رکھا، آپ نے حکم دیا، ہم نے کرلیا، آپ کا حکم سمجھ کر اسباب کو اِختیار کرلیا، بیمار ہوگئے تھے، دوائی کا حکم ہے، دوائی لے لی، اس دوائی کے اندر کیا رکھا ہے؟ شفا تو آپ ہی دینے والے ہیں، شفا تو آپ کی جانب سے ہی ہے، آپ چاہیں عطا فرمادیں، آپ کو منظور نہ ہو تو نہ سہی۔

اسی طرح دُوسرے اسباب ہیں، اسباب اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، ان کا انکارنہیں، اسباب کو اِختیارکرو، اسباب اختیارکرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

بلا اسباب لینا:

دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ کہہ دو کہ یا اللہ! میرے لئے تو کوئی دُوسرا سبب بھی نہیں ہے، کوئی وسیلہ بھی نہیں ہے، اسباب و وسائل تو وہ آدمی اختیار کرے، جس کے لئے کوئی سبب اور وسیلہ ہو، میرے تو تمام وسائل اور اسباب منقطع ہوگئے، صرف آپ ہی کی ذات میرے لئے سبب ہے، میرے لئے وسیلہ ہے، تو ہی مسبّب الاسباب ہے، جب بندہ اس مقام پر آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بغیر اسباب کے عطا فرمادیتے ہیں، لیکن کمزور آدمی اس راہ پر نہیں چل سکتا! ہم لوگ اسباب کے محتاج ہیں، لیکن کبھی اسباب بھی جواب دے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے بغیر اسباب کے مانگو، اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی پاک قدرت سے بڑھ کر کوئی دوسرا سبب اور وسیلہ کیا ہوگا؟ اس سے مانگو! ”اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ“ بڑی بات ہے۔

بندے کا سوال:

اور جب بندہ کہتا ہے: ”اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ“ دِکھا ہم کو راہ سیدھی، دِکھا نہیں، بلکہ چلا ہم کو راہ سیدھی، ”صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ“ راہ ان لوگوں کی جن پر آپ کا اِنعام ہوا، ”غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ“ نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گم راہ ہوئے۔

یہ تین آیتیں ہیں، جب بندہ ”اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ“ سے آخر سورت تک یہ تین آیتیں پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں: ”ھٰذَا لِعَبۡدِی وَلِعَبۡدِی مَا سَأَلَ“ یہ میرے بندے کا حصہ ہے، یعنی بندہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے کا حصہ ہے اور میرے بندے کے لئے وہ چیز ہے جو وہ مانگتا ہے۔

آمین کا معنی:

اور آخر میں کہتے ہیں کہ: ”اٰمِیْنَ“، آمین کے معنی ہیں: ”اَللّٰھُمَّ اسْتَجِبْ دُعَاءَنَا“ یا اللہ! ہماری دُعا قبول فرما، یہ قرآنِ کریم کا حصہ نہیں ہے یعنی ”آمین“ قرآنِ کریم کا لفظ نہیں ہے، یہ پڑھنے والا اپنی طرف سے پڑھتا ہے، اِمام بھی پڑھتا ہے، مقتدی بھی پڑھتا ہے اور اکیلی نماز پڑھنے والا بھی پڑھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

”اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا: اٰمِیْنَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۷۹)

ترجمہ:... ”جب اِمام ”غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ“ کہے تو تم آمین کہو۔“

فرشتوں کی آمین سے موافقت:

دُوسری روایت میں ہے:

”اِذَا أَمَّنَ الْقَارِیُٔ فَأَمِّنُوْا، فَاِنَّ الْمَلَائِکَۃَ تُؤَمِّنُ .... فَمَنْ وَافَقَ تَأْمِیْنُہٗ تَأْمِیْنَ الْمَلَائِکَۃِ غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔“ (مشکوٰۃ ص:۷۹)

ترجمہ:... ”جب اِمام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ اس وقت فرشتے بھی آمین کہتے ہیں،... وہ تمہارے ساتھ جو شریک ہیں نماز میں... جس شخص کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی، اس کے پہلے گناہ معاف ہوگئے، ...آمین کہنے پر تمام گناہ معاف...“

لیکن شرط یہ ہے کہ اس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو۔

فرشتوں سے موافقت کا مفہوم:

اب موافقت کس چیز میں ہونی چاہئے؟ بھائی! موافقت ایک تو وقت میں ہوسکتی ہے، یعنی ٹھیک اس وقت جس وقت فرشتوں نے آمین کہی ہو، اس وقت اس نے آمین کہی ہو، آگے پیچھے نہیں۔ اور ایک موافقت ہوسکتی ہے حضورِ قلب میں، جس طرح فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضورِ قلب کے ساتھ آمین کہتے ہیں، اسی طرح بندہ بھی کہے۔

کس کا ایمان عجیب؟

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا:

”أَیُّ الْخَلْقِ أَعْجَبُ اِلَیْکُمْ اِیْمَانًا؟ قَالُوْا: اَلْمَلَائِکَةُ! قَالَ: وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ۔ قَالُوْا: فَالنَّبِیُّوْنَ! قَالَ: وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ عَلَیْھِمْ۔ قَالُوْا: فَنَحْنُ! قَالَ: وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَأَنَا بَیْنَ أَظْھُرِکُمْ، قَالَ: فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَقَوْمٍ یَّکُوْنُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ یَجِدُوْنَ صُحُفًا فِیْھَا کِتَابٌ یُّؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۸۴)

ترجمہ:... ”سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سب سے زیادہ عجیب ایمان فرشتوں کا ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتے ایمان کیوں نہ لائیں جبکہ وہ اپنے ربّ کے پاس رہتے ہیں، ...ان کا ایمان کیا عجیب ہوا؟ فرشتے تو فرشتے ہی ہیں، ایک تو اللہ تعالیٰ

نے ان کو پیدا ہی ایسا کیا، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر باش ہیں، ان کو جلال و جمال کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، وہ کیوں ایمان نہ لائیں؟...صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر انبیائے کرام کا ایمان سب سے زیادہ عجیب ہے! فرمایا: وہ حضرات ایمان کیوں نہ لائیں ان پر تو اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے، ...وہ بھی ایمان نہیں لائیں گے تو کون ایمان لائے گا؟ یہ بھی سوال کا جواب نہ ہوا...صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر سب سے زیادہ ہمارا ایمان عجیب ہے! فرمایا: میں تمہارے سامنے موجود ہوں، تم ایمان کیوں نہ لاؤ گے؟ ...صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر آپ ہی ارشاد فرمائیں...آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے، جو میرے بعد ہوں گے، میرا نام سنیں گے اور صحیفے پڑھیں گے اور ان کو پڑھ پڑھ کر ایمان لائیں گے، ...نہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، نہ فرشتوں کو دیکھا اور نہ مجھے دیکھا، صرف میرا نام سنا، نام سن کر ایمان لے آئے تھے، ان کا ایمان عجیب ہے!...“

عجیب اور قوی کا فرق:

عجیب اور چیز ہے، قوی اور چیز ہے، یہ بات سمجھ لو! بعد والوں کا ایمان عجیب ضرور ہے لیکن قوی ان حضرات کا ایمان ہے، یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کا ایمان قوی ہے، صحابہ کرامؓ کا ایمان قوی ہے، کیونکہ وہ اربابِ مشاہدہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایمان لے آئے مجھے ان پر تعجب نہیں آتا، مجھے تعجب

ان پر آتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ کچھ پوشیدہ نہیں تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر نظر پڑے اور ایمان دِل میں نہ اُترے۔

تو خیر مجھے تو اس حدیث سے یہ عرض کرنا تھا کہ فرشتوں کے بارے میں فرمایا کہ: وہ ایمان کیوں نہ لائیں؟ وہ تو اپنے ربّ کے پاس رہتے ہیں، حضراتِ ملائکہ کو، فرشتوں کو حق تعالیٰ شانہٗ کے جاہ وجلال کا مشاہدہ ہے، ان حضرات کا آمین کہنا یا دُعا کرنا کتنے اِخلاص کا ہوگا، قرآنِ کریم میں ہے:

”اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ....“

(المؤمن:۷)

ترجمہ:... ”جو لوگ کہ اُٹھائے ہوئے ہیں عرشِ الٰہی کو اور اس کے اردگرد والے فرشتے وہ تسبیح کہتے ہیں اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ اور اِستغفار کرتے ہیں ایمان والوں کے لئے۔“

فرشتے انسانوں کی خدمت پر مامور:

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ فرشتے جو حاملینِ عرش ہیں، وہ تمہارے لئے اِستغفار کرتے ہیں اور اِیمان والوں کے لئے اِستغفار کرتے ہیں۔

ہمارے حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف میں ایک قصیدہ ہے، اس میں ایک جگہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہتے ہیں کہ: آپ کی برکت سے اتنی تو رعایت ہوگئی ہے کہ ہم گناہ کرتے ہیں اور فرشتے اِستغفار کرتے ہیں، گناہ ہم کریں اور ہمارے لئے اِستغفار فرشتے کریں، یہ آپ کی بدولت ہوا، آپ کی برکت سے ہوا۔

فرشتوں جیسی آمین کہو:

تو حضراتِ ملائکہ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا آمین کہنا اور دُعا کرنا کتنا اِخلاص پر مبنی ہوگا؟ وہ خود معصوم ہیں لیکن گناہگاروں کے لئے بخشش کی دُعا کرتے ہیں، اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے گناہگاروں کے لئے دُعائیں کرتے ہیں، اِستغفار کرتے ہیں، بخشش مانگتے ہیں، تو جس طرح فرشتے آمین کہتے ہیں تم بھی اس طرح آمین کہو، فرشتے بارگاہِ اِلٰہی میں حاضر ہیں، تم بھی ہاتھ باندھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوجاؤ، فرشتے اللہ تعالیٰ کے سامنے صفیں باندھے کھڑے ہیں، تم بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ باندھے، صفیں باندھ کر کھڑے ہوجاؤ۔

تب تم فرشتوں سے بڑھ گئے:

اس وقت تمہارا وجود، جبکہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے جماعت کی نماز میں صف باندھے کھڑے ہو، فرشتوں سے کم نہیں، تم فرشتوں سے بازی لے گئے ہو، وہ کھانے پینے کے محتاج نہیں، تم کھانے پینے کے محتاج ہو، وہ دُنیا کے دھندے کے محتاج نہیں، تم اپنی دُنیا کے دھندوں کے محتاج ہو، ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور حکم کی بجاآوری کے لئے کسی چیز کو چھوڑ کر نہیں آنا پڑتا، تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئے ہو:

تر دامنی پہ اپنی اے زاہد نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

بندہ جب تائب ہوکر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوجاتا ہے تو فرشتے پیچھے رہ جاتے ہیں، یہ آگے نکل جاتا ہے، فرشتے ان پر رشک کرتے ہیں، ملائکہ ان پر رشک کرتے ہیں، بلکہ ملائکہ تو ان کی خدمت پر مأمور ہیں، ان کا مقام بہت اُونچا ہے، لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اپنا مقام پہچانا نہیں، اپنے آپ کو گرا دیا ہے، ان کا مقام بہت اُونچا ہے، آسمان کے فرشتے اللہ تعالیٰ نے ان کی چاکری کے لئے مقرّر کئے

ہوئے ہیں، ان کی غلامی کے لئے، ان کی خدمت کے لئے مقرّر کئے ہوئے ہیں، ان کا مقام بہت بلند ہے، تو یوں فرمایا کہ: جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے لئے اس کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائے، اِخلاص کے ساتھ اور بڑی توجہ کے ساتھ آمین کہا کرو، یہ حدیث شریف صحاحِ ستہ کی ہے، صحیح بخاری شریف کی کتاب الدعوات میں روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اِذَا أَمَّنَ الْقَارِیُ فَأَمِّنُوْا۔"

(مشکوٰۃ ص:۷۹، بحوالہ بخاری)

ترجمہ:... "جب قراء ت کرنے والا آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔"

اِمام اور مقتدیوں کا وظیفہ:

معلوم ہوا کہ قراء ت اِمام کرے، مقتدیوں کا وظیفہ آمین کہنا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام دُعا کر رہے تھے، قرآنِ کریم نے وہ دُعا نقل کی ہے:

"رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهٗ زِیْنَةً وَّأَمْوَالًا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰی أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِیْمَ۔" (یونس:۸۸)

ترجمہ:... "اے اللہ! آپ نے فرعون اور فرعون کے لشکر کو، فرعون کے لوگوں کو دُنیا کی زیب و زینت اور مال عطا فرمائے ہیں، یا اللہ! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تیرے راستے سے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، ...بجائے اس کے کہ خود مانیں اُلٹا

دُوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں... یا اللہ! ان کے مالوں کو مٹا ڈال، ان کے دِلوں پر گرہ لگادے، اب یہ ایمان نہ لائیں جب تک یہ دردناک عذاب کو دیکھ نہ لیں۔‘‘

جلال آ گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، جلالِ موسوی کی دُعا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہاتھ اُٹھائے دُعا کر رہے تھے اور بڑے بھائی ہارون ان کے ساتھ آمین کہہ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’قَدْ أُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا۔‘‘ (یونس:۸۹)

ترجمہ:...’’تم دونوں کی دُعا قبول ہوگئی۔‘‘

ثمراتِ دُعا کے لئے پریشان ہونا:

یوں کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا اور فرعون کے غرق ہونے کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: موسیٰ! تم دونوں کی دُعا قبول ہوگئی۔ اور ہم آج دُعا کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں اُگنی چاہئے، ابھی میں نے دُعا کی ہے اور ابھی یہ کام ہوجانا چاہئے، یہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی شان ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دُعا تو موسیٰ علیہ السلام کر رہے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہہ رہے تھے، اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں فرمایا: ’’قَدْ أُجِيبَتْ دَّعْوَتُكُمَا‘‘ تحقیق قبول ہوگئی تم دونوں کی دُعا۔ دُعا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی حضرت ہارون علیہ السلام نے تو صرف آمین کہی، دُعا دونوں کی بن گئی۔

اِمام کے پیچھے قراءت نہیں ہے:

ہمارے اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اِمام فاتحہ پڑھے، مقتدین آمین

کہیں، یہ سب کی دُعا ہوگئی، سب کی طرف سے ہوگئی۔

حافظ ابنِ کثیرؒ دمشقی شافعی المسلک ہیں، باوجود شافعی المذہب ہونے کے ...اِمام شافعیؒ قائل ہیں اِمام کے پیچھے مقتدی کے فاتحہ پڑھنے کے اور ہمارے اِمام قائل نہیں... اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

”وقد یحتج بھٰذہ الاٰیۃ من یقول ان تأمین المأموم علی قراءۃ الفاتحۃ ینزل منزلۃ قراءتھا لأن موسٰی دعا وھارون أمّن وقال: قَدْ أُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا۔“ (تفسیر ابن کثیر ج:۲ ص:۴۳۹)

یعنی اس آیت میں دلیل ہے اِمام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی کہ اِمام قراءت کرے، فاتحہ پڑھے اور مقتدی اس پر آمین کہیں تو یہ سب کی فاتحہ شمار ہوگی، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے اس پر آمین کہی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں کی دُعا قبول ہوگئی۔

معلوم ہوا کہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا نہیں تھی بلکہ دونوں کی دُعا تھی، اس طرح اِمام فاتحہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں تو یہ سب کی فاتحہ ہے، اسی لئے میں نے ذکر کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:

”وَاِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا.... وَفِیْ رِوَایَۃٍ عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ وَقَتَادَۃَ: وَاِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ، فَقُوْلُوْا: اٰمِیْنَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۷۹)

ترجمہ:... ”جب اِمام قراءۃ کرے تو تم خاموش رہو، اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت قتادہؒ کی روایت میں ہے: اور جب اِمام ”غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ“ کہے تم ”آمین“ کہو، اور آگے وہ فضیلت بیان فرمائی۔“

نماز کے علاوہ فاتحہ پر آمین:

ابھی دو تین دن پہلے میرے پاس سوال آیا کہ نماز کے اندر تو اِمام بھی آمین کہے گا مقتدی بھی کہیں گے، کوئی اکیلا نماز پڑھنے والا ہوگا وہ بھی کہے گا، لیکن اگر کوئی قرآنِ کریم کی تلاوت باہر اکیلا کر رہا ہو تو کیا سورۂ فاتحہ پڑھنے پر اس کو بھی آمین کہنی چاہئے؟ اور کیا اس کے سننے والوں کو بھی آمین کہنی چاہئے؟ تو میں نے جواب میں لکھا کہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے کے لئے تو آمین کہنے کا حکم ہے، اور خواہ نماز کے اندر تلاوت کر رہا ہو یا نماز کے باہر تلاوت کر رہا ہو، جب بھی سورۂ فاتحہ پڑھے اس کے بعد آمین کہے، اور جہاں تک نماز سے باہر سننے والوں کا تعلق ہے تو یہ مسئلہ کہیں میں نے پڑھا نہیں، کسی کتاب میں مجھے ملا نہیں، لیکن قیاس کہتا ہے کہ ان کو بھی آمین کہنی چاہئے، جیسا کہ تلاوت کرنے والے کی تلاوت کو جو لوگ سنیں اور آیتِ سجدہ سنیں تو ان پر تو سجدۂ تلاوت واجب ہوجاتا ہے، اسی طرح سورۂ فاتحہ کی تلاوت تو وہ کر رہا ہے اور تم نے سورۂ فاتحہ سنی تو تمہارے لئے بھی آمین کہنا مستحب ہے، ضروری نہیں ہے، بہتر ہے۔

تو خیر! یہاں مضمون یہ چل رہا تھا کہ بھائی نماز کے اندر جو کچھ پڑھو توجہ کے ساتھ پڑھو اتنی توجہ تو ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ سے یہ بات عرض کر رہے ہیں، اور اس کے بعد میدان بڑا وسیع ہے، بڑا ہی وسیع میدان ہے۔

سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ:

صوفیاء کہتے ہیں کہ ایک ہے سیر الی اللہ اور ایک ہے سیر فی اللہ، یعنی ایک ہے اللہ تعالیٰ کی طرف چلنا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچ جائیں اور ایک ہے کہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چلنا، سیر الی اللہ، اللہ تعالیٰ تک چلنا یہ تو ختم ہوجاتا ہے،

اس کی تو آخری منزل آسکتی ہے لیکن سیر فی اللہ کی کبھی منزل نہیں ہوتی، جہاں چلتے جاؤ، اس کے اُوپر مقام ہے، جتنا آگے چلو گے اس سے اُوپر مقام ہے، اور یہاں بھائی جب تم نیت باندھ کر کھڑے ہوگئے، اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے تو سیر الی اللہ تو تمہاری پوری ہوگئی، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تم پہنچ گئے۔

سیر فی اللہ کی کوئی حد نہیں:

اب ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' تم نے شروع کی، ہم جیسے لوگ تو صرف ترجمے کا دھیان کرتے ہیں کہ ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جو رَبّ ہے سارے جہانوں کا'' لیکن عارفین اپنی اپنی معرفت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت میں سیر کرنے لگتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کہاں کہاں تک پہنچتی ہے۔ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کہا تو ہم نے تو صرف لفظ پڑھ لئے یا زیادہ سے زیادہ اس کے معنی کو پڑھ لیا، ''بڑا رحم کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا، نہایت مہربان'' لیکن اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اس کی رحمانیت اور اس کی رحیمیت میں سیر کرنے لگتے ہیں کہ اس طرح حکم نامے صادر کئے جاتے ہیں، اس طرح نامہ اعمال ہاتھوں میں دیئے جارہے ہیں، ان کے سامنے وہ پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے، اب یہ پچاس سال کا، ایک ہزار سال کا دن ہے، تو اس کی سیر کرنے کے لئے کتنے ہزار سال چاہئیں۔ تو شیخ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی نماز جتنی کامل ہوتی جاتی ہے، اتنے ہی اس کے اسرار ان پر کھلتے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو واردات ان کے قلب پر آتے ہیں، ان کی لذت اور فرحت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ کہاں کے وسوسے؟ کہاں کے خیالات؟ کہاں کے بازار؟ ان کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے اسرار و علوم محیط ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کیفیات، اللہ تعالیٰ کا جاہ و جلال، جلال و جمال ان پر مستولی اور غالب ہوجاتے ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ملکوت و جبروت کے اثرات میں کھوجاتے ہیں، وہ یہاں نہیں

رہتے، پھر وہ دُوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے معیار ہیں اور یہ مقام میں جتنا اُونچا ہوگا، اتنی اس کی نماز بھی اُونچی ہوگی، اتنی ہی مناجات میں اس کو لذت بھی آئے گی، گویا نماز میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہے، کیا ہی خوش قسمت ہے وہ بندہ جس کو اپنے مالک کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہوجائے، آمین!

سنت کے مطابق نماز پڑھنے کا طریقہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نوّر اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ: بھائی! اور نہیں، زیادہ نہیں تو نماز کے آخری سجدے میں کم از کم اِستحضار کرلیا کرو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پڑا ہوا ہوں، ایک لمحے کے لئے بھی اِستحضار ہوگیا تو سمجھو کہ بیڑا پار ہے، اس سے خشیت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی، اُنسِ اِلٰہی پیدا ہوگا، اپنے گناہوں سے شرم آئے گی اور خود اپنے وجود سے بھی شرم آئے گی، کبر وغیرہ جتنے امراض ہیں سب نکل جائیں گے، یہ اکڑ وغیرہ جتنی ہے، سب نکل جائے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

مردوں کا رُکوع:

فرماتے ہیں کہ آدمی جب رُکوع میں جائے تو اس کا آدھا دھڑ جو نیچے ہے وہ بدستور قیام کی حالت میں رہنا چاہیئے، یعنی آدھے وجود کے جھکنے کا نام رُکوع ہے، آدمی کے اُوپر کا حصہ جھک جائے اور نیچے کا حصہ کھڑا رہے، رُکوع کی حالت میں آدمی کی ٹانگوں میں خم نہ ہو یعنی جھکاؤ نہ ہو، وہ بالکل سیدھی رہیں اور سرین، کمر اور سر یہ تینوں ایک سطح پر رہیں، سر نہ نیچے کو جھکا ہوا ہو اور نہ اُوپر کو اُٹھا ہوا ہو۔ اسی طرح کمر بھی نہ اُوپر کو اُٹھی ہوئی ہو اور نہ نیچے کو جھکی ہوئی ہو بلکہ آدمی کی سرین، کمر اور سر ایک سطح پر رہیں۔ یہ دونوں بازو آدمی کے دونوں پہلوؤں سے الگ رہیں اور اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑے، انگلیوں کو کھلا رکھے، یہ حکم ہے مردوں کا۔

عورتوں کا رُکوع:

عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ پوری نہ جھکیں، بلکہ اتنی جھکیں کہ ان کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور وہ گھٹنوں کو ہاتھوں سے نہ پکڑیں بلکہ گھٹنے کے اُوپر ہاتھ رکھیں اور اپنی ٹانگوں کو تھوڑا سا خم رکھیں، اپنے بازوؤں کو ملا کر رکھیں، الگ الگ نہ رکھیں۔

یہ طریقہ منسوخ ہوگیا:

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں کے ساتھ نماز پڑھی اور نماز سے پہلے فرمایا: میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز پڑھ کر دِکھاؤں، جب رُکوع میں گئے تو اس طرح اُنگلیوں میں اُنگلیاں ڈال لیں اور دونوں اُنگلیوں کی مٹھی بنالی اور پھر ان دونوں کو گھٹنوں کے درمیان کرلیا، گھٹنوں پر نہیں رکھا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع پہنچی تو فرمایا: میرے بھائی ابنِ مسعودؓ سچ کہتے ہیں:

”كُنَّا نَفْعَلُ ذٰلِكَ فَنُهِيْنَا عَنْهُ وَأُمِرْنَا أَنْ نَّضَعَ الْاَكُفَّ عَلَى الرُّكَبِ۔“ (ترمذی ج:۱ ص:۵۹)

ترجمہ:... ”پہلے ہم اسی طرح نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن پھر اس سے منع کردیا گیا تھا اور اس کے بجائے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا حکم ہوا۔“

یہ کام ذرا مشکل ہے، اس لئے کہ اس میں ہاتھوں کا گھٹنوں کے اُوپر سہارا نہیں ہوتا، جس طرح ہم رُکوع کرتے ہیں، یعنی ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر رُکوع کرتے ہیں، اس میں ہاتھوں کو گھٹنوں کے اُوپر سہارا رہتا ہے، اور آدمی جتنا چاہے لمبا رُکوع کرسکتا ہے، یعنی اگر دونوں ہاتھوں کو جمع کرکے گھٹنوں کے درمیان دے دیا جائے تو اس سے سہارا نہیں ہوتا اور آدمی لمبا رُکوع نہیں کرسکتا، تو پہلے رُکوع کرنے کا ایسا حکم ہوگا، لیکن بعد میں حکم فرمادیا گیا کہ گھٹنوں کے اُوپر ہاتھ رکھو، یہ رُکوع کرنے کی ترکیب ہے۔

رُکوع کی تسبیح:

اس کے بعد رُکوع کے اندر تسبیح پڑھے: ”سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِيْمِ“ یہ تین مرتبہ پڑھنا ادنیٰ درجہ ہے، اس سے زیادہ جتنا چاہے پڑھے، پانچ مرتبہ، سات مرتبہ، نو

مرتبہ، گیارہ مرتبہ، لیکن جماعت کی فرض نماز میں اس سے زیادہ نہ پڑھے، تاکہ مقتدیوں پر بار نہ ہو، لمبی نہ ہو، اپنی تنہا نماز میں خصوصاً رات کی نماز میں جتنا چاہے رُکوع لمبا کرے، جب تک چاہے پڑھتا رہے۔

رُکوع میں نگاہ کہاں ہو؟

رُکوع کی حالت میں اس کی نظر اس کے قدموں پر ہونی چاہئے، سجدے کی جگہ پر نہیں ہونی چاہئے، سجدے کی جگہ پر نظر رکھنا صرف قیام کی حالت میں ہوتی ہے، رُکوع کی حالت میں نہیں۔

رُکوع کی دُوسری دُعائیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُکوع کی تسبیحات کے بعد یہ دُعا پڑھنا بھی ثابت ہے:

"اَللّٰھُمَّ لَکَ رَکَعْتُ وَلَکَ خَشَعْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ۔" (مشکوٰۃ ص:۷۷ بحوالہ صحیح مسلم)

ترجمہ:... "اے اللہ! میں نے آپ کے لئے رُکوع کیا، میں آپ کی خاطر جھکا، میں آپ پر ایمان لایا، اور میں نے اپنا سب کچھ آپ کے سپرد کردیا۔"

یعنی میرے کان، میری آنکھیں، میری ہڈیاں، میرا گودا اور میرے پٹھے غرض کہ میرا گوشت پوست، میرا پورا وجود آپ کے سامنے جھکا ہوا ہے، جھکنے کا معنی ظاہر ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں میرے سامنے جھک گیا، یا یہ کہ ہم کسی کے سامنے جھکنے والے نہیں ہیں، پھر جھکنے کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اس کی باطنی اور معنوی کیفیت ہے، تو رُکوع کے معنی جھکنے کے ہیں، جب اس نے ظاہری شکل جھکنے کی بنالی، اس کا فرض تو ادا ہوگیا، اب اس کے اندر جتنا خشوع پایا جائے گا، حق تعالیٰ شانہٗ کی

بارگاہ میں جتنا جھکنے کا مضمون اس کے دِل میں پایا جائے گا، اتنا ہی اس کا رُکوع کامیاب ہوگا، اب یہ رُکوع مکمل کرلیا۔

رُکوع سے اُٹھنے کے بعد:

اب رُکوع سے سر اُٹھائے اور ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہے۔ اگر اِمام ہے یا منفرد یعنی اپنی الگ نماز پڑھنے والا۔۔۔ اکیلی نماز پڑھنے والا تو ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ، رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' دونوں کہے اور اگر مقتدی ہے تو صرف ''رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' کہے۔

''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کے معنی ہیں: سن لی ہے اللہ نے اس شخص کی بات جس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی، مطلب یہ ہے کہ جب رُکوع میں جھک کر تم اللہ تعالیٰ کی تعریف کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری بات: ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' ... پاک ہے میرا رَبّ بڑی عظمت والا، میں اپنے عظمت والے رَبّ کی پاکی بیان کرتا ہوں... سن لی ہے۔

رُکوع سے سر اُٹھاتے ہوئے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کے بعد کہے ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' اس کے چار صیغے ہیں، یعنی چار طرح کے لفظ ہیں:

۱:... رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ،

۲:... اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ،

۳:... رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ،

۴:... اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ یعنی ''حمد'' سے پہلے ''وَ'' نہ ہو، شروع میں ''اللّٰھم'' نہ ہو، اور دونوں ہوں اور دونوں میں سے ایک ہو، ایک نہ ہو، یہ چار لفظ ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہ چاروں الفاظ حدیث شریف میں منقول ہیں، ۱:...رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ ۲:...اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ ۳:...رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ۔ ۴:... اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔ ان سب سے افضل یہ آخری لفظ ہے، اس میں

''اَللّٰھُمَّ'' شروع میں کہا جائے اور ''رَبَّنَا'' کے بعد ''وَلَکَ الْحَمْدُ'' کہا جائے۔

''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ'' کے معنی یہ ہیں کہ: اے اللہ! اے ہمارے رَبّ! آپ ہی کے لئے حمد ہے، آپ ہی کے لئے تسبیح ہے، آپ ہی کے لئے حمد ہے، رُکوع میں ہم آپ کے لئے تسبیح کہہ رہے تھے، آپ کے لئے حمد ہے، حمد کہی جاتی ہے کسی اِنعام کے ملنے پر، کسی نعمت کے ملنے پر، گویا رُکوع کی حالت میں اس کو کوئی اِنعام ملا تھا، گویا اس کا یہ شکر ادا کر رہا ہے، عام طور پر فرض نمازوں میں تو یہی کہا جاتا ہے ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفلی نماز میں خصوصاً تہجد کی نماز میں اس کے بعد بھی الفاظ منقول ہیں:

۱:... ''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا بَیْنَھُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَیْءٍ بَعْدُ۔''

(ترمذی ج:۱ ص:۶۱)

ترجمہ:... ''اے اللہ! آپ کے لئے حمد ہے اتنی حمد جس سے آسمان بھر جائیں، اتنی حمد جس سے زمین بھر جائے، اتنی حمد جس سے آسمان و زمین کے درمیان کا خلا بھر جائے، اور اتنی حمد کہ ان کے علاوہ جو جو چیز آپ کے علم میں ہے سب بھر جائے۔''

۲:... ''.... أَھْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ وَکُلُّنَا لَکَ عَبْدٌ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔''

(مشکوٰۃ ص:۸۲، بحوالہ مسلم)

ترجمہ:... ''اے اللہ! تو تعریف کا اور بزرگی کا اہل ہے، اور سب سے زیادہ مستحق ہے ان تعریفات کا جو بندے کریں، اور ہم سب کے سب آپ کے بندے ہیں، اے اللہ!

آپ جو چیز عطا فرمائیں آپ کو کوئی روکنے والا نہیں، اور جس چیز کو روک دیں اس کو کوئی دینے والا نہیں، آپ پاک ہیں آپ کے مقابلے میں کسی کی مال داری کام نہیں آئے گی۔“

ان دُعاؤں کا پڑھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اگر یہ دُعائیں یاد ہوں تو بہت ہی اچھی بات ہے، ورنہ فرماتے ہیں کہ نفلی نماز میں ”اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ“ ہی کہتا رہے، جتنا دیر چاہے کہتا رہے، قومہ میں کھڑا ہو کر جتنی دیر تک چاہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ کہتا رہے، اور جب خوب جی بھر جائے تو اب اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں جائے، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سجدہ جو ہے یہ نماز کی جان ہے، سجدے میں جائے۔

سجدے کا طریقہ:

سجدے میں جانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے زمین پر گھٹنے رکھے، پھر اپنے ہاتھ رکھے، اس کے بعد اپنی ناک رکھے، پھر پیشانی رکھے اور جب سجدے سے اُٹھنا ہو تو ترتیب اس کی اُلٹ رکھے، یعنی پہلے پیشانی کو اُٹھائے، ماتھے کو اُٹھائے، پھر ناک کو اُٹھائے، پھر ہاتھوں کو اُٹھائے، پھر گھٹنوں کو اُٹھائے۔

مرد کے لئے حکم یہ ہے کہ سجدے کی حالت میں دونوں پاؤں کو کھڑا رکھے اور پاؤں کی اُنگلیاں قبلے کی طرف متوجہ رہیں، رانیں پنڈلیوں سے الگ رکھے، پیٹ رانوں سے الگ رہے، بازو پہلوؤں سے الگ رکھے، اور عین دونوں ہاتھوں کے درمیان سجدہ کرے، جس طرح نیت باندھتے وقت یہ حکم ہے کہ انگوٹھے کانوں کی لَو تک لگیں اسی طرح سجدے میں بھی یہ انگوٹھے کانوں کی لَو کی سیدھ میں، اور اُوپر کی اُنگلیاں کانوں کی لَو کے برابر ہوں اور ہاتھ کے نیچے کا حصہ کندھوں کے برابر ہو۔

عورتوں کا سجدہ:

عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ جب وہ سجدے میں جائیں تو بیٹھ جائیں، اپنی سرین پر بیٹھ جائیں اور پاؤں دائیں طرف نکال دیں اور پھر بالکل سمٹ کر زمین سے چمٹ کر سجدہ کریں، ان کا پورا وجود آپس میں چمٹا ہوا اور ملا ہوا ہو، یعنی زمین کے ساتھ مل جائے، یہ عورتوں کے لئے حکم ہے، مردوں کا کھڑا سجدہ ہوتا ہے، مگر عورتوں کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

مرد اپنی اُنگلیاں سجدے کی حالت میں ملا کر رکھیں، جب سجدے میں پہنچ گئے تو اَب تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی'' کہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے: ''پاک ہے میرا رَبّ، جو سب سے عالی شان ہے''۔

سجدے کا مقام:

آدمی جب سجدے میں ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

''أَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّہٖ وَھُوَ سَاجِدٌ فَأَکْثِرُوا الدُّعَاءَ۔'' (مسلم ج:۱ ص:۱۹۱)

ترجمہ:... ''انسان کو اپنے رَبّ کا قرب سب سے زیادہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ سجدے میں ہو۔''

اس سے زیادہ انسان کو اللہ کا قرب نہیں ہوتا، ممکن ہی نہیں، یعنی سجدے کی حالت میں جتنا آدمی کو اللہ تعالیٰ کا قرب ہوتا ہے اتنا کسی حالت میں نہیں ہوتا۔

سجدے کی دُعائیں:

اس لئے سجدے کے دوران دُعا میں خوب کوشش کرو، سجدے کے اندر دُعا کرنے میں خوب کوشش کرو، اس لئے ''سبحان ربی الاعلیٰ'' تین مرتبہ، پانچ مرتبہ،

سات مرتبہ، نو مرتبہ یا گیارہ مرتبہ جتنا بار چاہے یہ کلمہ پڑھے اور پھر جو دُعائیں کرنا چاہے کرسکتا ہے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ دُعا عربی زبان میں کرے، اپنی زبان میں نہ کرے۔

دُوسری شرط یہ ہے کہ دُعائیں ایسی کرے کہ جو قرآنِ کریم اور حدیث شریف کے الفاظ کے مشابہ ہوں، کوئی اوٹ پٹانگ دُعا نہ کرے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ایسی دُعائیں نہ کرے جو مخلوق سے مانگی جاسکتی ہوں، اللہ تعالیٰ سے وہ چیز نہ مانگے جو مخلوق سے مانگی جاسکتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ایک رات میں نے ٹٹول کر دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر نہیں تھے، میں پریشان ہوگئی، گھر میں چراغ وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، اندھیرا ہوتا تھا، تو میں ڈھونڈتے ڈھانڈتے اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی کہ میرے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کو لگے، آپ سجدے کی حالت میں تھے، پاؤں آپ کے سجدے کی حالت میں کھڑے تھے، اور آپ سجدے میں یہ دُعا فرما رہے تھے:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَأَعُوْذُ بِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ وَأَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۸۴، بحوالہ صحیح مسلم)

ترجمہ:... ”یا اللہ! میں پناہ لیتا ہوں آپ کی رضامندی کی آپ کی ناراضی سے، اور میں پناہ لیتا ہوں آپ کی معافی کی آپ کی سزا سے، یعنی آپ کی سزا سے بچنے کے لئے آپ کی معافی کی پناہ لیتا ہوں، اور میں پناہ لیتا ہوں آپ کی آپ سے۔“

اِمام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”جواہر القرآن“ میں لکھتے ہیں کہ: اس دُعا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترقی فرمائی افعال سے صفات کی طرف، اور صفات

سے استدلال کی طرف، یا اللہ میں پناہ لیتا ہوں آپ کی رضامندی کی آپ کی ناراضی سے، اور میں پناہ لیتا ہوں آپ کی معافی کی آپ کی سزا سے بچنے کے لئے، اور میں پناہ لیتا ہوں آپ کی آپ سے بچنے کے لئے۔

آپ نے کبھی دیکھا ہوگا کہ ماں بچے کو مارتی ہے اور بچہ ماں سے لپٹ رہا ہوتا ہے، وہ مارتی ہے اور یہ لپٹتا ہے، اس لئے کہ اس کو معلوم ہے کہ ماں کی مار سے بچنے کا طریقہ بھی ماں کی گود ہے، اتنی بات کو بچہ سمجھتا ہے، تو حق تعالیٰ شانہٗ سے اس کے قہر اور اس کے جلال سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینا، دراصل اللہ تعالیٰ کے جمال کی پناہ لینا ہے، یا اللہ! میں آپ کی تعریف شمار نہیں کرسکتا، اور آپ ایسے ہی ہیں جیسا کہ آپ نے اپنی تعریف خود فرمائی۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں تھے اور یہ دُعا فرما رہے تھے، حدیث کے مکمل الفاظ یہ ہیں:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِىَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: فَقَدْتُّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهٗ فَوَقَعَتْ يَدَىَّ عَلٰى بَطْنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِى الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ وَهُوَ يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأُعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِىْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۸۴، بحوالہ صحیح مسلم)

میں نے کہا ہم کس چکر میں ہیں اور آپ کس عالم کو پہنچے ہوئے ہیں، ہم کس خیال میں اور آپ کس خیال میں ہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا بھی منقول ہے:

”اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدْتُّ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَلَکَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ تَبَارَکَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔“

(مشکوٰۃ ص:۷۷، بحوالہ صحیح مسلم)

ترجمہ:... ”اے اللہ! میں نے آپ کے سامنے سجدہ کیا اور میں آپ کی ذات پر ایمان لایا اور میں آپ کے سامنے جھک گیا اور میں نے آپ کے سامنے اپنا سب کچھ سپرد کردیا ...جب پاؤں میں پڑگئے تو پیچھے کیا رہ گیا کسی کے پاؤں میں پڑگئے تو پھر پیچھے کیا رہ گیا... اور پھر سجدہ کیا ہے میرے چہرے نے اس ذات کو جس نے اس کو پیدا کیا اور اس کی صورت بنائی اور اس کی آنکھیں بنائیں، کان بنائے، پس کیا ہی بابرکت ذات ہے، جو سب کچھ پیدا کرنے والا ہے۔“

یہ اور اس کے علاوہ بہت ساری دُعائیں حدیث شریف میں منقول ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں دُعائیں کرتے تھے۔ نمازی جو دُعائیں چاہے سجدے میں کرسکتا ہے، خواہ قرآنِ کریم کی ہوں یا حدیث شریف کی ہوں، لیکن فرض نماز میں نہ کرے، کیونکہ فرض نماز لمبی ہوجائے گی، نفلی نماز میں کرے، خاص طور پر تہجد کی نماز میں یہ دُعائیں کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تر دُعائیں تہجد کی نماز میں منقول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سجدہ کرنا، اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اسی لئے بندے کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قرب سجدے میں حاصل ہوتا ہے۔

سجدے کی چار کیفیات:

سجدے میں چار چیزیں ہونی چاہئیں، یعنی چار کیفیتیں آدمی پر طاری ہونی چاہئیں:

پہلی کیفیت حیا کی ہے، آدمی جب شرمندہ ہوتا ہے تو اس کا سر جھک جاتا ہے، شرمندگی کے مارے سر جھکا دیتا ہے، اُوپر نہیں دیکھتا تو اَب جھکنے کی اس کے علاوہ تو کوئی صورت ہی نہیں رہی جب اس نے اپنا وجود ہی زمین پر گرادیا۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں پر حیا کی ایسی کیفیت غالب ہوجاتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اگر یہ زمین پھٹ جائے تو میں سات زمینوں کے نیچے چلا جاؤں، شرمندگی کے مارے زمین میں چھپ جاؤں، تو سجدے میں ایک تو حیا کی کیفیت ہونی چاہیۓ۔

دُوسری اس کے ساتھ اُنس کی کیفیت ہونی چاہیۓ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے اُنس ہونا چاہیۓ، گویا وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ:

نکل جائے دَم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دِل کی حسرت، یہی آرزو ہے!

یوں تصوّر کرے کہ گویا آسمانوں کے اُوپر پہنچ گیا، عرشِ معلیٰ سے اُوپر چلا گیا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کے پاؤں پکڑے ہوئے اس کے پاؤں پر سجدہ کر رہا ہوں، حق تعالیٰ شانہٗ سے محبت اور اُنس کی کیفیت پیدا ہوجائے۔

تیسری کیفیت یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی، اس کے قلب اور اس کے دِل پر محیط ہوجائے۔

چوتھے یہ کہ اللہ کے مقابلے میں عبدیت اور نیازمندی کی کیفیت ہو، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہے، ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے مقابلے میں میرا وجود حرفِ غلط ہے، میری ہر چیز ناپاک ہے، گندی ہے، پیٹ کے اندر گندگی ہے، میرے رگ و ریشے میں گندگی ہے، اُوپر چمڑا ہے، اندر گندگی ہے، میرے اخلاق گندے ہیں، میرے اعمال گندے ہیں، میرے افکار گندے ہیں، میرے خیالات گندے ہیں، سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے ناخن تک گندگی ہی گندگی

ہے، لیکن مالک کی کیسی کرم نوازی ہے کہ سراپا نجاست کو اپنی بارگاہ میں جھکنے کی توفیق عطا فرمادی، جو ذات سب سے زیادہ پاک ہے، پاکوں کی پاک ہے، اس نے اپنی بارگاہِ عالی میں اس قطرۂ ناپاک کو جس کی ابتدا گندی، جس کی انتہا گندی، جو گندگیوں کا مجموعہ ہے، اس نے اپنی بارگاہ میں سر رکھنے کی توفیق عطا فرمادی، یہ ''سبحان'' کا مضمون ہے۔

دُوسرا مضمون ''ربی'' میرا رَبّ ہے، میرا پروردگار ہے، مجھے پالنے والا ہے، اس کے بے شمار اِنعام واحسان ہیں، چونکہ اپنے محسن کے ساتھ محبت ہوتی ہے، اُنس ہوتا ہے، اس لئے اس میں اُنس کا مضمون بھی ہوا اور وہ سب سے زیادہ عالی شان ہے، اس میں عظمت کا مضمون بھی ہوا۔ تو شیخ فرماتے ہیں کہ بعض سجدہ کرنے والوں پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ شرم اور حیا کی وجہ سے گویا زمین میں گڑے جارہے ہیں اور بعض سجدہ کرنے والوں پر اُنسِ اِلٰہی کی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے، گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قدم پر سجدہ کر رہے ہیں۔ بعض پر عظمتِ اِلٰہی کی تجلی ہوتی ہے، تو آدمی میں جتنا یہ مضمون بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی اس کا سجدہ کامل ہوتا چلا جائے گا، لیکن یہ اس وقت ہوگا، جب ان چیزوں کا استحضار ہو اور اپنے سامنے ان چیزوں کو رکھے، اگر سجدے کی حالت میں پڑا ہوا تو ہے، لیکن خیالات نہ معلوم کہاں کہاں جارہے ہیں؟ اس سے گو سجدے کا فرض تو ادا ہوجائے گا، لیکن سجدے کے وہ انوار حاصل نہ ہوں گے، جو سجدے سے تمہیں لینا چاہئے تھے، وہ نہیں ملے، یہ ایک سجدہ اگر قبول ہوجائے تو اللہ تعالیٰ بیڑا پار کردیں گے۔

سجدے میں اِستحضار کا آخری درجہ:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نوّر اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ: بھائی! اور نہیں، زیادہ نہیں تو نماز کے آخری سجدے میں کم از کم اِستحضار کرلیا کرو کہ میں اللہ تعالیٰ

کے سامنے پڑا ہوا ہوں، ایک لمحے کے لئے بھی اِستحضار ہوگیا تو سمجھو کہ بیڑا پار ہے، اس سے خشیت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی، اُنسِ اِلٰہی پیدا ہوگا، اپنے گناہوں سے شرم آئے گی اور خود اپنے وجود سے بھی شرم آئے گی، کبر وغیرہ جتنے امراض ہیں سب نکل جائیں گے، یہ اکڑ وغیرہ جتنی ہے، سب نکل جائے گی۔

سجدہ اور تکبر:

ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے کہ آرام باغ کی مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز کے وقت دُعا مانگ رہا تھا، ایسی اچھی دُعا مانگ رہا تھا، مجھے ایسا لگا گویا فرشتہ آسمان سے آگیا ہے، وہ دُعا مانگ رہا تھا، اتنے میں ایک بوڑھا شخص ضعیف العمر اُٹھا، ...شاید بے چارے کی نظر کم ہوگی... اور وہ گزرتے ہوئے اس نوجوان سے ذرا سا ٹکرا گیا، تو وہ اپنی دُعا چھوڑ کر کہنے لگا: ''اندھا ہوگیا ہے؟ کیا نظر نہیں آتا، آنکھیں پھوٹ گئی ہیں، داڑھی رکھی ہوئی ہے۔'' حضرت فرماتے تھے کہ جب میں نے اس کی یہ بات سنی تو میں کانپ گیا، میں نے سوچا کہ یہ تو اس کے اندر شیطان آگیا، میں تو سمجھا تھا کہ یہ فرشتہ ہے، اس کے اندر تو شیطان ہے۔ ارے تم اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ بھی کرتے ہو، پھر دِل میں کبر بھی رہ جاتا ہے؟ پھر اپنے دِل میں کبر بھی رہ جاتا ہے؟ کہ مخلوقِ خدا تمہارے سامنے پھر ذلیل ہے، کیا یہ سجدہ ہے؟ پھر ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی'' کیوں کہتے ہو؟ جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ خدا کے سامنے سجدے میں پڑ کر کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ نہیں بھائی! سجدے میں جب ہم کہیں ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْأَعْلٰی'' تو ہمارا عجز کا مضمون ہمارے دِل میں پیدا ہو، ہماری عاجزی کا مضمون ہمارے دِل میں پیدا ہو، ہماری بے کسی کا مضمون ہمارے دِل میں پیدا ہو، اور ہم واقعتاً یہ سمجھیں کہ مجھ سے زیادہ بُرا کوئی ہے نہیں اور تجھ سے زیادہ کوئی اچھا نہیں، آپ سے زیادہ کوئی بڑا نہیں اور مجھ سے کوئی چھوٹا نہیں پھر تو بات بنی۔ بھائی! خدا کے

سامنے بندہ، بندہ بنے، اللہ تعالیٰ سے کوئی بڑا نہیں، اور مجھ سے کوئی چھوٹا نہیں، اللہ سے کوئی اچھا نہیں، اور مجھ سے زیادہ کوئی بُرا نہیں، اللہ سے زیادہ کوئی پاک نہیں، مجھ سے زیادہ کوئی گندہ نہیں، یہ مضمون دِل میں پیدا ہوجائے، جتنا دِل میں یہ مضمون پیدا ہوگا اتنا سجدہ کامل ہوگا، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، آمین!

دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ:

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا اس کو ''جلسہ'' کہتے ہیں، اور یہ واجب ہے، دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان کے ساتھ بیٹھنا یعنی اپنی جگہ پر بیٹھ جانا یہ واجب ہے، اگر آدمی دونوں سجدوں کے درمیان نہ بیٹھے تو اس کی نماز مکروہِ تحریمی اور واجب الاعادہ ہوگی، یعنی اس نماز کا لوٹانا واجب ہوگا۔

رُکوع سے کھڑے ہوکر قومہ کرنا اور سجدے سے اُٹھ کر بیٹھنا یہ دونوں واجب ہیں، ان دونوں میں اعتدال بھی واجب ہے، اگر کوئی شخص رُکوع سے سیدھا سجدے میں چلا گیا تھا، اطمینان کے ساتھ سیدھا کھڑا نہیں ہوا تو اس نے واجب ترک کردیا، اسی طرح اگر کوئی شخص دونوں سجدوں کے درمیان نہیں بیٹھا اس نے بھی واجب چھوڑ دیا، پھر اگر یہ شخص بیٹھنے کے قریب تھا اور دوبارہ سجدے میں چلا گیا تو دُوسرا سجدہ ادا ہوگیا، اور اگر سجدے ہی کے قریب تھا، بیٹھنے کے قریب نہیں تھا اور سجدے میں چلا گیا تو اس کا دُوسرا سجدہ ادا ہی نہیں ہوا، ایک ہی سجدہ اس کا ہوا۔

بہرکیف! دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا لازم ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، اور بہت سے لوگ اس معاملے میں غفلت سے کام لیتے ہیں، دونوں سجدوں کے درمیان ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھتے بلکہ جھکے جھکے دوبارہ سجدے میں چلے جاتے ہیں۔

جلسہ کی دُعا:

دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کے بعد جلسے کے اندر یہ دُعا پڑھنا:

’’اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاھْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۸۴، بحوالہ ابوداؤد وترمذی)

ترجمہ:... ’’اے اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر رحمت فرما، مجھ کو ہدایت عطا فرما، مجھ کو عافیت عطا فرما، مجھ کو رِزق عطا فرما۔‘‘

اور بعض روایتوں میں یہ دو لفظ زیادہ آتے ہیں: ’’یا اللہ! میرے نقصان کی تلافی فرما، اور میری پردہ پوشی فرما۔‘‘

یہ دُعا مستحب ہے، لیکن اگر کوئی جلسے کے اندر دُعا نہ پڑھے تو بھی کوئی حرج نہیں، لیکن پڑھنا مستحب ہے، زیادہ لمبا نہ پڑھ سکے تو ’’اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ‘‘ یا اللہ! میری مغفرت فرما، مجھ پر رحم فرما، پڑھ لے، اتنا بھی نہ ہو تو ’’رَبِّ اغْفِرْ لِیْ‘‘ (مشکوٰۃ ص:۸۴، بحوالہ نسائی و دارمی) ہی کہہ لے کہ: اے اللہ! میری مغفرت فرما۔ یہ کہنا اِمام احمدؒ کے نزدیک واجب ہے، اس لئے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر یہ دُعا پڑھنی چاہئے۔ چاہے فرض نماز میں ان کلمات کو لمبا نہ کرے، لیکن سنت اور نفل میں یہ تمام کلمات کہے، اس کے بعد دوبارہ سجدہ کرے۔

ایک رکعت میں دو سجدے:

نماز کے افعال میں صرف سجدہ ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک رکعت میں مکرّر رکھا ہے، یعنی سجدہ دو بار رکھا ہے، سورۂ فاتحہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب ہے، لیکن وہ ہر رکعت میں ایک بار ہے، اگر کوئی شخص سورۂ فاتحہ دوبارہ پڑھنے لگے تو سجدۂ سہو لازم آجائے گا، سورۂ فاتحہ دوبارہ پڑھنا جائز نہیں ہے، بس وہ ایک ہی بار پڑھو، قرآنِ کریم کی تلاوت جتنی چاہو کرتے رہو، اگر ایک سورت کو مکرّر پڑھنا چاہو تب بھی اجازت ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن فرض نماز میں مکرّر نہ پڑھا جائے۔

نماز میں رُکوع ہے ایک بار ہے، رُکوع کرنے کے بعد آپ دوبارہ رُکوع

میں چلے جائیں تو سجدۂ سہو لازم آجائے گا، رُکوع دو بار نہیں، لیکن سجدہ دو بار ہے، دونوں سجدے فرض ہیں، اگر آدمی ایک سجدہ کرنا بھول جائے تو جب تک کہ سلام نہیں پھیرتا اس سجدے کو کرلے، جہاں بھی اس کو یاد آئے سجدہ کرکے اپنی نماز پوری کرلے، بعد میں سجدۂ سہو بھی کرے، اور اگر کسی نے کسی بھی رکعت میں دو سجدوں میں سے ایک سجدہ نہیں کیا تو اس کی نماز باطل ہوگئی، وہ نماز دوبارہ پڑھے۔ خلاصہ یہ کہ نماز میں دونوں سجدے فرض ہیں۔

میں نے کہا کہ نماز کے ارکان میں سے ایک رکعت میں صرف سجدے کو اللہ تعالیٰ نے مکرّر فرمایا ہے، مکرّر کے معنی ہیں: دو بار۔ اب اس راز کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟

دو سجدوں کی وجہ؟

لیکن بات یہ ہے کہ ایک سجدے کے بعد جب آدمی بیٹھا تو جو قرب اس کو سجدے میں نصیب ہوا تھا اور حق تعالیٰ شانہٗ کے لطف وعنایت کا جو مشاہدہ اس نے سجدے میں کیا تھا، اب اس کا جی نہیں چاہتا کہ دوبارہ سجدہ کئے بغیر اُٹھ جائے، گویا بندہ اجازت کے طور پر کہتا ہے: ''اجازت ہو تو ایک سجدہ اور کرلوں!'' حکم دیا گیا کہ تمہاری خواہش ہے تو ہاں! ایک سجدہ اور کرو، یہ تم پر فرض کرتے ہیں۔

دو بار سے زیادہ ایک رکعت میں سجدے کرنے کی اجازت نہیں دی، ورنہ طبیعت تو یہی چاہتی ہے کہ آدمی بار بار سجدے ہی کرتا رہے۔ فرمایا: نہیں! اب رکعت پوری کرو، پھر سجدے میں جاؤ تو سجدہ ایسی لذیذ چیز ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں پر لطف وعنایت فرماتے ہوئے سجدے کی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ فرض کردیا اور دو سجدے کرلئے۔

جلسۂ اِستراحت کی وجہ:

اب دُوسرے سجدے سے اُٹھ کرکے بیٹھ جائے اور ذرا سا بیٹھ کر پھر کھڑا ہو،

یہ طریقہ حضراتِ شافعیہ کے نزدیک ہے، ہمارے نزدیک نہیں ہے، مصنفؒ چونکہ شافعی مذہب کے ہیں، وہ اپنے مذہب کے مطابق مسئلہ لکھتے ہیں۔ اصل میں آخری زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کرتے تھے کہ دُوسرے سجدے کے بعد ذرا سا بیٹھ جاتے تھے اور بیٹھ کر کے پھر اُٹھتے تھے، اس جلسے کو جلسۂ اِستراحت کہا جاتا ہے یعنی آرام لینے کا جلسہ، حضراتِ شافعیہ کے نزدیک یہ سنت ہے لیکن ضروری نہیں، اور ہمارے نزدیک یہ بذاتِ خود سنت نہیں بلکہ عذر کی بنا پر ہے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَضُ فِي الصَّلٰوةِ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ۔" (ترمذی ج:۱ ص:۶۴)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ سے ہی یہ معمول رہا تھا کہ آپ اپنے قدموں کے پنجوں پر اُٹھتے تھے، یعنی سجدے سے پنجوں پر اُٹھتے تھے یعنی بیٹھتے نہیں تھے۔"

لیکن آخری زمانے میں کچھ وقت ایسا بھی گزرا کہ بیٹھنے لگے تھے، تو ہمارے اِمامؒ فرماتے ہیں کہ بیٹھنا عذر کی بنا پر تھا، سنت کی بنا پر نہیں تھا۔

بہرحال! شافعیہ کے نزدیک جب دُوسرے سجدے کے بعد آدمی "اللہ اکبر" کہہ کر بیٹھے گا اور جلسۂ اِستراحت کرے گا تو ذرا سا بیٹھنے کے بعد جب قیام کے لئے اُٹھے گا تو دوبارہ اللہ اکبر نہیں کہے گا، بلکہ اسی طرح کھڑا ہوجائے گا۔

ہمارے نزدیک بھی اگر کوئی شخص دُوسرا سجدہ کرنے کے بعد بھول کر بیٹھ جائے اور اتنا ذرا سا بیٹھے جتنا شافعیہ کا جلسۂ اِستراحت ہوتا ہے تو اس سے سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا، لیکن اگر زیادہ بیٹھ جائے گا تو سجدۂ سہو لازم آجائے گا۔

زیادہ اور کم بیٹھنے کی مقدار تین تسبیح کی ہے، تین مرتبہ "سبحان اللہ" اطمینان کے ساتھ کہنے کی مقدار سے اگر کم بیٹھے گا تو سجدۂ سہو لازم نہیں آئے گا۔

اسی طرح صلوٰۃ التسبیح میں بھی دس تسبیحات بیٹھ کر پڑھی جاتی ہیں، چونکہ وہ ذکر کے لئے بیٹھنا ہے، اس لئے اس بیٹھنے کی بنا پر بھی ہمارے نزدیک سجدۂ سہو لازم نہیں آتا، اور جب ان دس تسبیحات کو پڑھنے کے بعد اُٹھے تو "اللہ اکبر" کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ بغیر "اللہ اکبر" کہے اُٹھے، اس لئے کہ دُوسرے سجدے سے اُٹھنے کے بعد ایک دفعہ "اللہ اکبر" کہہ لی تھی، وہی کافی ہے، دوبارہ تکبیر نہ کہے۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ: اسی طرح دُوسری رکعت بھی پوری کرلے، جس طرح میں نے بتایا ہے، یعنی اسی طرح قیام کرے، اسی طرح رُکوع کرے، اسی طرح سجدے کرے، جب دونوں رکعتوں سے فارغ ہوجائے تو اَب بیٹھے جس کو قعدہ ...بیٹھنا... یعنی "التحیات" اور "تشہد" کہتے ہیں۔

نماز میں معراج:

فرماتے ہیں کہ نماز کے اندر معراج کا سر (راز)، معراج کی رُوح اور معراج کا بھید پایا جاتا ہے، یعنی جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہٗ سے ملاقات کرنے کے لئے معراج پر تشریف لے گئے تھے، اسی طرح نماز مؤمنین کی معراج ہے، نماز شروع ہوئی تو گویا سیر الی اللہ شروع ہوئی، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف چلنا شروع ہوگیا۔

قعدہ مقرّب الوصول:

فرماتے ہیں: نماز یہ معراج القلوب ہے، یعنی دِل کی معراج اور تشہد میں بیٹھنا مقرب الوصول ہے۔ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں کی مسافت قطع کرتے ہوئے حق تعالیٰ شانہٗ کے قلبِ جلال میں پہنچے تھے، اسی طرح بندہ نماز شروع کرکے اپنی تمام ہیئتیں یعنی قیام، قراءت، رُکوع، سجود ان تمام ہیئات کو قطع کرتے ہوئے اب مقرب الوصول کی طرف پہنچ گیا، وصول کا مطلب ٹھہرنا تو گویا

''التحیات'' اور تشہد بیٹھنے کے بعد اس کو وصول ہوگیا، وصول کے بعد ٹھہراؤ ہوگیا، اب یہ گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ عرض معروض کرنا چاہتا ہے، اب تک تو یہ سیر کر رہا تھا، قلب کے درجات طے کر رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہوئے اس کی تسبیحات پڑھتے ہوئے، اس کی تکبیر وتہلیل کرتے ہوئے قرب کے درجات کو قطع کر رہا تھا، جب دُوسری رکعت کے دُوسرے سجدے سے فارغ ہوا تو اس کے پڑاؤ کی جگہ آ گئی، حکم ہوا: ٹھہر جاؤ! یہاں ٹھہر جاؤ!

ایک روایت میں آتا ہے، اگرچہ وہ روایت کمزور ہے، کہ جب معراج پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو آواز آئی: ''قِفْ یَا مُحَمَّدُ!'' اے محمد ٹھہر جاؤ! تمہارے رَبّ صلوٰۃ پڑھ رہے ہیں، مراد اس سے یہ ہے کہ رحمت کے لئے متوجہ ہیں، تمہارے ٹھہرنے کی جگہ آگئی۔ تو دُوسری رکعت سے فارغ ہونے کے بعد گویا بندے سے کہا جارہا ہے کہ ٹھہر جاؤ! تم نے اپنے رَبّ کی نماز پڑھ لی، اب حق تعالیٰ شانہٗ اپنی رحمتوں کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ ہیں، بیٹھ جاؤ، کہو، کیا کہتے ہو؟

التحیات پڑھنا:

شیخؒ فرماتے ہیں کہ اب یہ التحیات پڑھے، جو یہ ہے:

''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ أَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ، اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ، أَشْھَدُ أَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔''

(مشکوٰۃ ص:۸۵، بحوالہ بخاری ج:۲ ص:۹۲۶، ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے مختلف صیغے اور الفاظ منقول ہیں، جن کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نقل کیا ہے، التحیات کے یہ الفاظ جو ہم

پڑھتے ہیں یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد ہے، صحیح بخاری (ج:۲ ص:۹۲۶) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ تشہد سکھایا تھا، اس حالت میں کہ میرا ہاتھ آپ کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، مصافحہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا، ہمارا یہ تشہد مسلسل بالمصافحہ ہے، چنانچہ حاشیہ ترمذی میں ہے:

”وَذَكَرَ ابنُ الهمامِ قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ: أَخذَ حَمَّادٌ بِيَدِى وَعَلَّمَنِى التَّشَهُّدَ، وَقَالَ حَمَّادٌ: أَخذَ اِبرَاهِيمُ بِيَدِى وَعَلَّمَنِى التَّشَهُّدَ، وَقَالَ اِبرَاهِيمُ: أَخذَ عَلقَمَةُ بِيَدِى وَعَلَّمَنِى التَّشَهُّدَ، وقال عَلقَمَةُ: أَخذَ عَبدُاللهِ بنُ مَسعُودٍ بِيَدِى وَعَلَّمَنِى التَّشَهُّدَ، قال عَبدُاللهِ: أَخذَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ بِيَدِى وَعَلَّمَنِى التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنِى السُّورَةَ، فَكَانَ يَأخُذُ بِالوَاوِ وَالاَلِفِ وَاللَّامِ۔“

(حاشیہ سنن ترمذی ج:۱ ص:۶۵)

ترجمہ:... ”علامہ ابن الہمامؒ نے ذکر کیا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو میرے اُستاذ اور میرے شیخ حمادؒ نے تشہد سکھایا تھا اس حالت میں کہ میرا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، حمادؒ کہتے ہیں کہ: مجھے ابراہیم نخعیؒ نے تشہد سکھایا تھا اس حالت میں کہ میرا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ: مجھے علقمہؒ نے تشہد سکھایا اس حال میں کہ میرا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، علقمہؒ کہتے ہیں کہ: مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تشہد سکھایا اس حال میں کہ میرا ہاتھ ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھا، اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد سکھلایا اس حالت میں کہ میرا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں میں تھا، مصافحہ کر رہے تھے اور اس طرح تشہد سکھلایا کہ جس طرح مجھے سورۃ سکھاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واؤ، الف اور لام کی غلطی پر بھی گرفت فرماتے تھے۔“

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ تشہد بالمصافحہ ہے، یعنی ہر ایک نے مصافحہ کرتے ہوئے سکھایا۔ اور ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”عَلَّمَنِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَکَفِّی بَیْنَ کَفَّیْهِ التَّشَهُّدَ کَمَا یُعَلِّمُنِی السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔“

(بخاری ج:۲ ص:۹۲۶)

ترجمہ:... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تشہد اس طرح سکھاتے تھے جس طرح قرآنِ کریم کی سورت سکھاتے تھے۔“

تشہد کے چار مضامین:

اس تشہد میں چار چیزیں ہیں، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سلام ہے، جب کسی کے سامنے جاتے ہیں، بیٹھتے ہیں، تو السلام علیکم کہتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کو سلام ہم کیسے کہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”کُنَّا اِذَا صَلَّیْنَا خَلْفَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا: اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰهِ... وَفِیْ رِوَایَةٍ... اَلسَّلَامُ عَلٰی جِبْرَئِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ اَلسَّلَامُ عَلٰی فُلَانٍ وَّفُلَانٍ.....“ (بخاری ج:۱ ص:۱۱۵)

ترجمہ:... ”جب ہم نماز ختم کیا کرتے تھے تو ہم یوں کہتے تھے: اللہ تعالیٰ کو سلام، جبرائیل کو سلام، میکائیل کو سلام، فلاں کو سلام، فلاں کو سلام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کو سلام کہتے ہو، اللہ تعالیٰ خود سلام ہیں۔“

جب نماز سے فارغ ہوکر بیٹھو تو پھر آپ نے یہ تشہد سکھائی، یہ کہا کرو: ”اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ .... الخ“ یعنی تمام تحیات اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، تمام صلوات اور تمام طیبات اللہ کے لئے ہیں۔

تحیات: جمع ہے تحیۃ کی، عربی زبان میں تحیہ سلام کو کہتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہاں تحیات سے مراد ہے قولی عبادتیں، یعنی تمام وہ عبادتیں جو زبان سے ادا کی جاتی ہیں، جیسے تسبیح، تمجید، تکبیر وغیرہ جو جو بھی اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا، اللہ تعالیٰ کی بزرگی، اللہ تعالیٰ کی تسبیح زبان سے کی جاسکتی ہے، التحیات کا لفظ سب کو شامل ہے، تمام وہ عبادتیں جو زبان سے ادا کی جاسکتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

صلوات: جمع ہے صلوٰۃ کی، صلوٰۃ نماز کو کہتے ہیں، یعنی تمام نمازیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بدنی عبادتیں ہیں، یعنی تمام وہ عبادتیں جو بدن سے ادا کی جاتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

طیبات: جمع ہے طیبہ کی اور طیبہ کے معنی ہیں: پاکیزہ چیز، اس سے مراد مالی عبادتیں ہیں۔ یعنی جو عبادتیں زبان سے ادا کی جاتی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جو عبادتیں بدن سے کی جاتی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور جو عبادتیں مال کے ذریعے کی جاتی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، یہ ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سلام۔

دُوسرا فقرہ ہے ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ'' یعنی سلام ہو آپ پر، اے نبی! اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں آپ پر۔

شیخ فرماتے ہیں کہ جب یہ الفاظ کہو تو اپنے دِل کی آنکھوں کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرو، یہاں لوگ حاضر و ناظر کا مسئلہ لئے پھرتے ہیں، ہر جگہ حاضر کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، پہلے دِل کے سامنے تو حاضر و ناظر کرلو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِستحضار کرو، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے سامنے بیٹھے ہیں، اور میں آپ کی خدمت میں عرض کررہا ہوں۔

''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ''

یعنی سلام ہو آپ پر اے نبی! اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں اور اللہ تعالیٰ کی برکتیں ہوں آپ پر۔

یہاں ایک نکتہ اور ایک مسئلہ ذکر کرتا ہوں۔

ایک مسئلہ:

مسئلہ یہ ہے کہ نماز میں غیراللہ سے خطاب کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، نماز اوّل سے لے کر آخر تک اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، نماز اوّل سے لے کر آخر تک ذکرِ اِلٰہی ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ:

''وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکْرِیْ'' (طٰہٰ:۱۴)

یعنی قائم کرو نماز کو میرے ذکر کے لئے۔

نماز میں کسی اور سے کوئی واسطہ نہیں ہے، نماز میں بندے کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے واسطہ نہیں، چنانچہ اگر کسی آدمی کا نام ''یحییٰ'' ہو اور اس کو بلانے کے لئے کوئی آدمی نماز میں کہہ دے ''یا یحییٰ!'' تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی، کیونکہ اس

لفظ سے غیر اللہ کو خطاب کر رہا ہے اور نماز میں غیر اللہ کو خطاب کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

نکتہ:

اب نکتہ یہ ہے کہ یہاں تشہد میں آخر کیا وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا جاتا ہے مگر نماز باطل نہیں ہوتی، چنانچہ ہم التحیات میں کہتے ہیں:

"اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" یعنی سلام ہو آپ پر اے نبی!

آپ جانتے ہیں نا! کہ کوئی آدمی قریب آجائے اور نماز میں ہی نمازی اس کو کہے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ" یا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی، یعنی نماز میں کسی کو سلام کہنے سے نماز ٹوٹ جائے گی، لیکن بندہ نماز میں تشہد میں بیٹھ کر کہتا ہے: "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ یہ دُعا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں تشریف فرما تھے ہم "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" کہا کرتے تھے:

"فَلَمَّا قُبِضَ قُلْنَا: اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔" (بخاری ج:۲ ص:۹۲۶)

ترجمہ:... "لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے پردہ فرما گئے تو ہم "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ" کے بجائے "اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہ" پڑھتے تھے، یعنی سلام ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔"

لیکن یہ بات چلی نہیں، آپ جانتے ہیں کہ آج کوئی بھی نماز میں

"اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ" نہیں کہتا، کچھ صحابہ کرامؓ نے اپنے ذوق سے یہ کہنا شروع کردیا ہوگا، لیکن بعد میں یہ بات چلی نہیں، وہی "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" رہا۔

التحیات بارگاہِ الٰہی کا تحفہ ہے:

نکتہ اس میں یہ ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، بقول شیخ کے التحیات جو ہے نا! مقرب الوصول ہے، یعنی پہنچنے کے بعد ٹھہرنے کی جگہ ہے، یعنی نماز کی سیر کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں پہنچ گئے ہو، اور وہاں پہنچ کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ہی بارگاہِ الٰہی میں موجود ہیں، اور یوں نظر آیا کہ جتنے فیوض لوگوں کو ملے تھے سب اسی ذاتِ عالی کی برکت سے ملے تھے، اور جس کو کچھ ملا انہی کے قدموں کی خاک کی وجہ سے ملا، یوں سمجھو کہ ہم بارگاہِ الٰہی میں بیٹھ گئے ہیں اور اس شہنشاہ کے دربار میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے ہی موجود ہیں، ہم نے جہاں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سلام عرض کیا، ممکن نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام نہ کہتے، کیونکہ جو کچھ ہمیں ملا ہے یہ انہیں کے طفیل سے ملا ہے، اس لئے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُهٗ" کہا جاتا ہے۔

بریلویوں کی تہمت کی اصل:

یہاں سے بعض دوستوں کی اس تہمت کی بھی قیمت معلوم ہوجائے گی، جو یہ کہتے ہیں کہ علمائے دیوبند کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دِل میں خیال آنا یہ گائے اور بھینس کے خیال سے بدتر ہے، نعوذ باللہ!

اس بات کی حقیقت کو ان بے چاروں نے نہ کبھی سمجھا، نہ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں، اور نہ ہی اس کے سمجھنے کی اِستعداد رکھتے ہیں، جو بات میں ذکر کر رہا ہوں ذرا انہی سے پوچھ لو کہ ان کے ذہن میں یہ بات کبھی آئی ہے؟ اور یہ نماز اسی طرح پڑھا کرتے ہیں؟ اللہ کے بندو! بات کو کچھ سوچ کے تو کہا کرو، کسی پر تہمت بھی لگانی ہو تو

کچھ سوچ کے تو لگاؤ۔

نبی کا تصوّر منع نہیں:

قرآنِ کریم میں جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں آتا؟ جب ہم ایسی آیات پڑھیں گے تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور نہیں آئے گا؟ اور کیا دُوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے اسمائے گرامی قرآنِ کریم میں نہیں آتے؟ جب ہم قرآنِ کریم سوچ کر پڑھیں گے: ''یٰمُوسٰی لَا تَخَفْ'' تو ہمارے ذہن میں کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تصور نہیں آئے گا؟ تو یہ کیسی تہمت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال آنا گائے اور بھینس کے خیال سے بدتر ہے، نعوذ باللہ!

صرف ہمت منع ہے:

اب کیا کہوں کہ یہ کیسے گندے الفاظ استعمال کرتے ہیں، یہ لوگ مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب ''صراطِ مستقیم'' کے حوالے سے بات کرتے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے شیخ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اِمام المجاہدین کے ملفوظات جمع کئے ہیں، اس میں جو بات انہوں نے کی ہے اس کو یہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں، انہوں نے کچھ اور کہا تھا، انہوں نے خیال آنے کو نہیں کہا ''صرف ہمت'' کو کہا ہے، کبھی اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اس مسئلے پر بھی گفتگو ہوجائے گی، اب چھوڑتا ہوں۔

اپنے آپ پر سلام کیوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا، بھائی! بارگاہِ اِلٰہی میں تو تمام مقربین موجود ہیں، تم بھی اس زُمرے میں آگئے ہو، فرماتے ہیں کہ: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ'' دیکھئے ہم پر بھی سلام اور اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندوں پر سلام کہا جارہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب تم یہ کہو گے ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ'' تو یہ تمہاری دُعا آسمان اور زمین کے تمام مقبول

بندوں کو پہنچ جائے گی۔ یہاں شیخ نے بھی اشارہ کیا ہے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں بھی تھوڑا سا اس پر لکھا ہے کہ یہ جو جماعت کی نماز ہے اس میں تمام نمازیوں کے انوار مجتمع ہوجاتے ہیں، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے الفاظ میں اس کی حیثیت مرآۃ متعاکسہ کے ہوجاتی ہے، یعنی ایک آئینہ اِدھر ہے، ایک آئینہ اُدھر ہے، دونوں آئینے ایک دُوسرے کے سامنے رکھ دیئے، اب تم اس طرف دیکھو تو ایک لمبی لائن آئینوں کی نظر آئے گی، ہماری نظر ختم ہوجاتی ہے وہ لائن ختم نہیں ہوتی، اُدھر دیکھو تو اُدھر بھی لائن، ایک کا عکس دُوسرے پر اور دُوسرے کا تیسرے پر، ایک دُوسرے کا عکس پڑ کر ایک طویل لائن ہوجاتی ہے، یعنی ختم نہ ہونے والی لائن، شیخ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہے نا! ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ'' یہ کہتے ہوئے تم اپنے ساتھیوں کا بھی تصوّر کرو، نہیں! بلکہ رُوئے زمین پر جتنے نماز پڑھنے والے ہیں گویا سب کو ایک صف میں شامل سمجھو، ان کا بھی تصوّر کرو، اسی طرح آسمان کے فرشتے بھی اس میں شامل کرو، انسان ہوں، ملائکہ ہوں، یا جنات ہوں، جتنے عباد اللہ الصالحین ہیں ان سب کے لئے کہو: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ'' اور اللہ تعالیٰ کے تمام بندے جب ایک دُوسرے کے لئے یہ دُعا کریں گے تو تم خود غور کرو کہ میزان کہاں پہنچ جائے گا، بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس صف میں شامل ہیں۔

مسلمانوں کی خوش قسمتی:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ کے بقول حضرت فرماتے ہیں کہ:

بھائی! تم بڑے خوش قسمت ہو، ہم لوگ بڑے خوش قسمت ہیں، ایک بندہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی عباد اللہ الصالحین میں شامل کرلیں، اللہ تعالیٰ کے تمام نیک بندے یہ دُعائیں کر رہے ہیں اور یہ پانچ وقت کر رہے ہیں اور تشہد میں کر رہے ہیں، عباد اللہ الصالحین میں شامل ہوجاؤ، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں شامل ہوجاؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام

تمہارے لئے دُعائیں کر رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہارے لئے دُعائیں کر رہے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام تمہارے لئے دُعائیں کر رہے ہیں، ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش تمام انبیائے کرام یہ دُعائیں کر رہے ہیں، تمام اہلِ ایمان دُعائیں کر رہے ہیں، کوئی حد ہے، کوئی ٹھکانا ہے، اور جس شخص کے لئے اتنی مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے اتنے بندے دُعائیں کر رہے ہیں، اس سے بڑا خوش قسمت کون ہوسکتا ہے؟

(بیان کے آخر میں حاضرین کے سوالوں کا جواب بھی
حضرت شہیدؒ نے مرحمت فرمایا)

صبح جاگنے کا انتظام کرو:

سوال:... یہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میں چار وقت نماز تو پڑھ لیتا ہوں، فجر کی نماز قضا ہوجاتی ہے۔

جواب:... آپ حضرات دُعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کی بھی توفیق عطا فرمائیں۔ بھائی! کیوں قضا ہوجاتی ہے؟ اس کا علاج بھی ہونا چاہئے، ہم دُعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو نمازِ فجر میں اُٹھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ لیکن کیوں قضا ہوتی ہے؟ خاص کر آج کل رات بارہ بجے آدمی سوئے تو چھ گھنٹے نیند کرنے کے بعد صبح چھ بجے اُٹھ سکتا ہے، اور ساڑھے چھ بجے نماز میں شریک ہوسکتا ہے، اپنے نظام کو ٹھیک کرنا چاہئے، سونے اور جاگنے کے نظام کو ٹھیک کرنا چاہئے، جلدی سونے کی کوشش کرو، جو کام تم عشاء کے بعد کرتے ہو، تہجد کے وقت اُٹھ کر کرو، اپنی نیند بھی کرو اور تہجد کے وقت اُٹھ کر کرو۔ بہرکیف! یہ شکایت میرے بہت سارے دوست کرتے ہیں کہ فجر کی نماز کے لئے ہماری آنکھ نہیں کھلتی، اللہ تعالیٰ بھائی سب کو توفیق عطا فرمائے، کبھی آدمی کو غفلت ہو بھی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، الارم وغیرہ کا انتظام کرنا

چاہئے، گھر والوں کو کہہ دینا چاہئے کہ ہمیں جگادو اور اہتمام کرنا چاہئے۔

میرے ایک دوست کہہ رہے تھے اور بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے کہ رات کو اللہ تعالیٰ سے کہہ کر سوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں نے رات کو فلاں وقت اُٹھنا ہے، کبھی ہوا ہی نہیں کہ اس وقت نہ اُٹھے، ایسا ہی ہونا چاہئے بھائی! رات کو فکر لے کر سوئیں گے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرکے سوئیں گے اور ذرا وقت پر سونے کی کوشش کروگے تو اِن شاء اللہ! جاگ آجائے گی۔

جہاد کی صورت کیا ہوگی؟

سوال:... کفار کے خلاف کوئی اعلانِ جہاد کرے تو کیا کفار کے خلاف جہاد کرسکتے ہیں؟

جواب:... آپ جہاد میں شریک کیسے ہوسکتے ہیں؟ میرے بھائی! اس کی کوئی صورت بھی آپ نے پہلے تجویز فرمائی ہے؟ مولانا شاہ احمد نورانی تو بیس ہزار آدمی بھرتی کرتے ہیں، لیکن عراق جائیں گے کیسے؟ ایسی بے ہودہ باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ بھائی! کیا ہم عراق جاسکتے ہیں؟ ایسا اگر ممکن ہے تو مجھے بھی بتاؤ۔ اور دُوسرا پوچھ رہے ہیں کہ کیا عراق اپنے موقف پر صحیح ہے؟ یہ تو تم لوگ ہی جانتے ہو، میں تو سیاسی باتیں جانتا نہیں، اسی لئے آج عزیز منیر احمد کہنے لگے کہ آج کیا بیان کریں گے؟ میں نے کہا: جو میں بیان کیا کرتا ہوں وہی بیان کروں گا۔ مجھے یہ باتیں آتی نہیں ہیں، آپ اس کو میری کمزوری سمجھیں، میں ان باتوں کو ویسے بھی فضول سمجھتا ہوں، میں عراق عرب کے مسئلے پر دُھواں دار تقریر کردوں نتیجہ کیا آئے گا اس کا؟ کچھ بھی نہیں بھائی۔

عراق کویت جنگ:

لیکن اتنا مجھے نظر آرہا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ نے ہمارے خلاف سازش کی

ہے، عراق کو پہلے اُکسایا کہ کویت پر قبضہ کرو، یہ بھی انہی کے اشارے پر ہوا ہے، اور یہ شرارت شروع کردی۔ امریکا کے پیٹ میں کبھی درد نہیں ہوا غریب کے لئے، صرف کویت پر حملہ کرنے کے لئے فوراً آکر بمباری شروع کردی، چھ ماہ تک عراق کا بائیکاٹ کیا، بچوں تک کو غذا سپلائی نہ کی جائے، یہ اقوامِ متحدہ اتنا مستحکم ادارہ ہے کہ کسی ملک کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ عراق سے جاکر پوچھ لے کہ بھائی! تم ہمارے بھائی ہو، مر رہے ہو، آخر کیا قصہ ہے؟ تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ اس لئے کہ اقوامِ متحدہ کا آرڈر تھا، بش بہادر نے آرڈر جاری کروایا تھا، چھ ماہ کے بائیکاٹ کے بعد، ناکہ بندی کے بعد، اس کے باوجود بھی جب عراق کا لوہا ٹھنڈا نہ ہوسکا تو پندرہ جنوری کا الٹی میٹم دلوایا گیا اور وہ بھی اقوامِ متحدہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر۔ اقوامِ متحدہ کون ہے؟ اور اقوامِ متحدہ میں یہ جو ہم جیسے ممالک ہیں ان کی قیمت ہی کیا ہے؟ پانچ چھ بڑی طاقتوں کا نام ''اقوامِ متحدہ'' ہے، اور یہ باقی سب ان کے لنگوٹئے ہیں، ان کے تابعِ مہمل ہیں، مجھے آپ معاف کریں، اگر میں یہ کہوں کہ اقوامِ متحدہ سے مہمل ادارہ دُنیا میں اور کوئی نہیں ہے، تو اس کہنے میں حق بجانب ہوں کیا اس نے آج تک کسی ظالم سے مظلوم کو انصاف دِلوایا ہے؟ عراق ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی قوّت کو کچلنے کے لئے کبھی اس نے کوئی ردّعمل ظاہر کیا ہے؟ یہ کویت کا جھگڑا کھڑا کیا اور اب بمباری ہو رہی ہے، ہیروشیما سے دُگنے بم ایک دن میں برسائے جاچکے ہیں، وہ کس کی دھرتی ہے؟ امریکا بہادر بش کی ہے یا اس کے باپ کی ہے؟ زمین مسلمانوں کی اور بم برسائے جارہے ہیں ان پر، کوئی احتجاج کرنے والا نہیں اس کے خلاف اور اس کے بعد تیل کے چشموں پر قبضہ، کنوؤں پر قبضہ، اب یہ سفید بندر خدا جانے کب نکلے گا؟ سب سے پہلے تو کیا حال کرے گا جنگ کہاں تک پھیلے گی؟ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو!

ایک طرف سعودی عرب ہے، دُوسری طرف عراق ہے، دونوں کو اس بندر نے لڑایا اور اس لڑائی میں تمام دُنیا کو ساتھ لے کر خود کود گیا ہے، اور عجیب بات یہ ہے

کہ مسلمانوں کو اُلّو بنا کر اس میں نچوا رہا ہے، مجھے تو سیاست آتی نہیں، اس لئے میں تو ان باتوں کو کرتا ہی نہیں، بھائی! صحیح غلط میں نہیں جانتا، تمہارے سامنے ہی ہے۔

اللہ طاغوتی قوّتوں کو تباہ کرے:

باقی یہ ضرور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس امریکا اور برطانیہ کو، ان طاغوتی طاقتوں کو نیست و نابود کردے، تباہ و برباد کردے، ان کو اللہ تعالیٰ صفحۂ ہستی سے مٹادے، یہ مسلمانوں کو تگنی کا ناچ نچاتے ہیں، کبھی دو مسلمانوں کو مل بیٹھنے نہیں دیتے، مسلمان بے چارے سادے ہیں، بھولے ہیں، اور سب کچھ ہے ان میں لیکن بس یہ ہے کہ آدم کے بیٹے ہیں، اِبلیس کے چکر میں آجاتے ہیں، اِبلیس ان کو چکما دیتا ہے، آدم کے بیٹے ہیں، ہمارے جدِ اَمجد کو جنت میں اِبلیس نے دھوکا دے دیا تھا، یہ اِبلیس کی اولاد کے چکر میں آجاتے ہیں۔

اَذان و اِقامت سے قبل دُرود:

سوال:... کیا اَذان و اِقامت سے پہلے دُرود شریف ہے؟

جواب:... بھائی! اَذان کے بعد دُرود شریف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

”اِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا یَقُوْلُ، ثُمَّ صَلُّوْا .... ثُمَّ سَلُوا اللهَ الْوَسِیْلَةَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۶۴، بحوالہ مسلم)

ترجمہ:... ”جب مؤذّن اَذان کہے، جیسا مؤذّن کہتا ہے ویسے الفاظ کہتے رہو، اور جب وہ اَذان سے فارغ ہوجائے تو کیا پڑھتے ہیں پہلے دُرود شریف پڑھتے ہیں پہلے دُرود شریف پڑھو پھر دُعائے وسیلہ کرو۔“

یہ جو نماز کی کتابوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے یہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں

آتا، بعض روایتوں میں ... یہ دُعاء وسیلہ کہلاتی ہے... اس کے پڑھنے کا حکم ہے، اور اس کے بعد دُوسرا کلمہ پڑھنا چاہیے، پورا کلمہ۔

اس کے بعد دُعائے ترضی پڑھنی چاہیے: "رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا"۔ اور خاص نکتہ یہ ہے کہ یہ دُعا تین تین مرتبہ پڑھے، لیکن وہاں "وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا" پہلے اور "بِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا" بعد میں ہے۔ لیکن اَذان کے بعد جو پڑھی جاتی ہے "وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" پہلے ہے، اور "وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا" بعد میں ہے۔ "رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا" (مشکوٰۃ ص:۶۵، بحوالہ مسلم) یہ چار چیزیں اَذان کے بعد پڑھنے کا حکم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے مؤمن بندوں کی نصرت اور مدد فرماتے ہیں، مدد اور نصرت یہ اس کی صفت ہے، نبیوں کے زمانے میں مدد اور نصرت فرماتے تھے، کیا اب نہیں فرماتے؟ نہیں! وہ تو اسی طرح مدد اور نصرت فرماتے ہیں، مؤمن بن جاؤ، وہ تو اسی طرح مدد فرماتے ہیں، ان کی مدد اور نصرت میں کوئی فرق نہیں آیا، تغیر وتبدل تمہارے اندر ہے، اس ذاتِ عالی میں تغیر وتبدل نہیں، لینے کا ڈھنگ ہمیں نہیں آتا، اس کو دینے کا ڈھنگ اب بھی اسی طرح آتا ہے، جس طرح پہلے آتا تھا، وہ ویسے ہی داتا ہے۔ اور اس کی ذاتِ عالی ویسے ہی لائقِ اعتماد اور لائقِ توکل ہے، جیسے کہ ہمیشہ سے تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا تجھ کو اپنے مشاہدے سے ایسی چیز کے ساتھ محجوب کرنا، جو اس کے ساتھ موجود نہیں، اس کے قہر اور غلبے کی بڑی دلیل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ کوئی چیز موجود نہیں، اللہ تعالیٰ ازل سے تھے، اس وقت کچھ بھی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ ابد تک ہوں گے، جبکہ اس وقت کچھ نہیں ہوگا، یہ تو گزشتہ زمانے اور آئندہ زمانے کے بارے میں ہوا۔

حضراتِ عارفین اِس وقت بھی یہ سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور باقی کوئی اس کے ساتھ موجود نہیں، موجودِ حقیقی صرف وہی ذات ہے، وجود اسی کی صفت ہے، باقی تو ایسی ہی کٹھ پتلیاں ہیں، اس کے ارادے اور اس کی مشیت کے تابع ہیں۔

معدوم مشاہدۂ اِلٰہی سے آڑ کیونکر بن سکتی ہے؟

حضرت شیخ تاج الدین اسکندری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: جو چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ موجود نہیں، ...اللہ تعالیٰ موجود اور دُوسری چیزیں اس کے ساتھ موجود نہیں...عجائبات میں سے ہے کہ وہ چیزیں تجھ کو اللہ تعالیٰ کے مشاہدے سے روک رہی ہیں، وہ چیزیں تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آڑ بنی ہوئی ہیں، حالانکہ معدوم چیز جو

کہ ہے ہی نہیں، وہ کیسے آڑ بن سکتی ہے؟ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کے قہر اور غلبے کی دلیل ہے کہ اِن معدومات میں تجھ کو اُلجھا کر اپنی ذات سے اور اپنے مشاہدے سے محروم کردیا۔ آگے چند فقروں میں اسی کی دلیل بیان فرماتے ہیں:

الف:... ’’کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کے مشاہدے کی آڑ ہوجائے، حالانکہ ہر ایک چیز کو عدم کی تاریکی سے اسی نے ظاہر فرمایا۔‘‘

یعنی ساری چیزیں عدم میں تھیں، عدم کی تاریکی سے اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو ظاہر فرمایا، تو یہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ ہی کی ظاہر کی ہوئی ہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا پتا بتانے والی ہیں، نہ کہ اس سے روکنے والی۔

ب:... ’’کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کے مشاہدے کا پردہ ہوجائے، حالانکہ وہ ہر ایک چیز کے ساتھ ظاہر ہے۔‘‘

یعنی ہر چیز سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا ثبوت ملتا ہے، تو جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل ہیں، وہ اس کے مشاہدے سے روکنے والی کیسے ہوسکتی ہیں؟

ج:... ’’کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کے مشاہدے سے روک دے، حالانکہ ہر ایک چیز میں اس کا جلوہ ظاہر ہے، کیونکر خیال میں آسکتا ہے کوئی شئے اس کے مشاہدے کی حاجب ہوجائے، یعنی روکنے والی ہوجائے، حالانکہ ہر ایک چیز کے لئے اس کی تجلی ظاہر ہے، کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کی آڑ بن جائے، حالانکہ تمام موجودات کے وجود سے بیش تر و پیش تر وہ ظاہر و باہر ہے، کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کے مشاہدے کو مانع ہوجائے، حالانکہ

وہ سب سے زیادہ ظاہر ہے، کیونکر خیال کیا جاسکتا ہے کہ کوئی شیئ اس کے لئے حجاب ہوسکے، حالانکہ وہ اکیلا ہے، اس کے ساتھ کوئی موجود نہیں، کیونکر خیال کیا جاسکتا ہے کہ کوئی چیز اس کے لئے حجاب ہوسکے، حالانکہ ہر چیز کی نسبت تجھ سے زیادہ قریب ہے، ”نَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِن حَبلِ الوَرِیدِ“۔

یعنی انسان کو جتنا تعلق اپنی جان سے ہے اتنا کسی چیز سے نہیں، نہ ماں باپ سے، نہ کسی اور سے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

”وَنَحنُ أَقرَبُ اِلَیہِ مِنْ حَبلِ الوَرِیدِ۔“ (ق:۱۶)

ترجمہ:... ”ہم اس کے زیادہ قریب تر ہیں اس کی شہ رگ سے بھی۔“

تو گویا تمام چیزوں سے زیادہ نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے کہ:

”وَنَحنُ أَقرَبُ اِلَیہِ مِنکُم وَلٰکِن لَّا تُبصِرُونَ۔“

(الواقعہ:۸۵)

ترجمہ:... ”...مرنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ... ہم اس کے تم سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم دیکھتے نہیں ہو۔“

یعنی جو ذاتِ عالی ...تمام چیزوں سے... زیادہ تمہارے قریب تر ہے، وہ تمہیں نظر نہیں آتی اور دُور دُور کی چیزیں تمہیں نظر آتی ہیں؟

اللہ کا نزدیک ہونا ہی حجاب ہے:

بعض اکابر نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا سب سے نزدیک ہونا ہی ہمارے لئے

حجاب بن گیا ہے، کیونکہ آنکھ فاصلے سے کسی چیز کو دیکھتی ہے، قریب سے نہیں دیکھ سکتی، اور اللہ تعالیٰ کا بالکل ظاہر ہونا، یہ ہمارے لئے اس کے مشاہدے کی آڑ بن گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ جو نور ہے اور یہ جو روشنی نظر آتی ہے، یہ ہمیں ظلمت کے ذریعے معلوم ہوتی ہے، اگر ظلمت نہ ہوتی اور صرف نور ہی نور ہوتا تو ہم نور کو بھی نہ پہچان سکتے۔ اب تمام چیزوں کا وجود اُس کے سامنے مضمحل ہے، وہ اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس کی کوئی ضد ہی نہیں تو اس کا یہ ظاہر و باہر ہونا ہی ہمارے لئے آڑ بن گیا، ہمیں دُوسری چیزیں تو نظر آتی ہیں لیکن وہ اللہ نظر نہیں آتا، اس کا مشاہدہ ہمیں نہیں ہوتا، کیونکر خیال کیا جاسکتا ہے کہ کوئی شئے اس کے لئے حجاب ہوسکے، حالانکہ اگر وہ نہ ہوتا تو کسی چیز کا وجود نہ ہوتا، اے لوگو! تعجب ہے عدم میں وجود کیونکر ظاہر ہو؟ اور قدیم کے ساتھ حادث کس طرح ثابت رہ سکے؟ تم مانتے ہو کہ تم عدم تھے، عدم سے تم کو وجود ملا، تم بتاؤ کہ عدم اور وجود دونوں جمع ہوسکتے ہیں؟ عدم سے وجود نکل سکتا ہے؟ کیا تمہاری عقل اس کو مانتی ہے؟

عدم کے معنی: کچھ نہیں، اور وجود کے معنی ہیں: کہ چیز موجود ہے۔ تو "نہیں" سے "ہے" کیسے نکل آیا؟ یہ تو حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت تھی کہ اس نے تمہیں عدم سے وجود بخش دیا، لیکن تعجب ہے کہ تمہیں عدم سے نکلا ہوا یہ وجود تو نظر آتا ہے، لیکن وہ ذاتِ عالی جو ہمیشہ سے موجود ہے، وہ تمہیں نظر نہیں آتی اور تمہیں اس کی طرف التفات ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قدیم ہیں:

پھر فرماتے ہیں کہ:

"وہ تو قدیم سے ہے، ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا،
اس کی ذاتِ عالی میں کوئی تغیر ہی نہیں، اور اِدھر یہ جتنی چیزیں ہیں
حتیٰ کہ زمین و آسمان بھی، یہ پہلے نہیں تھے، یہ بعد میں ہوئے۔"

جو پہلے نہیں تھا، بعد میں ہوا، اس کو حادث کہتے ہیں، تو شیخؒ فرماتے ہیں کہ: حادث قدیم کے لئے کیسے آڑ بن سکتا ہے؟ اور قدیم کے ساتھ حادث کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ آڑ بننا تو دوسری چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ حجاب میں نہیں:

حق جل وعلا حجاب میں نہیں، ... رہی یہ بات کہ وہ ہمارے مشاہدے میں کیوں نہیں آتا؟ اس پر فرماتے ہیں: ...تو صرف اپنی نفسانی صفات کی وجہ سے اس کے مشاہدے سے روکا گیا ہے، کیونکہ اگر کوئی شئے اس کے لئے حجاب ہوتی تو اس کو ڈھانپ دیتی، اگر اس کے لئے کوئی ڈھانپنے والی چیز ہوتی تو اس کے وجود کا احاطہ کرتی اور ہر ایک احاطہ کرنے والی شئے غالب ہوتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہیں۔

ذاتِ حق کا مشاہدہ کیوں نہیں ہوتا؟

اب تم کہوگے بھائی یہ باتیں ساری معقول ہیں، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ہمیں مشاہدہ کیوں نہیں ہورہا؟ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ پر ...کوئی... حجاب نہیں، ... ہاں البتہ...تو اپنی نفسانی خواہشات کے حجاب میں ہے۔"

تو نے اپنی نفسانی خواہشوں کو نہیں چھوڑا اور ان کے خول سے نہیں نکلا، ...چونکہ...تو اپنی خواہشات کے خول میں بند ہے اور خواہشات کے خول میں پھنسا ہوا ہے، اس سے نہیں نکلا اور تو نکل بھی کیسے سکتا ہے؟ تیرے ساتھ تو خواہشات لگی ہوئی ہیں، مثلاً: کھانے کا تقاضا ہے، پینے کا تقاضا ہے، حوائجِ ضروریہ کا تقاضا ہے، دُوسرے طبعی تقاضے ہیں اور یہ تیری خواہشات ہیں، پھر ان کے علاوہ انسان کی وہ خواہشات بھی ہیں جن کو نفسانی خواہشات کہتے ہیں، یعنی شریعت ان کو پسند نہیں کرتی، لہٰذا تو

حجاب میں ہے، اللہ تعالیٰ حجاب میں نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ پردے میں نہیں ہیں، البتہ تو پردے میں ہے۔

اللہ تعالیٰ پر حجاب نہیں....:

پھر فرماتے ہیں کہ:

”دیکھو! اگر اللہ تعالیٰ پردے میں ہوتے تو پردہ اس کو ڈھانکنے والا ہوتا، اور جو چیز کسی کو ڈھانکنے والی ہوتی ہے وہ اس کا احاطہ کرتی ہے، وہ اس پر گھیرا ڈالتی ہے، اور جو گھیرا ڈالنے والی چیز ہو، وہ اس پر غالب ہوتی ہے، جس کا گھیرا کیا ہوا ہے، لہٰذا اگر کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے لئے پردہ ہوتی تو اس کو ڈھانکنے والی ہوتی اور اگر ڈھانکنے والی ہوتی، تو اس پر غالب ہوتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہیں، اس پر کوئی غالب نہیں ہے، نورِ عقل اور علم الیقین تجھ کو اس کے قرب کا مشاہدہ کراتا ہے، اور نورِ علم اور عین الیقین اس کے وجود کے سامنے تیرے عدم کا مشاہدہ کراتا ہے، اور نورِ حق اور حق الیقین صرف اس کے وجود کا مشاہدہ کراتا ہے نہ تیرے وجود کا اور نہ تیرے عدم کا۔“

نور کے تین درجے:

دراصل نور تین قسم کے ہیں، ۱:...ایک نورِ عقل ہے، اور علم الیقین کا نور ہے، یہ نور تمہیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں، دُور نہیں، تمہاری عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دُور نہیں ہیں، نزدیک ہیں۔

۲:...دوسرا ہے علم کا نور، اور عین الیقین یعنی جب تمہیں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا صحیح علم ہو اور ادھر اپنی ہستی کا صحیح علم ہو تو یہ مشاہدہ کرواتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے،

مگر اس کے سامنے تیری کوئی ہستی نہیں، جب بھی تمہیں اپنے لئے ہستی اور اپنے لئے وجود اور اس کا احساس ہو کہ میں بھی کچھ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت نورِ علم اور نورِ بصیرت سے ہٹے ہوئے ہوتے ہو، ورنہ تم اپنے لئے کچھ بھی ثابت نہ کرتے۔

۳:... تیسرا نور ہے، نورِ حق اور حق الیقین، یہ نور سب سے اُوپر کی چیز ہے، جو تجھے صرف اللہ تعالیٰ کے وجود کا مشاہدہ کراتا ہے، نہ کہ تیرے اپنے وجود کا، نہ تیرے اپنے عدم کا، کیونکہ تیرا وجود بھی نفی اور تیرا عدم بھی نفی، یعنی اس کی طرف التفات ہی نہیں، یعنی تو اس لائق ہی نہیں کہ تیرے لئے وجود ثابت کیا جائے، جیسا کہ تو اس لائق بھی نہیں کہ تجھ کو عدم کے ساتھ موصوف کیا جائے، صرف ایک ہی ذاتِ عالی ہے اور صرف اس کے وجود ہی کو ثابت کرنا ہے۔

اپنے وجود اور عدم سے نظر کا اُٹھ جانا:

جب آدمی حقیقتِ کبریٰ تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اپنے وجود اور اپنے عدم سے بھی اس کی نظر اُٹھ جاتی ہے، اس لئے کہ عدم نام ہے وجود کے نہ ہونے کا، تو جب وجود کا تصور ہی ختم ہوگیا تو عدم کہاں سے آئے گا؟ اور یہ کمالِ معرفت ہے، اس کے بعد معرفت کا کوئی درجہ نہیں، اللہ اکبر! فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک:

”اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تھا اور کوئی چیز اس کے ساتھ نہیں تھی، وہ اب بھی ہے، ویسا ہی ہے، جیسا کہ تھا۔“

یہ تو حدیث شریف کے الفاظ کا ترجمہ ہے جیسے: ”كَانَ اللهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ كُلُّ شَيْءٍ“، قرآنِ کریم کی آیت ہے:

”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ (الحدید:۳)

ترجمہ:...''وہی اوّل ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔''

اس کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''.... أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ .....''

(تفسیر درمنثور ج:۵ ص:۱۷۱)

ترجمہ:...''آپ اوّل ہیں، آپ سے پہلے کوئی چیز نہیں، آپ آخر ہیں آپ کے بعد کوئی چیز نہیں، آپ ظاہر ہیں کہ آپ سے اُوپر کوئی چیز نہیں ہے، آپ باطن ہیں کہ آپ کے سوا باطن اور کچھ نہیں۔''

حق تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں کامل ہے:

تو حق تعالیٰ شانہٗ اپنی ذات اور اپنی صفاتِ کاملہ کے ساتھ ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہیں گے، اب بھی اسی طرح موجود ہیں، اس کی ذات میں کوئی تغیر نہیں، ہم لوگوں میں تغیر آتا رہتا ہے، کبھی خوشی ہے، کبھی رنج ہے، کبھی تکلیف ہے، کبھی راحت ہے، کبھی صحت ہے، کبھی بیماری ہے، کبھی علم ہے، کبھی جہل ہے، ہماری صفات بدلتی رہتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات بدلتی نہیں، اس کی ہر صفت درجہ کمال میں ہے، اس طرح کہ اس سے بڑھ کر کسی کمال کا تصور ہی نہیں، یہ تو مخلوق کی صفات ہیں کہ آج اس کا علم جتنا ہے، کل کو اس سے زیادہ ہوگیا، پہلے چھوٹا مولوی تھا، اب بڑا مولوی بن گیا، پہلے تھوڑا ماہر تھا، اب زیادہ ماہر ہوگیا۔ انبیاء کا علم تمام اُمتیوں سے بڑھ کر ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام نبیوں سے بڑھ کر ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

”وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔“ (یوسف:۷۶)

ترجمہ:...”ہر علم والے سے اُوپر ایک علم والا ہے۔“

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں کہ پھر اس سے اُوپر کوئی علم والا نہیں ہے، مخلوق کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، پوری کی پوری کائنات، اوّل سے آخر تک ایک ایک ذرّے کا حال ہر وقت اس کو معلوم ہے، اب اضافہ کہاں ہو؟ اضافے کا معنی تو یہ ہے کہ پہلے معلوم نہیں تھا، اب معلوم ہوگیا، تو غرض اللہ تعالیٰ کی ذات میں تغیر و تبدل نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ جتنی ہیں وہ ساری کی ساری اپنی جگہ کامل ترین ہیں کہ اس سے زیادہ کمال ممکن ہی نہیں، اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ اصل میں تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔

لینے والا بدلا ہے نہ کہ دینے والا:

میں نے آپ حضرات کو لطیفہ سنایا تھا، جب حضرت جی مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کا انتقال ہوا اور حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ یعنی دُوسرے حضرت جی، ان کے جانشین ہوئے، تو ہمارے شیخ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نوّر اللہ مرقدہٗ ...جو حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے مرشد و مربی بھی تھے، ان کے چچازاد بھائی بھی، ان کے خسر بھی اور ان کے اُستاذ بھی تھے... چنانچہ وہ ایک دن حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ سے کہنے لگے: مولوی یوسف! ...حضرت شیخؒ اسی طرح ان کو مولوی یوسف کہہ کر بلاتے تھے... چچا جان کی بات اور تھی، تم ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کیا کرو۔ جواب میں حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ فرماتے ہیں کہ: بھائی جی! ...وہ حضرت شیخ کو بھائی جی کہا کرتے تھے، ان کا تکیہ کلام ہی یہ تھا...”لینے والا ہی تو بدلا ہے، دینے والا تو نہیں۔“ اللہ اکبر!

ہمیں لینے کا ڈھنگ نہیں آیا:

حق تعالیٰ شانہٗ اپنے مؤمن بندوں کی نصرت اور مدد فرماتے ہیں، مدد اور نصرت یہ اس کی صفت ہے، نبیوں کے زمانے میں مدد اور نصرت فرماتے تھے، کیا اب نہیں فرماتے؟ نہیں! وہ تو اسی طرح مدد اور نصرت فرماتے ہیں، مؤمن بن جاؤ، وہ تو اسی طرح مدد فرماتے ہیں، ان کی مدد اور نصرت میں کوئی فرق نہیں آیا، تغیر و تبدل تمہارے اندر ہے، اس ذاتِ عالی میں تغیر و تبدل نہیں، لینے کا ڈھنگ ہمیں نہیں آتا، اس کو دینے کا ڈھنگ اب بھی اسی طرح آتا ہے، جس طرح پہلے آتا تھا، وہ ویسے ہی داتا ہے۔اور اس کی ذاتِ عالی ویسے ہی لائقِ اعتماد اور لائقِ توکل ہے، جیسے کہ ہمیشہ سے تھی، چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے:

”قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔“ (آل عمران:۲۶)

ترجمہ:...”جس کو چاہے دے دے جس کو چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذِلت دے، تمام کی تمام بھلائی اس کے ہاتھ میں ہے۔“

خیر و شر اسی کی جانب سے مگر....:

علماء فرماتے ہیں: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف خیر کو ذکر فرمایا ہے، شر کو ذکر کرنا ادب کے خلاف تھا، اس لئے اسے ذکر نہیں کیا، ورنہ خیر ہو یا شر سب اسی کے قبضے میں ہے، کسی کو کوئی خیر نہیں پہنچ سکتی اس ذاتِ عالی کے منشا کے بغیر اور کسی کو کوئی شر نہیں پہنچ سکتا اس ذاتِ عالی کے منشا کے بغیر، لیکن خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی کیونکہ یہ ادب کے

خلاف ہے، جیسا کہ حدیث شریف کی ایک لمبی دُعا کا ایک فقرہ ہے:

"…. وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ فِیْ یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ ….."
(مشکوٰۃ ص:۷۷ بحوالہ صحیح مسلم)

ترجمہ:…"یا اللہ! خیر آپ ہی کے قبضے میں ہے، اور شر آپ کی طرف منسوب نہیں، وہ ہماری طرف منسوب ہے۔"

آپ بُرائی کرتے نہیں لیکن کائنات کی خیر ہو یا شر وہ اسی کے حکم میں ہے، تو حق تعالیٰ شانہٗ اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، ازل سے ہے ابد تک رہے گا، نہ اس کی کوئی ابتدا ہے، نہ اس کی کوئی انتہا ہے، نہ اس کی صفات کی کوئی انتہا ہے، اور نہ مخلوق کے پیمانے کے مطابق ہے، مخلوق بے چاری کیا چیز ہے۔

ذاتِ اِلٰہی ہمارے خیال وتصوّر سے بالا:

اسی لئے اکابر فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ہمارے وہم سے، ہمارے خیال سے، ہمارے تصوّر سے وراء الوراء، وراء الوراء، وراء الوراء ہیں، اگر اس طرح سمجھ لیا گیا تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کو سمجھ لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو کیا سمجھے گا؟ تو کیا اور تیری ہستی کیا؟ کہ تو اللہ تعالیٰ کو سمجھے؟

ابھی میں مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کے پاس گیا تھا، چونکہ بہت دن ہوگئے تھے، ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف تھی، چونکہ ہم لوگوں کا …اللہ تعالیٰ معاف کرے… سارا دن بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے کا کام ہے، تو وہ بے چارے بیٹھنے سے معذور ہوگئے… مگر اَب الحمدللہ صحت مند ہیں- ناقل… میں نے کہا کہ: کیا تکلیف تھی؟ اور حکیم اور ڈاکٹر لوگ کیا بتاتے ہیں؟ کہنے لگے کہ: یہ جو کمر میں مہرے اور کڑیاں ہیں، ان کڑیوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے ایک رابطہ رکھا ہوا ہے، جو ان کو پکڑتا اور آپس میں جوڑ کر رکھتا ہے، ایک طرف اس کو، ایک طرف اس کو،

ان میں سے ایک کڑی کا رابطہ ذرا باہر کو نکل آیا ہے، کہنے لگے: میری بیماری کے سلسلے میں ...ڈاکٹر تو جو کہتے تھے وہ کہتے تھے، مگر میں نے خود بھی اس پر... پڑھنا اور مطالعہ کرنا شروع کردیا، تو جرمنی کا ایک بہت بڑا ڈاکٹر ہے، جس نے صرف اسی کمر کے مہروں پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے، میں اس کتاب کا مطالعہ کرکے حیران ہوگیا کہ یہ عجائباتِ قدرت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ تو صرف ایک عضو ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس قدر عجائباتِ قدرت رکھے ہوئے ہیں، ذرا سوچئے کہ سر سے لے کر پاؤں تک اس انسانی مشین میں کتنے عجائبات رکھے ہوئے ہوں گے؟ کیا ہم سمجھ سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں! اس بات پر تو تمام سائنس دان متفق ہیں کہ عجائباتِ قدرت میں سے تمام مخلوقات کا تو کیا؟ اس کی قدرت کا ایک شمہ بھی ہمیں نصیب نہیں ہوا، یہ ہے اس علیم وخبیر کا تعارف۔

جس سے جدائی ممکن نہیں اس سے بھاگنا:

ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"بڑا سخت تعجب ہے کہ جس سے تو کسی طرح جدا نہیں ہوسکتا، اس سے بھاگتا ہے، اور جس کے ساتھ کسی طرح رہ نہیں سکتا، اس کو طلب کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوسکتے لیکن اللہ تعالیٰ سے بھاگتے ہو، اور یہ باقی جتنی بھی مخلوق ہے جو تمہارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے، اس کے تم طالب ہو۔

"اور اہل محبت ومعرفت کا نہ ان اعمال پر بھروسہ ہے، نہ کسی مباح لذت کے حصول کو مقصد سمجھتے ہیں، عابدین زاہدین مخلوق کے ملنے جلنے اور دُنیا کی مباح لذتوں سے نفرت کرتے ہیں، اس لئے کہ وہ ان کو اپنے مقصد کے اندر مخل جانتے ہیں۔"

عارفین کی نگاہ میں ماسوا اللہ کا مقام:

’’عارف کی نظر میں حق تعالیٰ کی ہستی کے سوا کوئی شئے نہیں رہتی، ماسوا حق تعالیٰ کے سب فانی ہوجاتی ہے، نہ ان کی نظر میں کوئی شئے موجود ہے اور نہ معدوم، ذاتِ واحد کے سوا کسی شئے کا مشاہدہ نہیں کرتے، جو شئے ان کے سامنے ہوگی اس میں حق تعالیٰ شانہٗ اور صفاتِ حق کا جلوہ دیکھیں گے، اس لئے ان کو کسی شئے سے نہ نفرت و وحشت ہے اور نہ کسی شئے سے اُنس و تعلق ہوتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے نفس میں اُنس ومحبت اور نفرت وکراہت نہیں ہوتی، یہ تو محال ہے، اس لئے کہ یہ خلقی اور طبعی امر ہے، بلکہ ان کا اُنس ومحبت اورنفرت وکراہت جملہ صفات للہ، فی اللہ، اورمن اللہ ہوجاتی ہے، ان کے نفس کا کوئی حصہ نہیں رہتا ان کے اندر بخلاف عباد زُہاد کے ان کو محبت و اُنس کسی نیک بندہ یا نیک عمل سے اس لئے ہوگی کہ وہ اس کو اپنے نفس کے لئے نافع اورقربِ اِلٰہی کا ذریعہ جانتے ہیں، اورتنفر و وحشت اس لئے ہوگا کہ وہ اپنے نفس کے لئے اس کو ضرررَساں اور بُعد کا سبب گمان کرتے ہیں، اور عارف کے اندر اپنے نفس کی کوئی مصلحت نہیں ہوتی، نفس کے تمام اغراض وحظوظ اورتعلقات ملیامیٹ ہوجاتے ہیں اورکسی شئے کا وجود ان کی نظر میں نہیں رہتا، اس لئے ان کے نفس میں اپنی ذات کے لئے ان کو کسی شئے سے کوئی تعلق ہے اور نہ کسی شئے سے وحشت ہے، پس ان حضرات کی حالت وہ

ہوتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے:

”مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۴، بحوالہ ابوداؤد)

ترجمہ:... ”جو محبت کرے اللہ تعالیٰ کے واسطے، بغض رکھے اللہ کے واسطے، دے اللہ تعالیٰ کے واسطے، اور روکے اللہ تعالیٰ کے واسطے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کردیا۔“

زاہدِ بلامعرفت کا حال:

پس عابد و زاہد بلامعرفت و محبت، اپنے نفس میں گرفتار ہوتا ہے اور ہر شئے اس کے لئے حجاب ہوتی ہے، اس لئے اس سے متنفر اور متوحش ہوتا ہے، اس کے برعکس عارف کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہوتی جو کچھ ہے، حق ہی حق ہے، اس لئے وہ متنفر نہیں ہوتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو کسی ایسے موجود کے وجود نے، جو واقعی اللہ تعالیٰ کے ساتھ موجود ہو، محجوب نہیں کیا، ہاں البتہ وہمی اور خیالی موجود کے وجود نے تجھ کو اللہ تعالیٰ سے محجوب کیا۔

وہمی و خیالی وجود باعثِ حجاب:

فائدہ:... ذاتِ مقدسہ باری تعالیٰ سے، جو لوگ محجوب اور پردۂ غفلت میں ہیں اور مخلوقات و مصنوعات سے آگے ان کی نظر نہیں بڑھتی اور مشاہدۂ حق سے محروم ہیں تو یہ پردہ اور حجاب کسی موجود واقعی کا نہیں، اس لئے کہ موجودِ حقیقی تو سوائے اس کے کوئی نہیں، سوائے اس کے کوئی بھی نہیں، ہاں! وہمی اور خیالی وجود نے ان کو غفلت میں ڈال رکھا ہے کہ لاشئے اور عدمِ محض کو موجود جان

کر موجودِ حقیقی کے مشاہدے سے غافل ہوگئے ہیں۔

عارف کی نظر میں حق تعالیٰ کی ہستی کے سوا اور صفاتِ اِلٰہی کے آثار کے کوئی شئے موجود نہیں ہے، وہ تمام عالم کو صفاتِ حق کا سایہ اور اثر جانتا ہے، اس لئے یہ عالم اس کی نظرِ بصیرت کے لئے پردہ نہیں، جیسا کہ درختوں کا سایہ دریا پر پڑتا ہے تو وہ کشتی چلنے سے مانع نہیں ہوگا، ہاں! جو کشتی بان وہمی ہو اور درخت کے سائے کو بھی درخت جانے، وہ رُک جائے گا، آگے نہ بڑھے گا، اور سمجھے گا کہ درمیان میں درخت حائل ہے تو کیسے چلوں؟ یا جیسا کسی نے ہوا کا سناٹا سنا اور اس کو سمجھا کہ شیر دھاڑ رہا ہے اور اس خوف کی وجہ سے گھر سے باہر نہ نکلا، تو دیکھئے! اس کو روکنے والی کوئی شئے موجود نہیں، بلکہ موجود شئے کے خیال نے اسے روکا ہے۔

مخلوقات میں اگر جلوۂ حق کی روشنی نہ ہوتی تو کوئی چیز دِکھائی نہ دیتی، اگر اس کی صفاتِ کمال کا ظہور نہ ہوتا تو مخلوقات نیست و نابود ہوجاتیں۔

مخلوق کا نظر آنا وجودِ حق کا پَرتو ہے:

مخلوقات جو تم کو دِکھائی دے رہی ہے، یہ دراصل وجودِ حقیقی کا پرتو ہے، ورنہ اگر ان پر وجودِ اِلٰہی کی تجلی اور انعکاس نہ ہوتا تو دِکھائی نہ دیتی، یعنی موجود ہی نہ ہوتی، اور اگر صفاتِ کمال میں بلاحجاب مخلوقات کے جو فی حد ذاتہٖ عدم ہیں، ظہور تمام ہوتا تو مخلوق بلاحجاب تجلیٔ حق کی تاب نہ لاسکتی، بالکل نیست و نابود

ہوجاتی، چنانچہ کوہِ طور پر تجلی ہوئی تھی تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے، خلاصہ یہ ہے کہ ایک تجلی تو ہے افاضہ عطائے وجود کی، وہ اگر نہ ہوتی تو مخلوقات کا وجود نہ ہوتا اور نہ ان پر نگاہ پڑسکتی، اس لئے عدمِ محض نظر نہیں آیا کرتا تو یہ اسی کی تجلی ہے جو عدمِ محض نظر آتا ہے، اور ان کو موجود کہا جاتا ہے، اور اگر بلاحجاب ان تجلیات کی تجلی ہوتی تو پھر ان مخلوقات یعنی عدمیات کا پتا ہی نہ چلتا، اس لئے کہ حق کے آنے سے باطل اور ہالک کو ٹھہرنے کی تاب نہیں ہے۔‘‘

اس باب میں انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ کی جو انتہائی درجے کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے، اس کا ذکر فرمایا ہے۔

لوگوں کی تین قسمیں:

پہلے فائدے میں بتاتے ہیں کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ۱:...ایک عابد، ۲:...دوسرے زاہد، ۳:...تیسرے عارف۔

عابدین:... وہ لوگ ہیں جو اپنی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے ہوں، اور جو چیز عبادت سے مانع ہے ...ظاہر بات ہے کہ وہ... اس سے بدکیں گے اور اس سے نفرت کریں گے۔

زاہدین:... وہ لوگ کہلاتے ہیں جو تارک الدنیا اور دُنیا سے نفرت کرنے والے ہوں، یعنی دُنیا سے بے رغبتی کرنے والے اور آخرت کی طلب کرنے والے ہوں۔ تو ان زاہدین حضرات کو جو چیز دُنیا کی طرف متوجہ کرے گی اور آخرت سے مانع ہوگی، اس سے نفرت اور وحشت کریں گے۔

عارفین:... اور تیسرے عارفین ہیں، عارفین حضرات کے لئے یہ تمام چیزیں

کالعدم ہیں، ان کی نظریں معرفت میں ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ عالی کے سوا کوئی چیز موجود نہیں اور موجود کہلانے کے لائق ہی نہیں، یعنی موجودِ حقیقی نہیں۔ اس لئے ان کو بالذات کسی چیز سے نہ اُنس اور محبت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز سے نفرت، البتہ جو چیزیں حق تعالیٰ شانہٗ کی معرفت میں مد و معاون بنتی ہوں، وہ ان کے لئے آئینۂ جمالِ یار ہو جاتی ہیں، اور جو چیزیں حق تعالیٰ شانہٗ سے بہکانے والی ہوں، وہ ان سے بدکتے ہیں، تو ان کی معرفت اور ان کی نظر صحیح ہے، بلکہ عابدوں اور زاہدوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

انسان کا خود اپنا وجود کیا چیز ہے؟ بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اشارۂ کن سے پیدا ہوا ہے، وہ نہ ہوتا تو یہ کچھ بھی نہیں ہے، انسان جتنی عبادات بجالاتا ہے وہ بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی عطا ہے، تو ان عارفین کی نظر نہ اپنے اُوپر، نہ اپنی عبادات کے اُوپر، نہ دُنیا کی دوسری چیزوں کے اُوپر، کسی چیز پر بھی ان کی نظر نہیں ہوتی، نہ بالذات کسی چیز سے محبت ہوتی ہے اور نہ بالذات کسی چیز سے نفرت، اگر ان کی محبت ہے تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر ہے، اور اگر ان کی نفرت ہے تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر ہے، حدیث شریف میں اسی کو ذکر فرمایا:

"مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۴، بحوالہ ابوداؤد)

ترجمہ:... "جس نے اللہ کی خاطر محبت کسی سے اور اللہ کی خاطر کسی سے بغض رکھا، اللہ کے لئے کسی کو کچھ دیا اور اللہ کی خاطر کسی کو کچھ دینے سے رُک گیا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔"

یعنی اس حدیث میں چار چیزوں کو ذکر فرمایا، ایک محبت، دوسری بغض، تیسری کسی کو دینا، چوتھی نہ دینا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے کسی سے محبت کی تو صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر، اور کسی سے بغض رکھا تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر، کسی کو کچھ دیا تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر، اور کسی کو نہ دیا تو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر، اس شخص

نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

اس لئے کہ یہ اپنی خواہش اور ارادوں سے نکل گیا، فانی ہوگیا، صرف حق تعالیٰ شانہٗ کی رضا اس کے ساتھ رہے گی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔

ماسوا اللہ کے وجود وہمی ہے:

دوسرے افادے میں فرماتے ہیں کہ کسی چیز نے تمہیں اللہ تعالیٰ سے محجوب نہیں کیا سوائے وہمی چیزوں کے۔ حقیقی چیز تجھے اللہ تعالیٰ سے محجوب کرنے والی نہیں ہے، اس لئے کہ تمام کی تمام چیزیں حق تعالیٰ شانہٗ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئی ہیں، ان کا اپنا مستقل وجود ہی نہیں، اللہ تعالیٰ جب چاہے بنادے، جب چاہے بگاڑ دے۔

اکابر فرماتے ہیں کہ ...یہ جو جہان ہمیں نظر آرہا ہے... اللہ تعالیٰ چاہے تو ایک لمحے کے اندر اس قسم کے سینکڑوں جہان بنادے، اور ایک لمحے اور آنکھ جھپکنے کے اندر برباد کردے، تو یہ جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں یہ موجودِ حقیقی نہیں ہیں، ان پر تو حق تعالیٰ شانہٗ کے وجود کا سایہ پڑا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ان کے وجود کے متعلق ہوئی تو موجود ہوگئیں، تو جس شخص کی نظر اس بات پر ہوگی، اس کی نظر تمام موجودات سے ہٹ کر حق تعالیٰ شانہٗ... جو کہ موجود ہیں... کی طرف پہنچ جائے گی، وہ موجودات کو نہیں دیکھے گا بلکہ موجد کو دیکھے گا، لیکن جس شخص کی نظر موجودات اور مخلوقات میں اٹکی ہوئی ہے، معلوم ہوا کہ وہ وہمی چیزوں میں لگا ہوا ہے، حقیقی وجود تک تو اس کی رسائی نہیں ہے، تو آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ سے حجاب بننے والی چیزیں حقیقی موجودات نہیں ہیں، بلکہ وہمی موجودات ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں ان وہمی موجودات سے اُلجھنے سے بچائے اور ہماری نظر کو بلند کرے کہ ہم حق تعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ عالی کو ہر چیز میں موجود دیکھیں یعنی سب کچھ کو اس کی جانب سے سمجھیں، اس لئے کہتے ہیں کہ: ”وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی“ یعنی اچھی اور بُری تقدیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

خیر و شر اللہ کی جانب سے:

دُنیا میں تمہیں کچھ چیزیں تمہارے نفس کے موافق نظر آتی ہیں، وہ بھی من جانب اللہ ہیں، اور اگر کچھ چیزیں تمہیں تمہارے نفس کے خلاف نظر آتی ہیں وہ بھی من جانب اللہ ہیں، خیر بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے ہے، شر بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے ہے، بغیر مشیتِ اِلٰہی کے نہ خیر کا اپنا وجود ہے، اور نہ شر کا اپنا وجود ہے، جتنی چیزیں تمہیں نظر آرہی ہیں خواہ تمہارے نفس کو مرغوب ہوں یا تمہارے نفس کے خلاف ہوں یہ ساری کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی حکمت سے ہیں، جب اس کی حکمت سے ہیں، تو ان چیزوں کے عطا کرنے میں، جو تمہارے نفس کو مرغوب ہیں اور ان چیزوں کے پیش آنے میں جو تمہارے نفس کو مرغوب نہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، تو عارف کی اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے پیش آرہی ہیں، جبکہ ہم لوگ موجودات میں ہی اٹکے ہوئے ہیں، کسی سے رنج ہورہے ہیں، کسی سے خوش ہو رہے ہیں، کسی سے صلح ہو رہی ہے، کسی سے لڑائی ہو رہی ہے، یہ سب کچھ اپنی خواہش اور اپنے لئے ہو رہا ہے۔ صحت کو ہم پسند کرتے ہیں ...اور بالکل پسند کرنا چاہئے، اور یہ طبعی چیز ہے... لیکن بیماری بھی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، گو ہمیں طبعاً مرغوب نہ ہو، لیکن عقلاً جیسے صحت ہمارے لئے مرغوب ہونی چاہئے ویسے ہی بیماری بھی مرغوب ہونی چاہئے، جو چیزیں ہمارے نفس کے موافق نہیں ہیں ہمیں وہ بھی مرغوب ہوں اور جو چیزیں ہمارے نفس کے موافق ہیں وہ بھی مرغوب ہوں، اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے نفس کے موافق ہیں، بلکہ اس لئے مرغوب ہوں کہ وہ چیزیں من جانب اللہ ہیں۔

دُنیا میں موجود اشیاء کا وجود ذاتِ اِلٰہی کے عکس کا مظہر:

تیسرے افادے میں فرماتے ہیں کہ: یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عجیب حکمت ہے

کہ موجودات کی جتنی بھی چیزیں تمہیں نظر آتی ہیں، جیسے آسمان ہے، زمین ہے، عرش ہے، کرسی ہے، غرض جتنی بھی موجود چیزیں ہیں، خواہ ہمیں نظر آتی ہوں یا نہ نظر آتی ہوں، ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود کا سایہ ڈالا، تو موجود ہوگئیں، اور ان موجودات کے ذریعے سے حق تعالیٰ شانہٗ نے ہمیں اپنی معرفت نصیب فرمائی، اگر یہ موجودات نہ ہوتیں تو ہمیں حق تعالیٰ شانہٗ کی معرفت نصیب نہ ہوتی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان موجودات کو حکم نہ ہوتا تو یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں۔

اگر حق تعالیٰ کی تجلی براہِ راست ہوتی ...

اگر حق تعالیٰ شانہٗ کی تجلی براہِ راست ہوتی، یعنی حق تعالیٰ کی تجلی موجودات کے ذریعے نہ ہوتی تو پھر ہم اس کا تحمل نہ کرسکتے، جس طرح کہ کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی تھی کہ یا اللہ! میں آپ کا دیدار کرنا چاہتا ہوں، مجھے اپنا دیدار کروایئے، تو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے تجلی ہوئی، اور ذرا سی تجلی ہوئی گویا پورا جمال ظاہر نہیں کیا، اپنا پورا جمال ظاہر کرتے تو زمین و آسمان قائم نہ رہتے، ایک کوہِ طور کیا؟ اللہ تعالیٰ کی تجلی کی آسمان و زمین کو بھی تاب نہ ہوتی، یہ برداشت نہ کرسکتے، چنانچہ کوہِ طور پر ذرا سی تجلی ہوئی تو کوہِ طور ریزہ ریزہ ہوگیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے:

”فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔“ (الاعراف:۱۴۳)

ترجمہ:... ”جب اللہ تعالیٰ نے تجلی ڈالی پہاڑ پر، تو اس کو ریزہ ریزہ کردیا، اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے۔“

حق تعالیٰ شانہٗ کی اس ادنیٰ سی تجلی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر برداشت نہیں کرسکے اور پہاڑ برداشت نہیں کرسکے، اگر حق تعالیٰ شانہٗ کی

تجلی براہِ راست ہوا کرتی تو یہاں کس کو تاب تھی؟

حق تعالیٰ کی ذات پر ستر حجاب:

حدیث شریف میں آتا ہے:

”اِنَّ لِلّٰہِ سُبْحَانَہٗ سَبْعِیْنَ حِجَابًا مِّنْ نُّوْرٍ، لَوْ کَشَفَھَا لاحرقت ... وفی روایۃ... دون اللہ سَبْعُوْنَ اَلْف حِجَاب مِّنْ نُّوْرٍ۔“ (اتحاف ج:۲ ص:۷۲)

ترجمہ:...”اللہ تعالیٰ کی ذات پر ستر پردے نور کے ہیں، ...اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے لئے چہرے کا لفظ آیا ہے، یعنی جیسا اللہ کی شان کے لائق ہے...اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک کو اُٹھا دیتے تو ...جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی نظر پہنچتی ہے وہاں تک... ساری مخلوق کو جلا کر خاکستر کردیتے۔ یعنی اگر ستر پردوں میں سے ایک پردہ بھی اُٹھ جاتا تو یہ حال ہوتا۔ ایک روایت میں ستر ہزار پردے آتے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ براہِ راست تجلی کا امکان ہی نہیں ہے، تو یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی حکمت وعنایت ہے کہ عارفین کو اپنی معرفت عطا فرمائی، جو پردوں میں سے چھن چھن کر نصیب ہوئی ہے، براہِ راست تجلی کی کوئی شخص تاب نہیں لاسکتا۔

یہیں سے حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت کا ذرا سا اندازہ ہوسکتا ہے، ورنہ پوری کیفیت تو ہم برداشت ہی نہیں کرسکتے، معلوم ہی نہیں کرسکتے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات کتنی عظیم ہے اور اس کی کتنی عظمت ہے؟ تو فرماتے ہیں کہ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عجیب قدرت ہے کہ اس نے مخلوقات کو پیدا کردیا، اور اپنے وجود کا پرتو اور عکس ڈال دیا، تو مخلوقات موجودات کہلانے لگیں اور موجودات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا

ذریعہ بنادیا، ورنہ اگر براہِ راست حق تعالیٰ شانہٗ کی تجلی ہوتی تو ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کی تاب لاسکتا۔

جنت میں کس کو دِیدار ہوگا؟

یہاں پر یہ بات یادرہنی چاہئے کہ اہلِ حق کا یہ عقیدہ ہے کہ جنت میں حق تعالیٰ شانہٗ کا دیدار ہوگا، تمام اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ شیخ تاج الدین اسکندریؒ نے جن کا یہ رسالہ ہے، ایک جگہ فرمایا ہے اپنی کتاب میں کہ: اللہ تعالیٰ کا دیدار انہی لوگوں کو ہوگا جن کو یہاں حق تعالیٰ کی معرفت حاصل تھی، فی الجملہ معرفت تو سب کو حاصل ہے، تھوڑی بہت معرفت تو ہر مسلمان کو حاصل ہے، بہرحال بقدرِ معرفت اللہ تعالیٰ شانہٗ کا دیدار ہوگا۔ اور اس پر بھی اہلِ حق کا اجماع ہے کہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی کو نہیں ہوسکتا، آخرت میں جب دیدار ہوگا تو اہلِ ایمان حق تعالیٰ شانہٗ کا دیدار کریں گے۔

آخرت میں تجلیٔ اِلٰہی کا تحمل کیونکر؟

سوال یہ ہے کہ جنت میں اس کا تحمل کیسے کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں پر بھی کامل تجلی نہیں ہوگی بلکہ صرف اتنی تجلی ہوگی جو اہلِ جنت کے تحمل اور برداشت کے لائق ہوگی، اس کے باوجود بھی یوں آتا ہے کہ بعض حضرات ایسے ہوں گے جو ایک ہفتے تک بے ہوش و مدہوش رہیں گے، کیونکہ ہفتے کے بعد جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوا کرے گی، اور یوں کہتے ہیں کہ عورتوں کو سال کے بعد عید کے دن زیارت ہوا کرے گی، تو بعض عشاق ایسے ہوں گے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی زیارت کرنے کے بعد وہ اتنے مدہوش ہوجائیں گے کہ ہفتہ بھر اسی مدہوشی میں گزرے گی، ان کی سب سے بڑی لذت ہی حق تعالیٰ شانہٗ کا دیدار ہوگا، یہ نہ کہا جائے کہ باقی لوگوں کے لئے جنت بے کار ہے، جنت ان کے لئے بے کار نہیں ہے، سب سے اعلیٰ

اور نعمت ان کو نصیب ہوگی تو جنت کے اندر بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی تجلی ہر شخص کے تحمل کے بقدر ہوگی ورنہ یہ کہاں ممکن تھا کہ اہلِ جنت حق تعالیٰ شانہٗ کی زیارت کرسکیں؟

اہلِ جنت کے قویٰ مضبوط ہوں گے:

اس کے علاوہ جنتیوں میں اللہ تعالیٰ نے قوّت و طاقت بھی زیادہ رکھی ہے، یہاں کے چالیس پہلوانوں کی طاقت ایک جنتی میں ہوگی، اسی طرح ان کی نظر بھی حق تعالیٰ شانہٗ اتنی ہی قوی کردیں گے، ان کا ادراک بھی اتنا زیادہ مضبوط اور تیز ہوجائے گا لیکن اس کے باوجود اہلِ جنت کو جو زیارت ہوگی حق تعالیٰ شانہٗ کی کامل تجلی نہیں ہوگی، کامل تجلی کا تحمل کسی کے لئے ممکن ہی نہیں، حتیٰ کہ اہلِ جنت کو بھی نہیں ہوسکتی۔

دُنیا کمالاتِ نبوّت کے ظہور کی متحمل نہیں:

ہمارے اکابر تو یوں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذاتِ عالی بہت بلند ہے، یہاں اس دُنیا میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا تحمل بھی نہیں ہوسکتا تھا، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بھی ابھی پورے ظاہر نہیں ہوئے، اس لئے کہ یہ عالم اس کا تحمل نہیں کرسکتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف اور آپ کی عزت و منزلت کا اس عالم میں کسی کو تحمل ہی نہیں تھا، اس کا ظہور اللہ تعالیٰ قیامت میں فرمائیں گے، جنت کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان ظاہر ہوگی اور ان کا مرتبہ ظاہر ہوگا۔

جنتی کی بیوی کی نورانیت:

اس کو ایک مثال سے سمجھئے! وہ یہ کہ جنتی لوگ وہ ہیں جو مؤمن ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہیں اور یہ اہلِ ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کی مٹی کی برکت سے مؤمن بنے ہیں، ان کو جو عورتیں دی

جائیں گی ان کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"....لَوْ اَنَّ اِمْرَأَةً مِّنْ نِّسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ اِطَّلَعَتْ اِلَى الْأَرْضِ لَأَضَاءَتْ مَا بَيْنَهُمَا وَلَمَلَأَتْ مَا بَيْنَهُمَا رِيْحًا، وَلَنَصِيْفُهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔"

(مشکوٰۃ ص:۴۹۵، بحوالہ صحیح بخاری)

ترجمہ:..."اگر جنتی عورت زمین کی طرف جھانک لے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب روشن اور خوشبو سے معطر ہوجائے، اور ان کے سر کی اوڑھنی دُنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔"

اب ذرا غور فرمایئے! کہ جنتی آدمی کو جو بیوی عطا کی گئی، اور اس کو جو دوپٹہ عطا کیا گیا، اس کی روشنی اتنی ہے کہ سورج اس کو برداشت نہیں کرسکتا، اور سورج اس کے سامنے ایسے مدھم ہوجاتا ہے، جیسے سورج کے سامنے چراغ کی روشنی مدھم ہوجاتی ہے، تو خود اس جنت کی عورت کی نورانیت کتنی ہوگی؟ اور جس جنتی کو وہ بیوی عطا کی جائے گی اس کی نورانیت کیسی ہوگی؟ اور جس ذاتِ عالی کے طفیل مؤمن، مؤمن بنا ہے اس کی نورانیت کا کیا عالم ہوگا؟ اس لئے کہتے ہیں کہ دُنیا میں حق تعالیٰ شانہٗ کی براہِ راست تجلی تو کیا ہوتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے کمالات کی بھی تجلی نہ ہوسکی، گویا یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے کمالات ظاہر نہ ہوسکے اور حق تعالیٰ شانہٗ کی پوری تجلی بلکہ کامل تجلی تو اہلِ جنت کو بھی نصیب نہ ہوسکے گی، بقدرِ ظرف کے ہوگی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے، آمین!

اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرنا

دِینی رشتہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی بنا پر جو دوستی ہوگی قیامت تک قائم رہے گی اور اس کے علاوہ باقی تمام رشتے ٹوٹ جائیں گے، اور لوگ ایک دُوسرے کے دُشمن بن جائیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

''تمام رشتے اور تمام نسب قیامت کے دن منقطع ہوجائیں گے، ٹوٹ جائیں گے، مگر میرا رشتہ، میرا نسب منقطع نہیں ہوگا۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

صوفیاء کے اخلاق میں سے ایک چیز ہے آپس میں اُلفت اور محبت کرنا، یہ آپس کی اُلفت اور محبت اسلام کے اخلاق میں سے ہے، اُلفت و محبت کے بہت سارے اسباب ہیں۔

احسان، محبت کا ذریعہ:

اس کا ایک سبب احسان ہے، جب آپ کسی کے ساتھ احسان کریں گے، حسنِ سلوک کریں گے، کسی مشکل وقت میں اس کی اِمداد کریں گے، کسی موقع پر اس کی خیرخواہی سے راہ نمائی کریں گے، تو انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت کرتا ہے، اس سے محبت پیدا ہوگی، اب اگر سب کے سب لوگ ایک دُوسرے کے ساتھ حسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آنے والے ہوں تو لامحالہ سب کے سب ایک دُوسرے کے ساتھ محبت کرنے والے بھی ہوں گے، تو محبت کا ایک سبب ہے احسان، اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان احسان کا بندہ ہے یعنی غلام ہے۔

خونی رشتہ، ذریعۂ اُلفت:

محبت کا ایک سبب ہے خونی رشتہ، باپ کو اپنی اولاد سے اور اولاد کو اپنے ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، بہن بھائیوں کی آپس میں محبت ہوتی ہے، عزیز و اقارب

سے محبت ہوتی ہے، اس کا سبب تو خون کا رشتہ ہے۔

جانوروں کی محبت کا سبب:

خونی رشتے کی محبت انسانوں سے گزر کر حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے، جیسے کہ پہلی قسم کی محبت بھی انسان سے گزر کر حیوان میں پائی جاتی ہے، حیوان کے ساتھ آپ پیار کریں تو وہ آپ کے ساتھ مانوس ہوگا، اور اگر اس کو ماریں تو وہ بھاگے گا، اسی طرح خونی رشتے کی وجہ سے بھی جانور ایک دُوسرے سے پیار کرتے ہیں، حتیٰ کہ بھیڑیا بھی اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے، حالانکہ بھیڑیا تو بھیڑیا ہے۔

بچھو کو ماں سے عداوت!

ہاں! بچھو کو اپنے ماں باپ کے ساتھ محبت نہیں ہے۔
شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ:

میں نے سنا ہے کہ بچھوؤں کی پیدائش معروف طریقے سے نہیں ہوتی، جیسا کہ بچے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ بچھو کے بچے جب ماں کے پیٹ میں پیدا ہوتے ہیں تو اس کے پیٹ کو کاٹ کر باہر نکل آتے ہیں اور ماں مرجاتی ہے۔ (حیوۃ الحیوان ج:۲ ص:۷۹۴، طبع: ادارۂ اسلامیات لاہور) شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ: میں نے یہ سن کر کہا کہ چونکہ بچپن میں ماں کے ساتھ ''حسنِ سلوک'' کیا تھا، اس لئے ''تواضع'' بھی خوب ہوتی ہے، الحمدللہ جہاں کہیں بچھو نظر آیا، اسے مارنے کے لئے آپ نے جوتا اُٹھایا۔

جانوروں سے بدتر:

میں نے کہا کہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ اور والدین اپنی اولاد کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور یہ محبت انسانوں سے گزر کر حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے،

لیکن بعض شکلیں ایسی بھی ہیں کہ اولاد کو ماں باپ سے شکایت ہے اور ماں باپ کو اولاد سے شکایت ہے، محبت کی جگہ بغض و عداوت ہے، ایسی مثالیں بہت کم ہیں، لیکن بہرحال ہیں، باپ اور بیٹے کی لڑائی ہے، ماں اور بیٹی کی لڑائی ہے، اور وہ لڑائی کبھی کبھی مقدمہ بازی پر ختم ہوتی ہے، ایک دُوسرے پر تہمت تراشی تک پہنچتی ہے، اس قسم کے لوگوں کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ بے چارے حدِ انسانیت کیا، حدِ حیوانیت سے بھی گزر گئے، حیوانات کی حد سے یہ آگے گزر گئے ہیں۔ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ:

"أُولٓئِکَ کَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ" (الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ:... "یہ لوگ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔"

اللہ تعالیٰ کی بات تو ٹھیک ہی ہوگی، یہ ان لوگوں پر صادق آتی ہے، ان کے معاملات کی کھوج کرید کیجئے تو کبھی تو قصور ایک فریق کا ہوتا ہے، لیکن اکثر اور بیشتر تھوڑا تھوڑا قصور دونوں کا ہوتا ہے، اگر اس قصور کی تھوڑی سی اصلاح کرلی جائے تو معاملہ ٹھیک ہوسکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے یہ بتایا تھا کہ جب دو آدمی لڑ رہے ہوں تو شیطان ہر ایک آدمی کو کہتا ہے کہ تم صحیح راستے پر ہو، دُوسرا غلط راستے پر ہے۔ اس لئے ان میں سے کوئی اپنے موقف سے ہٹنے اور واپسی کے لئے تیار نہیں ہوسکتا، جوڑ ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

تمام قرابتوں کی مدار:

غرضیکہ دونوں میں محبت کا خونی رشتہ ہے اور اس کی بنیاد والدین ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے والدین کا، اس کے بعد قرابت والوں کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

’’وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی۔‘‘ (النساء:۳۶)

ترجمہ:... ’’اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور قربت والوں کے ساتھ۔‘‘

آپ غور کریں گے تو تمام قربتیں والدین سے ہی نکلتی ہیں، سوائے رشتۂ مصاہرت کے۔ جتنا بھی زیادہ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تمام قرابتیں والدین ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔

مذہب ومسلک، اُلفت کا سبب:

اُلفت کا تیسرا سبب ہے: نظریہ، مسلک اور مذہب کا اتحاد۔ دو آدمیوں کا نظریہ ملتا ہے، ان کی آپس میں محبت ہے، یہ جتنی بھی پارٹیاں ہیں، جماعتیں ہیں، مذہبی ہوں یا سیاسی ہوں، ان کے اَخلاف کا جو ایک دُوسرے سے جوڑ ہوتا ہے، تعلق ہوتا ہے، یہ نظریہ کے اتحاد کی بنا پر ہی ہوتا ہے، پھر اگر وہ مسلک صحیح ہے تو رشتۂ اُلفت قیامت تک قائم رہے گا، اور اگر مسلک صحیح نہیں تو رشتۂ اُلفت بھی ناپائیدار ہوگا، اسی لئے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے:

’’اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ۔‘‘ (الزخرف:۶۷)

ترجمہ:... ’’تمام کے تمام دوست قیامت کے دن ایک دُوسرے کے دُشمن بن جائیں گے سوائے متقی لوگوں کے۔‘‘

تو دِینی رشتہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی بنا پر جو دوستی ہوگی قیامت تک قائم رہے گی اور اس کے علاوہ باقی تمام رشتے ٹوٹ جائیں گے، اور لوگ ایک دُوسرے

کے دُشمن بن جائیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ:

"....کُلُّ سَبَبٍ وَّنَسَبٍ یَّنْقَطِعُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلَّا سَبَبِیْ وَنَسَبِیْ۔" (مجمع الزوائد ج:۴ ص:۲۷۱)

ترجمہ:... "تمام رشتے اور تمام نسب قیامت کے دن منقطع ہوجائیں گے، ٹوٹ جائیں گے، مگر میرا رشتہ، میرا نسب منقطع نہیں ہوگا۔"

یعنی اس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے، اپنے باپ سے، اپنی ماں سے، اور اپنی بیوی سے، اولاد اپنی ماں سے فریاد کرے گی کہ ہمیں نیکیوں کی ضرورت ہے، آپ دُنیا میں ہمارا بڑا خیال رکھتی تھیں، ایک نیکی دے دیجئے! وہ کہے گی کہ: میں نے تو نکاح ہی نہیں کیا، میری کوئی اولاد نہیں ہے! باپ بیٹے کا انکار کردے گا اور بیٹا باپ کا انکار کردے گا اور کہے گا کہ میرا تو باپ ہی نہیں ہے، باپ کہے گا کہ: میں تیرا باپ ہوں، بیٹا کہے گا کہ: مجھے تو نیکیوں کی ضرورت ہے، باپ کہے گا کہ: میں تو تیرا باپ نہیں ہوں۔ ایسا نفسانفسی کا عالم ہوگا، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں کہ تمام رشتے چھوٹ جائیں گے، کوئی کسی کا رشتہ باقی نہیں، نہ یہ پارٹیوں کے رشتے باقی رہیں گے، نہ اور کوئی رشتہ باقی رہے گا، نہ دُنیا کے اور کوئی تعلقات اور رشتے باقی رہیں گے، ہاں! متقی لوگ آپس میں ایک دُوسرے کے دوست ہوں گے، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: قیامت کے دن سب رشتے منقطع ہوجائیں گے مگر میرا رشتہ اور میرا نسب باقی رہے گا، یہ منقطع نہیں ہوگا۔

اللہ سے محبت، اُلفت کا سبب:

محبت اور اُلفت کا آخری سبب ہے اللہ تعالیٰ کی خاطر کسی سے اُلفت و محبت کرنا۔ درمیان میں کوئی رشتہ نہیں ہے، درمیان میں کوئی ذاتی غرض نہیں، درمیان میں

کوئی تعلق نہیں ہے، محض اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کی خاطر ایک دُوسرے سے محبت ہے، یہ محبت جو ہے یہ پائیدار محبت ہے، اہلِ ایمان میں یہی محبت ہونی چاہئے، یعنی محض اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت۔ ایک حدیث میں ہے:

''عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: مَرَّ رَجُلٌ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهٗ نَاسٌ فَقَالَ رَجُلٌ مِّمَّنْ عِنْدَهٗ: اِنِّیْ لَأُحِبُّ هٰذَا لِلّٰهِ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَعْلَمْتَهٗ؟ قَالَ: لَا! قَالَ: قُمْ اِلَیْهِ فَأَعْلِمْهُ، فَقَامَ اِلَیْهِ فَأَعْلَمَهٗ فَقَالَ: أَحَبَّکَ الَّذِیْ أَحْبَبْتَنِیْ لَهٗ، قَالَ: ثُمَّ رَجَعَ فَسَأَلَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهٗ بِمَا قَالَ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَکَ مَا احْتَسَبْتَ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۲۶، بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ:... ''حضرت انسؓ سے روایت ہے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزر رہے تھے جبکہ دُوسرے صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے، بیٹھنے والے صحابہؓ میں سے ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ: یا رسول اللہ! یہ جو آدمی جارہا ہے مجھے اس سے محبت ہے! ...صحابہؓ کی محبت تو اللہ تعالیٰ کے ہوتی تھی، تو وہ صحابی کہنے لگے کہ مجھے اس سے محبت ہے... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے اس کو بتا بھی دیا کہ مجھے تجھ سے محبت ہے؟ کہنے لگا: نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ! بتا کر آؤ! وہ اُٹھا، اور جاکر کہا کہ: میں تم سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرتا ہوں، اس کے جواب میں وہ صاحب کہنے لگے: اللہ تعالیٰ

تم سے محبت فرمائیں جیسا کہ تم اس کی خاطر مجھ سے محبت رکھتے ہو، یہ سن کر وہ واپس آئے اور آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، اور انہوں نے جو جواب دیا وہ بھی بتادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تو نے محبت کی اور تو نے ثواب بھی کمالیا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ جب تم سے کوئی کہے کہ: ’’مجھے تم سے محبت ہے‘‘ تو اس کا جواب دو: ’’اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں، جیسے تم اللہ تعالیٰ کی خاطر مجھ سے محبت کرتے ہو۔‘‘

للّٰہی محبت کے فضائل:

تو یہ رشتۂ اُلفت ومحبت ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اُمتیوں کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں، قرآنِ کریم میں بھی اور احادیث وفقہ میں بھی اس محبت کے بڑے فضائل بیان کئے گئے ہیں، قرآنِ کریم میں ہے:

’’اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔‘‘ (مریم:۹۶)

ترجمہ:... ’’بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عملِ صالح کیا، اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کردیتے ہیں۔‘‘

رحمٰن اپنی خاص رحمت کے ساتھ، اس پر اپنی رحمت کی تجلی ڈالے گا اور اس کے نتیجے میں اہلِ ایمان کے دِلوں میں اس کی محبت قائم فرمائیں گے۔

قیامت کی ہولناکیاں:

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگ بے چارے پریشان ہوں

گے، ...قیامت تو قیامت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کی ہولنا کیوں سے اپنی پناہ میں رکھے، ...قیامت کا نام تو سنا ہے، لیکن قیامت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا یہاں کوئی تصوّر بھی نہیں کرسکتا، قرآنِ کریم میں ہے:

”یٰـٓأَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ۔ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ۔“ (الحج:۱، ۲)

ترجمہ:...”اے لوگو! ڈرو اپنے رَبّ سے، بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے، جس دن تم اس زلزلے کو دیکھوگے ...قیامت کو دیکھوگے... ہر دُودھ پلانے والی اپنے بچے کو بھول جائے گی ...جو ماں اپنے بچے کو چھاتی سے لگا کر دُودھ پلاتی ہے اس سے پوچھو کہ اسے اپنے بچے کے ساتھ کتنی محبت ہوتی ہے، اپنے دُودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی... اور شدت اور ہول کی وجہ سے حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے، تم لوگوں کو دیکھوگے بے ہوش ہو رہے ہیں، ...حالانکہ وہ... مدہوش نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔“

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے قیامت کے ہول سے پناہ میں رکھے، رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان کو آدمی پڑھ بھی نہیں سکتا، ہر آدمی اپنے پسینے میں ڈُوبا ہوا ہوگا، پانی کہاں سے لائے گا۔ لوگ اس دن اس طرح ہوں گے جس طرح پروانے ہوتے ہیں، یعنی جس طرح پروانے گڈمڈ ہوتے ہیں کہ کوئی اِدھر کو بھاگ رہا ہوتا ہے، کوئی اُدھر کو بھاگ رہا ہوتا ہے، تو لوگ اس طرح ہوں گے کہ اپنی ذات اور عمل کے سوا ان کو کچھ بھی سجھائی نہیں دے گا، اور نامعلوم کتنے

مراحل سے گزرنا ہوگا اور کتنے حالات سے گزرنا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، ہر آدمی اپنے پسینے میں ڈُوبا ہوا ہے، فرمایا گیا ہے کہ کسی کا پسینہ ٹخنے تک ہوگا، کسی کا پنڈلی تک ہوگا، کسی کا گھٹنے تک ہوگا، کسی کا کمر تک ہوگا، اور بعض کا پسینہ منہ سے اُوپر تک پہنچا ہوا ہوگا، اپنے اپنے پسینے میں ڈُوبے ہوئے ہوں گے، حالات کی شدت اور انجام کا خوف، قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

”وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡاٰزِفَةِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَى الۡحَنَاجِرِ كٰظِمِيۡنَ، مَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ حَمِيۡمٍ وَّلَا شَفِيۡعٍ يُّطَاعُ۔ يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ۔“ (المؤمن:۱۸، ۱۹)

ترجمہ:... ”اور خبر سنادے ان کو اس نزدیک آنے والے ڈَر کی، جس وقت دِل پہنچیں گے گلوں کو تو وہ دبا رہے ہوں گے، کوئی گنہگاروں کا دوست اور نہ سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے، وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ اور جو کچھ چھپا ہوا ہے سینوں میں۔“

یعنی نظریں پھٹی ہوئی ہوں گی، آنکھ جھپکنا چاہتے ہوں گے، مگر جھپکی نہیں جائیں گی، اور دِل اُڑ رہے ہوں گے، یہ ہے قیامت کے دن کی شدّت، لیکن فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوں گے جو اس دن ہولناک شدّت اور اسی دِل دہلادینے والے ماحول میں بھی ٹھاٹھ سے عرشِ اِلٰہی کے سائے میں، منبروں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوں گے، ان کو کوئی خوف، کوئی غم اور کوئی پریشانی نہ ہوگی، لوگ پوچھیں گے: یہ کون ہیں؟ کہا جائے گا کہ: اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دُوسرے سے محبت رکھنے والے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اَلَآ اِنَّ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۔“ (یونس:۶۲)

ترجمہ:... ’’سنو اللہ تعالیٰ کے ولی ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔‘‘

یہ ہیں اللہ کے ولی جو صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت رکھتے تھے، جن کی محبت اور دوستی کا پیمانہ صرف ذاتِ عالی ہے، کسی سے محبت رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خاطر، اور بغض رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خاطر۔ ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

’’عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللهَ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ؟ اَلْيَوْمَ اُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔‘‘

(مسلم ج:۲ ص:۳۱۷)

یعنی قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا جس کو سب اوّلین اور آخرین سنیں گے، وہ لوگ کہاں ہیں جو ایک دُوسرے سے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرتے تھے؟ اس اعلان کو سن کر کچھ لوگ کھڑے ہوجائیں گے، ان کو فرمایا جائے گا کہ: چلو جنت میں۔

اور دُوسرے لوگوں کا حساب و کتاب شروع کردیا جائے گا، یہ لوگ بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے، نہ ان کا کوئی پاسپورٹ کسی نے چیک کیا اور نہ کسی نے ان کا نامۂ عمل دیکھا، اس لئے کہ ان کے نامۂ عمل پر محبت نامے کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر فضیلت اور برکت کی چیز اور کیا ہوسکتی ہے؟ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کرنا کہ تمام رشتوں سے قطع نظر، تمام مادّی مفادات سے قطع نظر، برادری اور پارٹی سے قطع نظر، کسی بندے سے محض اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت کی جائے، افسوس کہ یہ چیز ہم خود ہی نہیں پیدا کرنا چاہتے ورنہ مؤمن تو سراپا اُلفت ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

’’اَلْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَلَا خَيْرَ فِیْ مَنْ لَّا يَاْلَفُ وَلَا

یُؤْلَفُ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۲۵ بحوالہ مسند احمد، بیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ:... "مؤمن سراپا اُلفت ہوتا ہے، اور اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو نہ اُلفت کرے اور نہ اس سے اُلفت کی جائے۔"

یعنی مؤمن تو سراپا اُلفت ہوتا ہے کہ اس میں سر سے لے کر پاؤں تک اُلفت ہی اُلفت ہوتی ہے، بقول کسی کے: میں تو اپنے دِل کے سوٹکڑوں کا بیوپاری ہوں، دِل تو محبت کی جگہ ہے، مگر یہ کہ میں تو محبت کا بیوپاری ہوں، مؤمن تو قائم محبت سے ہے، اُس کی دُکان سے محبت کا سودا ملتا ہے، تو مؤمن کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سراپا اُلفت ہو اور جو کسی سے اُلفت نہیں کرتا تو اس سے کوئی اُلفت نہیں کرتا، کسی کے ساتھ اُلفت نہیں جوڑ سکتا تو اس کے ساتھ بھی کوئی اُلفت نہیں جوڑتا، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں کوئی خیر نہیں۔ تو ایک تو اہلِ ایمان میں محبت ہونی چاہئے اور دُوسری یہ کہ محبت ذاتی اغراض اور معاشی رشتوں کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی یاد کے لئے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ گھر کا مالک گھر میں ہو:

دور باش افکار باطل، دور باش اغیارِ دل
سج رہا ہے شاہِ خوباں کے لئے دربارِ دل

یہ دِل کا دربار تو شاہِ خوباں کے لئے ہے، باطل افکار اور دِل کے اغیار سب دُور ہوں۔

"سج رہا ہے شاہِ خوباں کے لئے دربار دِل" یہ گھر ہے یہ گھر، اسی کو کہا کہ:

دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است
کہ از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دِل کو قبضے میں لاؤ اس لئے کہ یہ حجِ اکبر ہے اور ہزار کعبے سے ایک دِل بہتر ہے۔

کعبہ بھی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، قریشِ مکہ نے کعبے میں بت رکھے ہوئے تھے اور ہم نے اس کعبے میں بت رکھے ہوئے ہیں، نہ معلوم کہاں کہاں کے بت رکھے ہوئے ہیں، صاف کرو ان کو، نکالو ان بتوں کو، اس گھر کو پاک اور صاف کرو، قرآن کریم میں ہے:

”وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔“ (الحج:۲۶)

ترجمہ:...”اور جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کا ٹھکانا بتایا کہ میرے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا، میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں کے لئے، قیام کرنے والوں کے لئے اور رُکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔“

وہ ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا گھر ہے اللہ کے حکم سے، اور فرمایا اس کو صاف رکھنا، اس کو خراب نہ کرنا اس کو میں نے کہا کہ مالک گھر میں ہو، محبتِ اِلٰہی کا تسلط ہو دِل پر، تو پھر اس محبت کی شعاعیں پھوٹیں گی اور دُوسروں تک پہنچیں گی، اور اگر یہ دِل خود بھی ویرانہ ہو تو ہر آدمی جانتا ہے کہ ویرانے میں اُلّو رہا کرتے ہیں۔ اور ویرانے میں اُلّو رہا کرتے ہیں، اور اے کاش! ہمارے دِل بھی آباد ہوجائیں، ہمارے دِل آباد ہوگئے اور یہ ویرانۂ دِل آباد ہوجائے، یہ ویران نہ رہے، تو اُس اللہ تعالیٰ کی محبت سے شعاعیں پھوٹیں گی وہ اہلِ ایمان پر پڑیں گی تو اہلِ ایمان کی آپس میں برکت پیدا ہوگی اور آپس میں اُلفت پیدا ہوگی۔

عبدیتِ کاملہ کی ضرورت

بزرگ فرماتے ہیں کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہونا چاہیئے جیسا شیرخوار بچہ اپنی ماں کے سامنے ہوتا ہے، جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے اللہ تعالیٰ کے سامنے رو پڑے اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے شیرخوار بچہ نہیں بن سکتے تو پھر ہاتھ دھولو پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت تم پر کیسے ہوگی؟ پھر تم کیا توقع رکھتے ہو؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

یہ کہہ رہا تھا کہ ہم بہت اُونچے سے نیچے گرے ہیں، اور گرتے ہی چلے جارہے ہیں، جوں جوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے دُوری ہو رہی ہے ہر سال رنگ پھیکا نظر آرہا ہے، یہی تمہاری مسجد ہے، ابھی مجھے اس مسجد میں آئے ہوئے کوئی بارہ یا تیرہ سال ہوگئے ہیں، اس وقت کے معتکفین کوئی دس بارہ آدمی ہوتے تھے، اور سب معتکف اسی محلے کے ہوتے تھے، لیکن رات کو مسجد ایسی چیختی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ! رونے کی آوازوں سے، چلّاتے تھے۔ ہمارے میر صاحب یہاں موجود ہیں وہ اس بات کے گواہ ہیں۔ یہ علماء نہیں تھے، فضلاء نہیں تھے، کوئی عالم فاضل نہیں تھے، کوئی درویش نہیں تھے، یہی بے چارے محلے والے تھے، حاجی بدیع الزمان صاحب ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے، اور ان کے رُفقاء ہوتے تھے، یہی کوئی دس بارہ آدمی ہوتے تھے، باقاعدہ پردے لٹکتے تھے معتکف پردے لگا کر باقاعدہ بیٹھا کرتے تھے، مسجد میں چلّانے کی آوازیں آیا کرتی تھیں، رونے کی آوازیں آیا کرتی تھیں، چیخیں نکلتی تھیں، چیخنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں، اور خاص طور پر صبح کے وقت، سحری کے وقت جو آوازیں آتی تھیں، وہ دِلوں کو مسحور کردیتی تھیں، خدا جانے اب کیا ہوگیا ہے؟

اب ہم حج پر جاتے ہیں، پورے سفر میں کوئی لبیک کی آواز نہیں آتی، بس بھری ہوئی ہے لیکن لوگ گپیں ہانک رہے ہیں، شور وغل ہے، یہ ہے وہ ہے وغیرہ،

میں سن ۱۹۶۸ء میں پہلی دفعہ حج پر گیا تھا، عرفات کے میدان میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت برپا ہے، عرفات کے میدان میں حاجیوں کو روتے دیکھا، رو رو کر ان کی آنکھیں پک گئی تھیں، اور اَب وہی عرفات ہے، کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ حج میں ہم بھی پھیرا لگاتے ہیں لیکن کوئی پتا بھی نہیں، حاجیوں کو سب سے پہلی فکر برف کی ہوتی ہے، ٹھنڈے پانی کی ہوتی ہے، کھانے کی ہوتی ہے، کہیں سے لسّی مل جائے، ہر چیز میں تغیر آگیا ہے، عقل حیران ہے کہ اس دُنیا کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ سارا مضمون تو یوں ہی بیچ میں آگیا، مجھے تو آپ حضرات سے یہ کہنا تھا کہ بھائی! ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، اعتکاف کا حق ہم سے ادا نہیں ہوا، تو بھائی! اس پر اِستغفار کرو، اور ہم کیا کرسکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے کہ یا اللہ! ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، بیچ میں رنگ پھیکا ہونے کی بات آگئی تو یہ مضمون زیادہ پھیل گیا اور ابھی زیادہ پھیل سکتا ہے، اس مضمون کو اور کتنا پھیلاؤں؟

ہمارے اسلاف جیسے تھے افسوس! کہ اب اس کا کوئی نمونہ بھی نظر نہیں آرہا، اب ہماری ظاہری شکلیں بھی اپنے بزرگوں جیسی نہیں رہیں، ہر چیز میں تغیر آگیا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس حالت پر رحم فرمائے، اب بھائی! ایک دو باتیں اور سن لو!

معتکفین سے معذرت خواہی:

میں نے معذرت تو آپ حضرات سے پہلے کی، تعلیم کا وقت ہوتا تھا تو ہم آپ لوگوں کو ستاتے تھے، آپ لوگ سو رہے ہوتے تھے، آپ کو جگاتے تھے کہ بھائی! تعلیم کے لئے اُٹھو! پھر بھی جمع ہونے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا، حالانکہ اوقات مقرّر ہیں، وقت مقرّر ہے کہ فلاں وقت پر یہ کام کرنا ہے، آپ کو نیت کرکے، ارادہ کرکے لیٹنا چاہئے کہ بھئی فلاں وقت پر اس عمل میں مشغول ہونا ہے، جو کوئی فرصت کا لمحہ مل جائے اس میں آپ آرام بھی کرلیں، میں تو خود بھی کہا کرتا ہوں کہ آرام کرلو تاکہ بیمار نہ پڑجاؤ۔

میں پہلے ہمیشہ دوستوں سے یہی کہا کرتا تھا کہ آرام کرو، خوب آرام کرو، تم تلاوت سے تھک گئے، ذکر سے تھک گئے، آرام کرلو، لیکن اب میں کہتا ہوں کہ میرا بھائی! اگر آرام ہی کرنا تھا تو یہاں تشریف کیوں لائے تھے؟ تو خیر ہم نے آپ لوگوں کو ستایا، اس دفعہ ہم نے تھوڑا نظام سخت کردیا تھا تاکہ آپ لوگ فائدہ اُٹھائیں، جو نئے لوگ ہیں وہ فائدہ اُٹھالیں، میرے دوستوں نے اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے کچھ سیکھنے سکھانے کا عمل بھی کیا، فضائل کی تعلیم بھی ہوتی رہی۔

یہ ماحول گھر میں نہیں ملے گا:

اب میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ کیوں بھائی! سب چیزیں یہاں ہی چھوڑ کر چلے جاؤ گے یا کچھ ساتھ بھی لے کر جاؤ گے؟ سوچ لو! میں آپ سے کیا سوال کر رہا ہوں ایک نورانی ماحول میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں جمع ہونے کا موقع دیا، مسجد کا یہ ماحول آپ کو دوبارہ نہیں ملے گا، میں جانتا ہوں، میں اِعتکاف سے اُٹھ کر اپنے گھر چلا جاؤں گا، مسجد کے ساتھ ہی تو میرا گھر ہے، لیکن مسجد کے نورانی ماحول کی کیفیت اور میرے گھر کے ماحول کی کیفیت ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق مجھے نظر آئے گا، تلاوت کی آواز میرے گھر میں سنی جاتی ہے، بیان اور تقریر میرے گھر میں سنائی دیتا ہے، اَذان وہاں سنائی دیتی ہے، مسجد کی روشنی الحمدللہ! میرے گھر میں بہت پہنچتی ہے، اس لئے میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں ہی جنت دے دی ہے، یہ جو مسجد کے متصل مکان ہے، میں تو اس کو جنت کہتا ہوں، اور واقعی مجھے جنت کا مزہ آتا ہے، لیکن مسجد والی کیفیت اور یہاں کے انوار و برکات ظاہر ہے کہ میرے گھر میں نہیں ہوں گے، اور خاص طور پر یہ ذکر کا، تلاوت کا، تعلیم کا، سیکھنے سکھانے کا یہ نورانی ماحول میں کہاں سے لاؤں گا؟ اتنے اہل ایمان ایک جگہ جمع ہوئے، اپنے گھر میں یہ ماحول کہاں سے لاؤں؟

یہ رنگ ساتھ لے جاؤ:

یہ تو میں جانتا ہوں کہ یہاں سے اُٹھ کر جب اپنے گھروں کو جائیں گے تو یہاں کا دوبارہ ماحول تو آپ کو میسر نہیں آئے گا، بالکل نہیں آئے گا، لیکن اس کے باوجود یہاں سے جو کچھ آپ سمیٹ کر کے لے جائیں گے، اپنے پاس محفوظ بھی رکھیں گے یا یہیں چھوڑ کر جائیں گے؟ میرا مطالبہ یہ ہے بھائی! کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

”صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔“

یہ اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے رنگنے میں کون اچھا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ سے اچھا کون رنگ سکتا ہے؟ کپڑے کا رنگ اگر پھیکا ہوا تو پانی میں کپڑا ڈالنے سے رنگ دُھل جاتا ہے، کپڑا ویسے کا ویسا نکل آتا ہے اور اگر رنگ پکا ہو تو کپڑا چاہے بھٹی میں بھی ڈالو رنگ نہیں اُترے گا۔

اِعتکاف کا رنگ لیا بھی ہے؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ حضرات یہاں سے جو رنگ لے کر کے جائیں گے پہلے تو یہ سوچو کہ کچھ رنگ لیا بھی ہے یا کہ نہیں؟ اپنا جائزہ لو، اس مسجد کے نورانی ماحول کا کوئی رنگ بھی ہم نے اخذ کیا ہے کہ نہیں؟ اگر کوئی نہیں اخذ کیا تو پھر بالکل ہماری ایسی مثال ہے جیسے پتھر پر موسلا دھار بارش ہوئی اور بارش بند ہوئی اس کے بعد ہوا چلی تو وہ پتھر سوکھے کا سوکھا۔ خدا نہ کرے کہ ہمارے قلوب بھی ایسے ہی ہوں، اللہ کرے کہ ہمارے دِلوں نے اس رنگ کو لیا ہو۔

اِعتکاف کے رنگ کو محفوظ رکھو:

دُوسری بات یہ کہ اگر رنگ لیا ہے تو رنگ کچا لیا ہے یا پکا؟ اور پکا ہے تو کتنا

پکا لیا؟ یہاں سے آپ حضرات اِعتکاف سے، مسجد کے ماحول سے اپنے گھروں کو تشریف لے جائیں گے، بیوی بچوں میں مشغول ہوں گے، کاروبار میں مشغول ہوجائیں گے، ہر ایک کے اپنے اپنے جو دھندے ہیں ان میں لگیں گے لیکن آپ کے پاس یہ رنگ محفوظ رہنا چاہئے، اتنی جلدی یہ رنگ اُتر نہ جائے، میں عرض کرتا ہوں کہ کم سے کم اتنا تو رہے کہ ایک سال تک یہ رنگ چل جائے، اگلے سال اِن شاء اللہ پھر رنگ لیں گے، نئے سرے سے رنگ لیں گے، اپنی ان تمام تر کمزوریوں کے باوجود جو میں نے ابھی ذکر کی ہیں، یہ مسجد کے ماحول کا رنگ بسا غنیمت ہے، یہ رنگ اللہ تعالیٰ کی نعمتِ کبریٰ ہے، اس رنگ کو محفوظ رکھو اور وہ رنگ کیا ہے؟ تعلق مع اللہ کا رنگ، ایمان اور یقین کا رنگ۔

دس دن تک اللہ کے در پر دستک دی تو....:

میں تو اسی کی بات کر رہا ہوں، یہاں آپ کسی کے دروازے پر آکر بیٹھے تھے، دس دن تک آپ نے اس کا کنڈا کھٹکایا، دس دن تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، اپنے آپ سے پوچھو، کچھ دروازہ کھلا بھی یا نہیں کھلا؟ جس مالک کا دس دن تک کنڈا کھٹکھٹایا آج کل تو بیل (Bell) بجاتے ہیں، اب ہمیں کنڈا کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں، دس دن تک اس کے دروازے کی گھنٹی بجاتے رہے، دروازہ کھلا یا نہیں کھلا؟ اور اگر کھلا تو کچھ ملا بھی یا نہیں ملا؟ اور ملا تو ساتھ بھی لے جانے کے لئے ملا یا یہیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ یہ چیز ہمارے لئے توجہ طلب ہے۔ اللہ کرے اس کریم آقا نے ہم سب کے لئے دروازہ کھول دیا ہو۔

یہاں سے سب کو ملتا ہے:

اس کریم آقا کے جود وکرم کی بارش ہر ایک پر ہوتی ہے، اس کے یہاں تو کتے بھی کھاتے ہیں، ہم تو پھر بھی انسان ہیں، وہ تو کتوں کو بھی روٹی دیتا ہے، کون مانگنے والا ایسا ہے، جو اس کے در سے خالی ہاتھ گیا ہو؟ کون مانگنے والا ایسا ہے جس کو

اس دروازے سے بھیک نہ ملی ہو؟ اور کون ایسا ہے جو اس دروازے سے خالی گیا ہو، اور کسی دُوسرے دروازے سے اس کو بھیک مل گئی ہو؟ اللہ کرے اس کریم آقا نے ہم سب کے لئے دروازہ کھول دیا ہو، اور دروازے میں داخل فرمالیا ہو، ہم سب کو اپنے دروازے میں داخل فرمالیا ہو، اس کریم آقا کا بلاوا آیا کہ آجاؤ میرے گھر میں آجاؤ، ہم اس کے گھر میں جمع ہوئے، تھوڑا بہت اس کریم داتا کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، اگرچہ ہماری توجہ بہت ہی کمزور تھی، توجہ پوری نہیں تھی کہ تجھے راضی کرکے اُٹھنا ہے۔

کریم آقا کو منانے آئے تھے:

میں نے حدیث سنائی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: یا اللہ! تجھ کو منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہوجائے، اور آپ کا شکر ادا کرنا ہے جب آپ راضی ہوجائیں۔ جب تک راضی نہ ہوں، آپ کو منانا ہے، دامن پکڑ لو، چھوڑیں گے نہیں، لپٹیں گے، لپٹ کر مانگیں گے، جتنی بھی گریہ زاری ہوسکتی ہے کریں گے، تجھ کو منانے کی کوشش کریں گے، تجھ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے، اور جب تو ہم سے راضی ہوجائے گا تو تیرا شکر بجالائیں گے اور تیری حمد کریں گے۔

ہم سب اس کریم آقا کی بارگاہ میں جمع ہیں، دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بھی دروازہ کھول دیا ہو، آگے چل کے پتا چلے گا کہ کس کے لئے دروازہ کھولا ہے؟ اور پھر اس کریم آقا کی جانب سے تحائف تقسیم ہوتے ہیں، خدا جانے کس کس کو کیا کیا عنایت ہوا، کیا کیا مرحمت فرمایا گیا؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَجْوَدَ النَّاسِ وَکَانَ أَجْوَدُ مَا یَکُوْنُ فِیْ رَمَضَانَ حِیْنَ یَلْقَاہُ

جِبْرِيْلُ .... فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَلَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْوَدُ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ۔" (صحیح بخاری ج:۱ ص:۳)

ترجمہ:... "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں سے زیادہ سخی تھے، اور سب سے زیادہ سخاوت کا عالم آپ کا رمضان المبارک کے مہینے میں ہوتا تھا، جبکہ جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ کریم کا دور کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیز ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے۔"

بھائی! قرآنِ کریم کا دَور جانتے ہو؟ اب تو حافظوں نے دَور بھی چھوڑ دیا، دَور اس کو کہتے ہیں کہ ایک حافظ ایک رُکوع پڑھتا ہے، دُوسرا سنتا ہے، پھر دُوسرا اسی رُکوع کو پڑھتا ہے تو پہلے والا اس کو سنتا ہے، یہ دَور مسنون ہے، رمضان المبارک میں خاص طور پر یہ دَور ہونا چاہئے، چاہے کوئی کتنا پکا حافظ ہی کیوں نہ ہو اس کو دَور کرنا چاہئے۔

بھلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پکا حافظ کون ہوگا؟ اور حضرت جبریل علیہ السلام سے پکا حافظ کون ہوگا؟ لیکن حضرت جبریل علیہ السلام آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دَور کرتے تھے۔ اِدھر جبریل علیہ السلام کی صحبت میسر اُدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سراپا مَلکیت، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور جود و کرم کا ایسا طوفان آتا تھا کہ تیز ہوا سے بھی زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت ہوجاتی تھی، رمضان المبارک کے مہینے میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔

اللہ کی سخاوت کا حال:

یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے مالک کی سخاوت کا کیا عالم ہوگا؟ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی خالق، جبریل علیہ السلام کے بھی خالق، وہ خالق ہیں، یہ مخلوق ہیں، وہ مالک ہیں، یہ مملوک ہیں، وہ داتا ہیں یہ اس کے دروازے کے فقیر ہیں، جب اللہ تعالیٰ کے فقیروں کا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا یہ عالم ہے تو اللہ تعالیٰ کا کیا عالم ہوگا؟ تو رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی سخاوت اور اللہ تعالیٰ کا جود وکرم بے پایاں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جود وکرم کی کوئی انتہا نہیں، اور خاص طور پر آخری عشرے میں اور خاص طور پر معتکفین کے لئے جو اللہ تعالیٰ کا دروازہ مل کے اور پکڑ کر بیٹھے ہیں، ان کے ساتھ جود وکرم کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟ اس کی کیفیت کون بیان کرسکتا ہے؟ دُعا کرو، اگرچہ ہم نے اپنی نالائقی کی وجہ سے اس کی قدر نہیں پہچانی، مگر وہ کریم آقا ہمارے لئے بھی دروازہ کھول دے، اور اپنے جود وکرم کے جو تحائف وہ اپنے نیک بندوں میں تقسیم فرمائیں گے ان میں سے کچھ ہمیں بھی عطا فرمادیں۔

عبدیت عطائے اِلٰہی کی قیمت:

کس کس کو کیا کیا تحفہ ملا؟ کون اس دَر سے کیا کیا سوغات لے کر کے گیا؟ کس کو کیا کیا دولت عطا فرمائی گئی؟ بس وہی بہتر جانتا ہے!

لیکن ایک بات ہے، وہ کریم آقا مفت نہیں دیتے، قیمت وصول کرتے ہیں، تم چاہتے ہو کہ مفت ہی لے جائیں، نہیں! قیمت ادا کرنی پڑے گی، قیمت کیا ہے؟ قیمت عبدیت ہے جیسے بندگی بجالاؤ گے، جیسی نیازمندی اختیار کروگے اور جیسا اپنا فقر، اپنا فاقہ، اپنا محتاج ہونا، اپنا نیست ہونا، لاشیٔ محض ہونا اللہ تعالیٰ کے سامنے ظاہر کروگے، اتنا ہی تمھیں تحائف عطا فرمائے جائیں گے، تم بھی متکبر بنو اور اللہ تعالیٰ بھی ہوں، یہ دونوں باتیں نہیں چلتیں۔

اللہ کی ہستی کے سامنے ہماری ہستی!

شیخ سعدیؒ ایک تمثیل بیان کرتے ہیں کہ بارش ہو رہی تھی، بارش کا ایک

قطرہ ٹپکتا ہوا آیا اور وہ سوچ رہا تھا کہ میں جاکر کے دُنیا میں سیلاب برپا کردوں گا، اتفاق سے وہ قطرہ دریا میں گرا، شیخ سعدیؒ کے الفاظ ہیں کہ قطرے نے جب دریا کو دیکھا تو اپنے دِل میں شرمندہ ہوا اور کہنے لگا کہ: اگر یہ دریا ہے تو پھر واقعی یہ بات سچ ہے کہ دریا کے مقابلے میں قطرے کی کچھ قیمت نہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ کی ہستی موجود ہے اور اللہ کی وہ ہستی ہے کہ پوری کائنات اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، تو پھر میری اور آپ کی ہستی کی کیا حیثیت ہے؟ یہ جو ''میں'' ہمارے اندر گھسی ہوئی ہے، یہ تو خدائی کا دعویٰ ہے۔

یہ میں کا دعویٰ کیونکر ہو؟ ہماری حیثیت کیا ہے؟ ملاحظہ ہو: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دن خطبہ دے رہے تھے، فرمانے لگے:

''خُلِقَ مِنْ مَّجْرَى الْبَوْلِ مَرَّتَيْنِ فَيَذْكُرُ حَتّٰى يَتَقَذَّرَ اَحَدُنَا نَفْسَهُ۔'' (کنز العمال ج:۳ ص:۸۸۸۱)

یعنی ان لوگوں کو شرم آنی چاہئے جو دو دفعہ پیشاب کی نالی سے گزرے ہیں، اور اپنے وجود کا اور اپنی ہستی کا دعویٰ کرتے ہیں کہ میں بھی کچھ ہوں، دو دفعہ پیشاب کی نالی سے گزرنے کا معنی یہ ہے کہ ایک دفعہ باپ کی پیشاب نالی سے اور ایک دفعہ ماں کی پیشاب کی نالی سے۔

جتنا اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی نیستی اور اپنا کالعدم ہونا لاؤ گے اتنا تحائف لے کر جاؤ گے، یہاں تمہاری شکلوں کو نہیں دیکھتے کہ برخوردار کتنے حسین ہیں؟ تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتے کہ سیٹھ صاحب کتنی فیکٹریوں کے مالک ہیں؟ تمہاری جوانی اور رعنائی کو نہیں دیکھتے کہ کتنے بڑے گامے پہلوان ہیں؟ وہاں تو صرف ایک چیز چلتی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی ہستی کو کتنا مٹا کر کے آئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحائف تقسیم ہوں گے۔

عطائے اِلٰہی پیمانوں سے بالاتر:

وہ عطا فرمائیں گے اور جب وہ عطا فرمانے پر آتے ہیں تو مخلوق کا کوئی پیمانہ کام نہیں دیتا، مخلوق کے پیمانوں سے بالاتر عطا فرماتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ خود فرماتے ہیں:

"أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔"

(مشکوٰۃ ص:۴۹۵)

ترجمہ:... "میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں اور کبھی کسی دِل میں خیال نہیں آیا۔"

ساری مخلوق مل کر ایک تصوّر باندھے، اللہ تعالیٰ ان کے تصوّر سے بھی ماورا عطا فرمائیں گے، اپنے بندوں کو تحائف عطا فرمائیں گے اور ایسے عطا فرمائیں گے جو آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں گے، لیکن جتنی قیمت دوگے اتنا سودا لے کر جاؤگے، اور قیمت اس بارگاہِ عالی میں صرف ایک ہے اور وہ ہے عبدیت، اس لئے کہ عبدیت اس کے پاس نہیں ہے، وہ ہمارے پاس ہے۔

بارگاہِ اِلٰہی میں عبدیت کا تحفہ:

ایک بزرگ کا شعر ہے! اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوکے کہتے ہیں کہ: اے بادشاہ! حضور کی بارگاہ میں تحفہ پیش کرنے کے لئے ایسی چار چیزیں لایا ہوں جو آپ کے ہاں نہیں ملتیں، ہمارے ہاں ملتی ہیں، کیونکہ یہ جنس ہمارے ہاں ہوتی ہے آپ کے ہاں نہیں ہوتی، وہ بزرگ فرماتے ہیں: آپ کے خزانے میں نہیں ہے، آپ کا خزانہ ان سے خالی ہے، اور آپ کے دیس میں یہ دولت نہیں ہے، یہ دولت فقیروں کے پاس ہے اور ہمارے یہاں ہے، لیجئے آپ کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ وہ

چار چیزیں یہ ہیں: ۱:...عاجزی لے کر آیا ہوں، ۲:...بے کسی لے کر آیا ہوں، ۳:...عذر لے کر آیا ہوں، ۴:...اور گناہ لے کر آیا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جہاں کسی کا کوئی اختیار نہیں، سارا معاملہ اس کے قبضے میں ہے، اپنے قبضے میں کچھ بھی نہیں ہے، وہاں عاجزی چلتی ہے، تو میں عرض کر رہا ہوں کہ جتنی بندگی لے کر آؤ گے اس بارگاہِ عالی میں اتنے ہی نوازے جاؤ گے، یا یوں کہو کہ جتنا بندگی کا دامن پھیلاؤ گے اتنا ہی تحائف سے بھر کر لے جاؤ گے، اپنی ہستی کو ختم کرو، میں بھی کچھ ہوں، سبحان اللہ! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ! تم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا کچھ ہونا بتاتے ہو کہ میں بھی کچھ ہوں، معاملہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، نہ بھائی نہ! مخلوق کے سامنے تو ڈینگیں مار سکتے ہو، میں بھی پھنے خان ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا کہو گے؟ اپنے کو مٹادو، اپنے ارادوں کو فنا کردو، اپنے علم کو ہیچ سمجھو، اپنی عقل کو ہیچ سمجھو، غرضیکہ اپنے وجود پر لکیر کھینچ دو، یہ عبدیت کا معاملہ ہے، جتنا اپنے آپ کو مٹاؤ گے۔

اللہ کے سامنے شیرخوار بچے بنو:

بقول ایک بزرگ کے بندے کو اللہ کے سامنے کیسا ہونا چاہئے؟ فرمایا کہ: ایسا ہونا چاہئے جیسا کہ شیرخوار بچہ ماں کے سامنے ہوتا ہے، وہ غریب کوئی ہنر نہیں جانتا، نہ اس کو کھانے کا ڈھنگ آتا ہے، نہ موتنے کا ڈھنگ آتا ہے، اس کو سارے کاروبار کے لئے ایک چیز دے دی گئی ہے اور وہ ہے رونا! بھوک لگے تب روتا ہے، پیاس لگے تب روتا ہے، درد ہو تب روتا ہے، جگہ گیلی ہوگئی ہو تب روتا ہے، سردی لگے تب روتا ہے، گرمی لگے تب روتا ہے، غرضیکہ سوائے رونے کے اس کے پاس اور کوئی ہتھیار ہے ہی نہیں، اور وہ جب روتا ہے تو اس کی ماں سمجھ جاتی ہے کہ بچے کو فلاں چیز کی ضرورت ہے۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسا

شیرخوار بچہ اپنی ماں کے سامنے ہوتا ہے، جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے اللہ تعالیٰ کے سامنے رو پڑے اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے شیرخوار بچہ نہیں بن سکتے تو پھر ہاتھ دھولو پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت تم پر کیسے ہوگی؟ پھر تم کیا توقع رکھتے ہو؟

مردہ بدست زندہ بنو:

دُوسرے بزرگ نے فرمایا کہ: نہیں بھائی! اس سے بھی اُوپر کی بات ہے، اور وہ یہ ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسے مردہ بدست زندہ ہوتا ہے، غسل دینے والا اِدھر کو لٹادے، اُدھر کو لٹادے، کان میں پانی ڈال دے، منہ میں پانی ڈال دے، جو چاہے کرے وہ بے چارا کوئی شکایت نہیں کرتا، اس کو تختے پر لٹادے، زمین پر لٹادے، چارپائی پر لٹادے، اپنے آپ کو مردہ بدست زندہ بنالو، یعنی اپنے ارادے سے، اپنے اختیار سے، اپنی عقل سے، اپنی شکل سے، اپنے ہنر سے، دست بردار ہوکر جاؤ، یوں سمجھو کہ ہم تو مردہ محض ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ جس طرح چاہیں تصرف فرمائیں، یہ ہے عبدیت اور بندگی کی وہ دولت جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہے، یہ چیز اس کے پاس نہیں ہے، وہ تم سے اس کا تحفہ وصول کرے گا اور اس کے بدلے میں تمہیں کیا کیا دے گا؟ اس کا پتا وہاں جاکر چلے گا، جب تحفے ملیں گے اِن شاء اللہ!

اپنے دِل کو اللہ کی طرف متوجہ کردو:

ہمارے شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ: اب مجاہدات کا وقت نہیں رہا، ہم سے کیا مجاہدے ہوں گے؟ پہلے زمانے میں اللہ تعالیٰ کے بندے بڑے بڑے مجاہدے کرتے تھے، ہم سے کچھ بھی نہیں ہوتا، ذرا تھوڑا سا پڑھنے بیٹھے، سر چکرانے لگتا ہے، قویٰ کمزور ہوگئے، نیند کا غلبہ ہوجاتا ہے، نیند پوری نہ ہو تو ویسے ہی دِماغ خراب ہونے لگتا ہے، تو ہم سے مجاہدے نہیں ہوتے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ اس کے بجائے ایسا

کرو کہ اپنے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کردو، اس پر تو کوئی قیمت خرچ نہیں ہوتی، بھائی کوئی محنت نہیں آتی، کوئی زور نہیں لگتا، اپنے دِل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کردو، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کردو اس طرح کردو کہ گویا تم نے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں اور بے دست و پا بیٹھے ہوئے ہو۔

ذاتِ اِلٰہی کے قدموں میں گر جاؤ:

قصہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مکتب میں لے جایا گیا تاکہ ان کو کچھ لکھنا پڑھنا سکھائیں، اب کس کو کیا معلوم تھا کہ یہ نبی ہیں، حالانکہ شروع میں ... پیدا ہونے کے بعد... جب والدہ قوم کے سامنے لے کر آئیں تھیں اسی وقت اعلان کردیا تھا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے، اُستاد نے امتحان لینے کے لئے پوچھا تاکہ معلوم ہو کہ بچہ کتنا ذہین ہے کہ: برخوردار! یہ بتاؤ کہ یہ آسمان و زمین اگر کمان ہوں اور حوادث و مصائب تیر ہوں اور اللہ تعالیٰ نشانہ باندھ کر چلانے والے ہوں تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ آسمان کی کمان سے اللہ تعالیٰ حوادث اور مصائب و آفات کے تیر برسا رہے ہیں، تو بچنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے برجستہ جواب دیا، سوچا نہیں، نبی سوچ کے نہیں جواب دیا کرتے، یہ بھی ایک مضمون ہے، اللہ کرے کبھی موقع ملے، میں اس کو بیان کروں۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے خصائص کیا ہیں، نبی سوچ کر جواب نہیں دیا کرتے، برجستہ جواب دیتے ہیں، ان پر اِلقاء کیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام معصوم بچے تھے، ابھی نوعمر چھوٹی عمر کے تھے، لیکن برجستہ جواب دیا کہ: تیر انداز کے تیر دُور گرا کرتے ہیں، اس کے قدموں میں نہیں گرا کرتے، جو شکل آپ نے بتائی ہے کہ آسمان و زمین کمان ہوں اور حوادث تیر ہوں، اللہ تعالیٰ تیروں کو چلانے والے ہوں تو ان سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کے قدموں میں جا گرو، بچ جاؤ گے۔ یہ وہی بات

ہے جو میں کہہ رہا ہوں یعنی حوادث سے اس وقت بچ سکتے ہو جبکہ مالک کے قدموں میں جا گرو گے، بس یہی عبدیت ہے، یہ عبدیت جتنی کامل لے کر جاؤ گے اور قلب کو جتنا متوجہ الی اللہ کرو گے، ما سوا سے جتنا منقطع کرو گے، اتنا ہی حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے نوازے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نواز دے۔

کشکولِ گدائی لے کر جاؤ:

آج اِستغفار کی رات ہے، ہم سے جو کوتاہیاں، لغزشیں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، جیسا ہمیں کرنا چاہئے تھا ویسا ہم نہیں کر پائے، اور شاید ہم میں اِستعداد بھی نہیں، لیکن اس کے باوجود کشکولِ گدائی لے کر اس کی بارگاہ میں ہم بھی حاضر ہوگئے اور وہ کریم آقا یہ نہیں دیکھتا کہ یہ فقیر کتنا زیادہ خوب صورت ہے، بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ فقیر کتنا ہے، محتاج کتنا ہے، ہم بھی کشکولِ گدائی لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوچکے ہیں، اللہ تعالیٰ سے مانگو اور یہ دُعا کرو کہ یا اللہ! ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمادے، عبادات میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں، قرآنِ کریم سننے سنانے میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں، نمازوں میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں اور مسجد کے آداب میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں اور روزہ نماز میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں اور حقوقِ شرعیہ میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں، دِین کے سمجھنے میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں اور اس کی بارگاہِ عالی کا ادب بجا لانے میں جتنی کوتاہیاں ہوئیں، اپنے کرم سے معاف فرمادے، اپنی رحمت سے ہمیں معاف فرمادے، آمین!

تعلق مع اللہ اور تصوف

نفس کی تین قسمیں ہیں، نفسِ لوّامہ: بُرائی کا حکم کرنے والا، پھر جب اس کو مہذّب کیا جائے تو رفتہ رفتہ اس کی عادت یہ ہوجاتی ہے کہ یہ بُرائی کی طرف جائے تو اس کو ملامت ہوتی ہے کہ میں نے اچھا نہیں کیا، اور اس کے تدارک کی فکر ہوتی ہے، اس کو نفسِ لوّامہ کہتے ہیں، آخر میں پھر اس کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر خواہ وہ تشریعی ہو یا تکوینی اطمینان ہوجاتا ہے۔ مالک نے جو حکم دیا ٹھیک ہے، اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں، تو نفسِ لوّامہ کو نفسِ مطمئنہ بنانے کے لئے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، محنت کرنی پڑتی ہے، بس اسی کا نام مجاہدہ ہے، اور یہی چیز اللہ والوں سے سیکھی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

عرض کیا گیا کہ جبلت تو کسی طرح بدل نہیں سکتی، پھر جبلی صفاتِ رذیلہ کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے اور کیونکر اِختیار میں آسکتی ہے؟ فرمایا: تعجب ہے کہ آپ کو شبہات ابھی تک ہیں، یہ تو فرمایئے کہ مادّہ جبلی ہوتا ہے یا فعل جبلی ہوتا ہے؟ یہ تو مانا کہ مادّہ اختیار میں نہیں، مگر فعل تو اختیار میں ہے، فعل تو جبلی نہیں، صفاتِ رذیلہ کا مادّہ بے شک زائل نہیں ہوتا مگر ان کے مقتضا پر عمل کرنا یا نہ کرنا یہ تو اختیار میں ہے، اور اسی کا انسان مکلّف ہے، اور بار بار اس مقتضا کی مخالفت کرنے سے مادّہ بھی ضعیف ہوجاتا ہے۔

کام کی باتیں:

پھر فرمایا کہ: یہ بڑی کام کی باتیں ہیں، اور دراصل تعلیم کے لائق یہی باتیں ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ آج کل ان باتوں کا کہیں تذکرہ نہیں، نہ علماء کے ہاں، نہ مشائخ کے ہاں، تصوف کو ایک کھیل بنا رکھا ہے، اسی وجہ سے مدت سے اس کی حقیقت مستور چلی آتی ہے، مگر الحمدللہ! اس وقت ایسا وضوح ہوگیا کہ کسی قسم کا کوئی اخفا اور التباس اس میں نہیں رہا۔

مجھے تو الحمدللہ کسی مسئلۂ تصوف میں شبہ نہیں ہوتا، نہ طالب کی کسی حالت

معلوم کرنے میں، نہ اس کی اصلاح کی تجاویز تجویز کرنے میں، خواہ کسی کی کتنی ہی اُلجھی ہوئی حالت کیوں نہ ہو، میں خیرخواہی سے عرض کرتا ہوں کہ اس عضو کو اس زمانے میں غنیمت سمجھ کر اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اس سے منتفع ہونا چاہیے۔

اختیار سے کام لو:

گفتگو حضرت اس میں فرما رہے تھے کہ وہ تمام کام جن کے کرنے اور جن کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہ سب انسان کے اختیار میں ہیں، اپنے اختیار سے کام لے کر، کرنے کے کاموں کو کرے اور چھوڑنے کے کاموں کو چھوڑے بس یہ تصوف کا خلاصہ ہے۔

جبل گردد، جبلت نہ گردد:

اس پر کسی نے اِشکال کیا ہے کہ اخلاقِ رذیلہ یہ تو جبلی ہوتے ہیں، آدمی کی فطرت میں رکھے جاتے ہیں، اب جبلت کی اصلاح کیسے ہو؟ جو چیز کسی کی فطرت میں رکھی گئی ہے، انسان اس کو کیسے بدلے؟ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

”.... اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَّكَانِهٖ فَصَدِّقُوْهُ، وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ يَصِيْرُ اِلٰى مَا جُبِلَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۲، بحوالہ مسند احمد)

ترجمہ:... ”تم جب یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کرتے ہوئے مان لو کہ یہ بات ہوسکتی ہے، اور اگر تمہیں کوئی شخص کہے کہ فلاں آدمی نے اپنی جبلت چھوڑ دی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو، کیونکہ جبلت نہیں بدلتی، یعنی فطری اخلاق جو آدمی کے اندر رکھے گئے ہیں، یہ نہیں بدلتے۔“

اور انہیں اخلاق پر آدمی کی قیمت لگتی ہے، کسی کو اللہ تعالیٰ بلند اخلاق سے نوازتے ہیں، اور کوئی بے چارا ہمارے جیسا ہوتا ہے۔

انبیائے کرام علیہ السلام کے اخلاقِ عالیہ:

ہم سب یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو اعلیٰ ترین کمالات پر پیدا کیا جاتا ہے، اور وہ کمالات ان کی فطرت میں رکھے جاتے ہیں، کسی نبی کی موجودگی میں اس وقت کی پوری دُنیا میں کوئی آدمی اس سے زیادہ عالی اخلاق نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے پیمانے سے ان کی پیمائش کرتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کیسا ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اخلاق:

شیخ الاسلام حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی وفات پر مولانا سیّدعلی ندوی نے ایک مضمون لکھا تھا جو ان کی کتاب ''پُرانے چراغ'' میں موجود ہے، اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت اتنے اُونچے آدمی تھے کہ لوگوں کا فہم ان تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا، لوگ ان کی اپنے پیمانے سے پیمائش کرتے تھے، لیکن ان کے اخلاق کا پیمانہ اتنا اُونچا تھا کہ کسی کی عقل میں نہیں آسکتا تھا۔ پھر مولانا نے اس سلسلے کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''۱۹۴۶ء کے الیکشن میں ہمارے علاقے لکھنؤ میں حضرتؒ کا پروگرام رکھا ہوا تھا، اور مجھے کچھ بزرگوں نے حضرتؒ کا خادم بنادیا کہ حضرتؒ کو اس علاقے میں دورہ کرانا ہے اور مجھے حکم دیا گیا کہ آٹھ دن حضرتؒ کے ساتھ رہو، ایک دن جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے ہم ایک مسجد میں چلے گئے، وہاں کے جو اِمام صاحب تھے وہ لیگیوں کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اس نے حضرتؒ کو دیکھا تو پہچان لیا اور پھر حضرتؒ کو، حضرتؒ کے اساتذہ کو اور اکابر کو جو اس نے سنائی ہیں، اللہ تعالیٰ معاف

فرمائے، اپنی پوری تقریر میں جو کچھ اس سے کہا جاسکتا تھا اس نے کہا، خیر اس کے بعد نماز ہوئی اور نماز سے فراغت کے بعد ہم چلے آئے۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں کہ: میں حضرت کے ساتھ آٹھ دن تک رہا، لیکن کسی بھی دن، کسی بھی نجی محفل میں حضرت نے اس خطیب کا تذکرہ نہیں کیا، ایسا لگا جیسے کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔“

اتنا اُونچا اخلاق کس کا ہوسکتا ہے؟ حضرتؒ کی سوانح عمری ”چراغ محمدؐ“ کے نام سے چھپ چکی ہے، حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی نام ”چراغ محمدؐ“ ہے، قصہ بہت لمبا ہے۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ اپنے دوست کی عیادت کے لئے سلہٹ کے علاقے میں گئے ہوئے تھے، یہ کوئی سیاسی دورہ نہیں تھا بلکہ ذاتی اور ایک نجی دورہ تھا۔ لیگیوں کو پتا چل گیا، مسلم لیگیوں کے نزدیک اکابر کی توہین کرنا سب سے بڑا کمال تھا، یہی پاکستان بن رہا تھا، حضرت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، اور پھر انہوں نے حضرتؒ کی توہین اور تذلیل کی، آپؒ کی ٹوپی اور پگڑی کو حضرتؒ کے سر سے اُتار کر پاؤں کے نیچے روندا، داڑھی نوچی۔ خیر خدا کرکے ان سے نجات ملی، حضرتؒ کے دوست احباب حضرتؒ کی مجلس میں آگئے تو انہوں نے کہا: حضرت! ان کے لئے بددُعا کریں۔ حضرتؒ نے فرمایا: میں بددُعا کیسے کرسکتا ہوں، میری کیا پوزیشن ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی ایذائیں دی گئیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددُعا نہیں دی، تو میں بددُعا دینے والا کون ہوتا ہوں؟ دوستوں نے بہت اصرار کیا لیکن حضرتؒ نے فرمایا: میں نے سب کو معاف کردیا، یہ بے چارے جانتے نہیں، انہوں نے جو کچھ کیا ناواقفی میں کیا۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو اِنتقام لیا اس کی تفصیل بڑی دردناک ہے۔

یہ ہیں اخلاقِ عالیہ اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ اُمتی کا کردار ہے،

انبیائے کرام علیہم السلام کا کیا حال ہوگا؟ وہ کتنے اُونچے اخلاق اور کردار والے ہوں گے۔

اخلاق پر اِنسان کی قیمت:

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ انہی اخلاق پر انسان کی قیمت لگتی ہے، اور اسی لئے حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ نکاح کرو تو کسی خاندانی عورت سے کرو، اس لئے کہ ماں کے اخلاق کے اثرات بچوں پر پڑتے ہیں، ماں جس اخلاق اور جس کردار کی ہوگی، جتنے اُونچے خیالات اور جتنے اُونچے ذہن کی مالک ہوگی، اس کی اولاد بھی اسی کے مطابق ہوگی، آخر اسی زمین سے فصل تیار ہوگی، تو جس طرح یہ اخلاقِ حمیدہ، اخلاقِ فاضلہ یہ فطری اور جبلی ہیں، اسی طرح گھٹیا اخلاق، حسد ہے، کینہ ہے، چھچھوراپن ہے اور دُوسری چیزیں ہیں یہ بھی فطری اور جبلی ہیں۔

عبدالقیسؓ کی دو خصلتیں:

میں نے عبدالقیس کا قصہ سنایا تھا جبکہ عبدالقیس کا وفد مدینہ منوّرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، چونکہ یہ لوگ بہت دُور سے آئے تھے، بحرین سے دُور کا سفر کرکے آئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا اشتیاق تھا، مسجد کے سامنے اُونٹ بٹھائے، سواریوں سے اُتر کر بے تابی کی حالت میں سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، ان کے رئیس جن کو اشج عبدالقیس کہا جاتا تھا، ''اشج'' اس کو کہتے ہیں جس کے ماتھے پر زخم کا نشان ہو، انہیں بھی کسی لڑائی میں زخم لگ گیا ہوگا، جس کی بنا پر ان کا یہ نام پڑ گیا۔ انہوں نے تمام رُفقاء کے اُونٹ بٹھائے، سواریوں سے ان کا بوجھ اُتارا، سارا سامان سلیقے سے رکھا، پھر اُونٹوں کے پاؤں باندھے، اس کے بعد اپنے سامانِ سفر میں سے نیا جوڑا نکالا، غسل کیا اور نیا جوڑا پہن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بہت تپاک سے ملے، اور فرمایا:

’’اِنَّ فِیکَ لَخَصلَتَینِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ: اَلحِلُمُ وَالْاِنَائَۃُ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۴۲۹، بحوالہ صحیح مسلم)

ترجمہ:...’’تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں، ایک حلم اور دُوسرا بُردباری۔‘‘

تسلی کے ساتھ کام کرنا، جلدبازی سے کام نہ لینا، انہوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! یہ دو خصلتیں میرے اندر فطری ہیں یا میں نے محنت کے ساتھ کمائی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فطری ہیں۔ اشج قیس کہنے لگے: اس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے دو اعلیٰ اخلاق پر پیدا کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہیں۔

تمام اخلاق فطری ہیں:

غرضیکہ تمام اخلاق فطری ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

’’اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ۔‘‘

(مشکوٰۃ ص:۳۲، بحوالہ صحیح مسلم)

یعنی جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں، کسی کان سے بہت عمدہ سونا نکلتا ہے، کسی سے گھٹیا، کسی سے بہت عمدہ چاندی نکلتی ہے، کسی سے ہلکی قیمت کی نکلتی ہے۔ تمہاری زبان میں جسے ’’کوالٹی‘‘ کہتے ہیں، اسی طرح انسانوں کی بھی کانیں ہیں، کسی خاندان سے اُونچے قسم کے آدمی پیدا ہوتے ہیں، اور کسی خاندان سے نیچی سطح کے پیدا ہوتے ہیں۔

فطری مادّے کی نہیں اعمال کی اصلاح:

سوال یہ تھا کہ جب اخلاق فطری ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان میں پیدا کردیئے ہیں تو اب ان اخلاقِ رذیلہ کی اصلاح کیسے ہوگی؟ یعنی جب فطرت کسی

انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے تو اس کی اصلاح کیسے اپنے اختیار میں ہوگی؟ اس پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: تعجب ہے کہ تمہیں بھی اس قسم کے شبہات پیدا ہوتے ہیں، بندۂ خدا! ایک ہے فطری مادّہ اور ایک ہے اس سے نکلنے والے اعمال، فطری مادّہ تو اپنے اختیار میں نہیں ہے، لیکن اعمال تو اپنے اختیار میں ہیں، اور گرفت اعمال پر ہے فطری مادّے پر نہیں۔

مادّۂ حسد نہیں، عملاً حسد بُرا ہے:

مثلاً: کسی کے اندر حسد کا مادّہ ہے، ٹھیک ہے ہوتا رہے، لیکن عملاً کسی کے ساتھ حسد کرنا یہ اس بندے کا فعل ہے اور اختیاری فعل ہے، بندے کو چاہئے کہ حسد نہ کرے۔

مادّۂ بخل کے بجائے عملِ بخل مذموم:

یا کسی کے اندر بخل کا مادّہ ہے، اور جہاں موقع ہو مال خرچ نہ کرنا یہ اس کا اختیاری عمل ہے، اور اصلاح اعمال کی ہوتی ہے فطری مادّے کی نہیں ہوتی، لیکن جب بار بار ایک عمل کو کرتے رہوگے جبر کے ساتھ کروگے، تکلف کے ساتھ کروگے تو اِن شاء اللہ! وہ مادّہ بھی کمزور ہوجائے گا۔

نفس کے منشا پر عمل نہ کرو:

شرح اس کی یہ ہے کہ نفس کے اندر اللہ تعالیٰ نے شر کا مادّہ بھی رکھا ہے، نفس بُرائی کا حکم کرتا ہے، یہ جب بھی کچھ کہے گا تو اُلٹی بات ہی کہے گا، یہ فطری چیز ہے، یہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تم اس کے کہنے پر عمل کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ اس کے کہنے پر عمل نہ کرو، تو یہ تمہارے اختیار میں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ نفس ہمیشہ غلط کام کا مشورہ دیتا ہے، شرارت کا مشورہ دیتا ہے، شر کا مشورہ دیتا ہے، لیکن یہ زبردستی کام نہیں کرواتا، کام تو اپنے اختیار سے کرتے ہو، نفس میں ایک بُرائی کا

تقاضا پیدا ہوتا ہے تم وہ بُرائی نہ کرو، اور نفس میں نیک عمل نہ کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، تم اپنے نفس کی مخالفت کرو۔

نفسِ امّارہ سے لوّامہ:

جب تم اپنے نفس کی بار بار مخالفت کرتے جاؤگے تو وہ نفس بھی کمزور ہوتا جائے گا، اور اس کے مشورے بھی کمزور ہوتے جائیں گے، اور پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ تمہارا نفس تمہیں کوئی غلط مشورہ دے گا تو بعد میں اس کو ملامت ہوگی کہ میں نے یہ مشورہ غلط دیا ہے، اس کو کہتے ہیں لوّامہ یعنی ملامت کرنے والا نفس، اور اللہ نے اس کی ایسی عزت فرمائی ہے کہ قرآنِ کریم میں خود اس نفسِ لوّامہ کی قسم کھائی ہے، جیسے قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

”وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔“ (القیامۃ:۲)

اپنے نفس کی اتنی مخالفت کرو کہ رفتہ رفتہ یہ اس حالت میں آجائے کہ اگر یہ غلط مشورہ دے یا غلط کام کروائے تو پھر بعد میں اس کو ملامت ہو۔

لوّامہ سے مطمئنہ:

اور جب یہ اس سے ترقی کر جاتا ہے تو پھر یہ نفس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مکمل طور پر تابع ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں، اور اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

”یَـٰٓأَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔“

(الفجر:۲۷ تا ۳۰)

یعنی اے اطمینان والے نفس! جس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت اطمینان ہے، لوٹ جا اپنے ربّ کی طرف، وہ تجھ سے راضی، تو اس

سے راضی، پس داخل ہوجا میرے بندوں میں اور داخل ہوجا میری جنت میں۔

اس آیت میں بندوں میں داخل ہونا پہلے اور جنت میں داخل ہونا بعد میں فرمایا گیا ہے، دُعا کریں اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے، اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کی جوتیوں میں ہمیں جگہ نصیب فرمادیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے تھے کہ: یہ تو ہمارا منہ نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ سے جنت مانگیں، ہم دُوسری درخواست کرتے ہیں کہ یا اللہ! اپنے نیک بندوں کی جوتیوں میں جگہ دے دیں۔

مادّے پر گرفت نہیں:

اگر نفس کے اندر جبلی شر کا مادّہ ہے، اس پر کوئی گرفت نہیں، لیکن اس شریر مادّہ سے جو اعمال پھوٹیں گے وہ اعمال اختیاری ہیں، ان اعمال پر عمل نہ کرو، اور اگر یہ جبلی مادّہ نیک اعمال سے روکتا ہے تو تم ان نیک اعمال سے نہ رُکو، رفتہ رفتہ یہ جبلی مادّہ بھی کمزور ہوجائے گا اور نفس، نفسِ لوّامہ کے بعد نفسِ مطمئنہ بن جائے گا، اور مرتے وقت اس کو یہ بشارت نصیب ہوگی کہ: تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔

مرتے وقت پریشانی کی وجہ؟

مرتے وقت آدمی کو متعدّد وجوہ سے پریشانی ہوتی ہے، مثلاً: ہمارے حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے بقول: موت کے وقت سب سے کٹ کر صرف ایک سے واسطہ رہ گیا، اور دُنیا میں جو مہربان تھے اور جان چھڑکتے تھے، جیسے ماں تھی، بیوی تھی، بچے تھے جو اس کی ذرا سی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اب ان سے رشتہ کٹ گیا، کیونکہ موت کے وقت نہ ماں کام آسکتی ہے، نہ باپ، نہ بیٹی، نہ بھائی، الغرض کوئی کام نہیں آسکتا، اب صرف ایک کے ساتھ رشتہ جڑ گیا، اور وہ ہیں اللہ تعالیٰ، ہم نے ساری زندگی ان کے ساتھ بنائی نہیں، مگر اَب واسطہ انہی سے پڑگیا، یعنی جن

کے ساتھ ہم نے زندگی بھر بنائی تھی انہوں نے تو وفا نہ کی، اور جس کے ساتھ واسطہ پڑ گیا، اس کے ساتھ ہم نے کبھی بنائی نہیں تھی، تو موت کے وقت سب سے زیادہ پریشانی اس چیز کی ہوگی کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جائیں گے تو ہم سے ہمارا رَبّ کیا معاملہ کرے گا؟

اللہ سے بنا کر رکھنے والوں کا حال:

جن لوگوں نے اپنی زندگی میں اپنے رَبّ کے ساتھ تعلق جوڑے رکھا، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِرْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ'' یعنی تو لوٹ جا اپنے رَبّ کی طرف، وہ تیرا رَبّ ہے، مربی ہے، یعنی ان کی زندگی میں رَبّ کا اور بندے کا جتنا تعلق مضبوط ہے، اتنا کسی کے ساتھ بھی مضبوط نہیں، اور چونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر اطمینان ہوا، اس لئے: ''رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً'' یعنی وہ تم سے راضی ہے اور تو اس سے راضی، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بندے کی رضامندی کو پہلے ذکر فرمایا اور اپنی رضامندی کو بعد میں ذکر فرمایا، کیونکہ ظاہری حال میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی، بندے کی رضامندی پر مرتب ہوتی ہے، ظاہری حال میں، میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے، پہلے وہ راضی ہوتے ہیں، پھر بندہ راضی ہوتا ہے، تم نے ساری زندگی نہایت خوشی اور رضا کے ساتھ اس کے اعمال کی تعمیل کی، تو اس کے ہر حکم پر راضی تھا، اس لئے تو اپنے مالک کی طرف لوٹ جا، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، اس مژدہ اور خوشخبری کے بعد اب کوئی خوف نہیں رہا۔

صلحاء کو تنہائی نہ ہوگی:

ایک خطرہ اور خدشہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد تنہائی ہوگی، سارے عزیز واقارب چھوٹ گئے اور اب اکیلے قبر میں پڑے ہوئے ہیں، اکبر الٰہ آبادی کے بقول:

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
تہہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے

تنہائی کا احساس کھائے جارہا ہے، بعض بے چارے بوڑھے ہوجاتے ہیں، ان کے پاس کوئی آتا نہیں، جاتا نہیں۔

ایک بڑے میاں تھے نابینا ہوگئے تھے، بوڑھے بھی تھے، آنکھوں سے نظر نہیں آتا تھا، آنکھیں گئیں، جہان گیا، انہوں نے اپنے پاس ایک گھڑی رکھی ہوتی تھی کوئی آتا تو اس سے وقت پوچھ لیتے تھے، تاکہ اس بہانے سے تھوڑا دِل بہلتا رہے، قبر میں تو کوئی وقت بتانے والا بھی نہیں ہوگا، تو تنہائی کا کبھی کبھی خیال آتا ہے، تو بہت بے چینی محسوس ہوتی ہے، حالانکہ میرا دِل کرتا ہے کہ میرے کمرے کا دروازہ بند ہو اور کمرے میں کوئی نہ آیا کرے، تو سب سے زیادہ پسندیدہ میرا وقت وہ ہوتا ہے کہ جب اندر کی کنڈی لگی ہوئی ہو اور کوئی اندر نہ آئے، لیکن اس کے باوجود جبکہ قبر کی کنڈی لگادی جائے گی وہاں کی وحشت اور تنہائی کا خیال بہت پریشان کرتا ہے۔ فرمایا: فکر نہ کرو تم میرے بندوں میں داخل ہوجاؤ، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک جانے والے مقبول بندے وہاں موجود ہیں، جاؤ! ان میں شامل ہوجاؤ۔ اب بھی تنہائی ہوگی؟

دُنیا کی لذتیں چھٹنے کا احساس نہ ہوگا:

ساتھ ہی ساتھ یہ کہ دُنیا کی لذتیں چھوٹ گئیں یہ بھی احساس نہ رکھو، میری جنت میں داخل ہوجاؤ اور تمہیں جنت کی ایک ہوا لگے گی تو دُنیا کی تمام نعمتوں کو بھول جاؤ گے، تو خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے اعمال اختیاری ہیں، چاہے طبیعت کے اندر مادّہ کیسا بھی ہو، لیکن اس سے جو عمل نکلے گا وہ اختیار سے نکلے گا، بس اپنے اختیار کو استعمال کرو۔

شروع میں نیکی کرنا مشکل ہوگا:

اتنی بات ہے کہ جس چیز کی عادت نہیں ہوگی اس کو کرنا ذرا مشکل ہوگا، اہتمام کرنا پڑے گا۔ ایک آدمی نماز کا عادی نہیں، پکڑ کر تم اس کو مسجد میں لے جاتے

ہو، تو بڑا مشکل ہوگا، اس کو اپنے آپ پابندی کرنا بڑا مشکل ہوگا۔

عادت پر یہ مشکل بھی نہ رہے گی:

مولانا غلام حسین گیلانی نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ میر طیب تھے، انہوں نے ایک بستی بسائی اور ایک بہترین مسجد بنائی، اور اس بستی میں جولاہے آباد کئے، اپنی زمین لے کر بستی بسائی اور جولاہے اس لئے آباد کئے کہ یہ بے چارے زیادہ نمازی ہوتے ہیں، حضرت کو بتایا گیا کہ ایک جولاہا نماز نہیں پڑھتا، آپ نے اسے بلایا اور پوچھا کہ: بھائی! تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ کہتا ہے کہ: نقصان ہوتا ہے! کہنے لگے: کتنا نقصان ہوتا ہے؟ کہنے لگا کہ: ایک درہم کا نقصان ہوجاتا ہے نماز پڑھنے سے! جتنا وقت اس پر لگے گا میں اتنا اپنا کام کروں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ: بھائی! ایک درہم مجھ سے لے لیا کرو اور نماز پڑھا کرو، روز ایک درہم لے لیا کرو اور نماز پڑھا کرو۔ کہنے لگا: ٹھیک ہے! وہ نماز پڑھنے لگا، ایک دن حضرت سے کسی نے شکایت کی کہ یہ جولاہا بغیر وضو کے نماز پڑھتا ہے، اس کو پھر بلایا اور کہا کہ: میاں! سنا ہے کہ تم بغیر وضو کے نماز پڑھتے ہو؟ کہنے لگا کہ: ایک پیسے سے دو کام؟ پیسہ تو ایک دیتے ہو اور کام دو کرواتے ہو! حضرت کہنے لگے کہ: تم آئندہ دو پیسے لے لیا کرو، وضو کا پیسہ الگ لے لیا کرو اور نماز کا پیسہ الگ لے لیا کرو، لیکن وضو کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ کہنے لگا: بہت اچھا! کچھ وقت گزرا تھا، کہنے لگا کہ: اپنے پیسے اپنے پاس رکھو، اب میں خود ہی پڑھوں گا۔

جس طرح جولاہے کو نماز پڑھنا مشکل تھا اور وضو کرنا مشکل تھا، اس طرح ہمارے بھی نئے نمازیوں کو نماز پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔

نیکی کی لت لگ جائے گی، ایک عجیب قصہ:

مولانا مظفر حسین رحمہ اللہ مولانا الیاس رحمہ اللہ کی والدہ کے نانا تھے، نہایت ہی متقی، پرہیزگار بزرگ تھے، ایک دن ایک مسجد میں تشریف لے گئے، ایک کچی مسجد،

پُرانے زمانے کی، لیکن بہت خستہ حالت، چوہوں نے کرید کرید کر مٹی کے ڈھیر لگا رکھے تھے، اور کوئی نماز پڑھنے کے لئے نہیں آتا تھا، حضرتؒ وہاں مہمان کے طور پر تشریف لے گئے تھے تو مسجد کی صفائی کی اور مسجد صاف ستھری کردی، اَذان دے دی، کچھ آدمی وہاں سے گزرے ان لوگوں سے کہا کہ: بھائی! تمہاری بستی کی مسجد ہے، اس میں تم نماز پڑھ لیا کرو۔ کہنے لگے: یہ جو مسجد کے ساتھ خان صاحب کا گھر ہے، یہ چوہدری ہیں یہاں کے، اگر یہ نماز پڑھنے لگیں تو ساری بستی نماز پڑھنے لگے، اور خان صاحب کی حالت یہ تھی کہ چھ سال ہوگئے تھے ان کی شادی کو، جاکر اپنی بیوی کی شکل نہیں دیکھی تھی اور بدکار عورتیں، فاحشہ عورتیں روز اس کے پاس ہوتی تھیں، گانا، مجرا اور ناچ ہوتا تھا، حضرت مولانا رحمہ اللہ اس کے پاس تشریف لے گئے، پتا نہیں کتنے اِخلاص اور محبت سے اس سے فرمایا کہ: خان صاحب! اگر آپ نماز پڑھنے لگیں تو آپ کی برکت سے مسجد آباد ہوجائے، یہ آپ کی بستی کی مسجد ہے۔ وہ کہنے لگا کہ: بات یہ ہے کہ میں تو شرابی کبابی آدمی ہوں، یہ روزانہ مجھ سے وضو نہیں کیا جائے گا! اب تو داڑھی منڈواتے ہیں نا! پہلے زمانے میں داڑھی بڑھانے کا رواج تھا، کبھی سکھوں کو دیکھا ہوگا وہ داڑھی کو اُوپر چڑھا لیتے ہیں، کہنے لگے کہ: وضو کرنے میں داڑھی کو اُتارنا ہوگا یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ حضرتؒ نے فرمایا: خان صاحب! تم بغیر وضو کے پڑھ لیا کرو، مگر پڑھ لیا کرو۔ کہنے لگا: پڑھ لیا کریں گے! اگر ایسی بات ہے تو پڑھ لیا کریں گے! حضرت کہنے لگے کہ: مسجد تمہارے ساتھ ہے، پانچ وقت کی نماز تم پڑھ لیا کرو! کہنے لگا: جی بہت اچھا! وعدہ کرلیا۔ اب پہلی نماز پڑھنی ہے تو بہتر ہے کہ میں غسل کرلوں، اپنے کپڑے بھی تبدیل کرلوں، اچھی طرح غسل کیا اور اپنے کپڑے بھی تبدیل کرلئے، اور مسجد میں آگیا نماز پڑھنے کے لئے، ظاہر بات ہے کہ نماز پڑھنے میں بھی مزہ آیا ہوگا، تو دُوسری نماز کا وقت آیا تو خان صاحب کے بدن میں خارش شروع ہوگئی، کہنے لگا کہ: پانی لاؤ! چہرے پر اور ہاتھوں پر جو خارش تھی وضو کرنے سے

سکون ہوگیا، وضو کر کے پھر آگئے مسجد میں، جب نماز کا وقت آتا خان صاحب کو خارش شروع ہوجاتی، کہنے لگے: بڑے میاں لت لگا گئے ہیں مجھے! اور شام کو خیال آیا کہ بھائی آج نماز پڑھی ہے تو گھر بھی چکر لگا آئیں، چھ سال سے گھر نہیں گئے تھے، گھر جاکر اپنی بیوی کو دیکھا تو اس کی شکل وصورت دیکھ کر عاشق ہوگئے، اور سب کنجریوں کو بھگادیا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے تہجد گزار بن گئے۔

تصوّف وطریقت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے طفیل سب کچھ ملتا ہے، تصوف میں اتنا کثیر ذخیرہ ہے مگر اس کی قدر چند لوگ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا حقیقتِ طریقت ہے، جب بزرگوں کی ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کیا جاتا ہے تو اس کو طریقت کہتے ہیں۔ تو طریقت میں کیا چیز ہوتی ہے؟ اور کیا چیز نہیں ہوتی؟

۱:... نہ اس میں کشف وکرامات ضروری ہیں کہ جو اللہ والا بن جائے اور اس کو کشف ہوجایا کرے اور اس کی کرامتیں ظاہر ہوجایا کریں، کشف وکرامات کا معنی یہ نہیں۔

۲:... نہ قیامت کے دن بخشوانے کی ذمہ داری ہے کہ پیر صاحب اپنے مریدوں کو بخشوادیں گے، کوئی ذمہ داری نہیں، پیر صاحب کو اپنا ہی پتا نہیں، ذمہ داری کیا لے گا بے چارا؟

۳:... نہ دُنیا کی کاربراری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائیں یا دُعا سے مقدمات ختم ہوجایا کریں، یا روزگار میں ترقی ہو، یا جھاڑ پھونک سے بیماری جاتی رہے، یا آئندہ ہونے والی بات بتلادی جائے، یہ چیزیں ضروری نہیں، کوئی تعویذ دیدے تو بیماریاں ہٹ جایا کریں، یا مقدمے میں فتح ہوجایا کرے، آج کل اسی چیز کو بزرگی سمجھنے لگے ہیں۔

۴:... نہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہوجائے، اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے اور مختلف ان کے کام ہوتے رہیں، اور مرید کو زیادہ ارادہ بھی نہ کرنا پڑے یا علمِ دِین اور قرآنِ کریم میں حافظہ بڑھ جائے، اس کی بھی ذمہ داری نہیں۔

۵:... نہ ایسی باطنی کیفیات پیدا ہونے کا وعدہ ہے کہ ہر وقت یہ لذت سے سرشار رہے، عبادت میں خطرات نہ آئیں اور خوب رونا آئے۔

۶:... نہ ذکر و شغل میں انوارات کا نظر آنا یا کسی آواز کا سنائی دینا ضروری ہے کہ ذکر کرتے وقت انوار نظر آیا کریں یہ بھی ضروری نہیں۔

۷:... نہ عمدہ عمدہ خوابوں کا آنا ضروری ہے یا اِلہامات کا صحیح ہونا لازم ہو، یہ چیزیں بزرگی میں شامل نہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ کوئی چیز عطا فرمادیں تو اس کی عنایت ہے، لیکن یہ بزرگی نہیں کہ یہ چیزیں ہوں تو بزرگی ہے، ورنہ نہیں۔ یہ چیزیں مقصد نہیں، بلکہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں، ایسا طرزِ زندگی اختیار کرنا اور اشغال اور حالات اختیار کرنا جن پر اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے بس صرف یہی ایک بات مطلوب ہے، باقی حج ہے، نماز ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ ہے، ذکر ہے، شغل ہے، تلاوت ہے، اور تمام اعمالِ صالحہ ان سب سے صرف ایک مقصود ہے اور وہ ہے رضائے اِلٰہی کا حصول، یعنی اللہ تعالیٰ کیسے راضی ہوتے ہیں۔

شریعت پر چلنا ہی تصوّف ہے:

حضرت فرماتے ہیں کہ: تصوّف یہ ہے کہ شریعت کے حکموں پر پورے طور پر چلنا۔ ان حکموں میں سے بعض مطلق ظاہر کے اَحکام ہیں، جیسے: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور جیسے: نکاح، طلاق، ادائے حقوقِ زوجین، قسم، کفارۂ قسم وغیرہ، اور جیسے: سلام، طعام، کلام، وغیرہ، مہمانی، میزبانی وغیرہ، ان مسائل کو علمِ فقہ کہتے ہیں۔

شریعت کے چار شعبے:

یہ چار شعبے ہوگئے، ایک شعبہ ہے اعمال کا، اور دوسرا شعبہ ہے، معاملات کا، یعنی لین دَین کا کہ اس طرح خرید وفروخت کرنا ہے، کرایہ داری ہے، کرائے پر چیز لینا ہے، کرائے پر چیز دینا ہے، وغیرہ وغیرہ اور اسی میں شامل ہے ملازمت۔ غرضیکہ ایک ہمارا معاملہ ہے لین دَین کا، کہ کسی کے ساتھ لین دَین ہو تو کیسے ہو؟ اس کو کہتے ہیں معاملات۔ اور تیسرا شعبہ ہے معاشرت کا۔ معاشرت کے معنی ہیں: آپس کے حقوق ادا کرنا، میل جول، سب سے پہلے تو آدمی کا واسطہ اپنی ذات سے ہے، اپنے نفس کے حقوق بھی ہمارے ذمے لازم ہیں، آدمی گھر میں جاتا ہے تو گھر والوں کے حقوق لازم ہیں، دوست احباب سے تعلق ہے، ان کے بھی حقوق لازم ہیں، ہمسایوں کے حقوق لازم، عام مسلمانوں کے حقوق لازم، عزیز و اقارب کے حقوق لازم، ان حقوق کا ادا کرنا شریعت میں اس کو کہتے ہیں معاشرت۔

اور چوتھی چیز ہے اس کو سیاسیات کہتے ہیں، راعی اور رعایات کے تعلقات، ایک حاکم کو رعایا کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟ اور رعایا کو حاکم کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟ حاکم کو محکوم کے ساتھ اور محکوم کو حاکم کے ساتھ، امیر کو مأمور کے ساتھ اور مأمور کو اَمیر کے ساتھ، اور اس سلسلے میں کچھ قوانین بھی ہوں گے، کچھ لوگ بگڑے ہوئے ہوں گے ان کی اصلاح کرنا پڑے گی، چور ہیں، ڈاکو ہیں، قاتل ہیں، لوگوں کو ایذا پہنچانے والے ہیں، یا دوسرے جرائم کے مرتکب ہیں، یہ بھی اسی میں داخل ہوجاتے ہیں، ان تمام چیزوں سے جو تعلق رکھتے ہیں، حضرت فرماتے ہیں کہ اس کا نام ہے علم الفقہ۔

فقہ دراصل تصوّف ہے:

حضرت اِمام محمد رحمہ اللہ ہمارے حضرت اِمامِ اعظم رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں،

اور حضرت اِمام ابوحنیفہؒ کے علوم کی اشاعت سب سے زیادہ انہوں نے کی ہے، نو سو ننانوے کتابیں انہوں نے لکھیں، کسی نے ان سے عرض کیا: حضرت! آپ نے علمِ فقہ پر بہت کتابیں لکھی ہیں، تصوف پر بھی یعنی باطنی اخلاق پر بھی کوئی کتاب لکھ دیتے، فرمایا: میری سب کتابیں تصوف پر ہیں، اللہ تعالیٰ کے اَحکام صحیح طریقے کے مطابق بجا لانے کا نام ہی تصوف ہے۔

باطنی اَحکام کا نام سلوک:

بعض اَحکام متعلق باطن کے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا، اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا، دُنیا کی محبت کم کرنا، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، عبادت میں دِل کا حاضر رکھنا، کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی نہ ہونا، غصّے کو ضبط کرنا، وغیرہ وغیرہ، ان اخلاق کو سلوک کہتے ہیں، اور مثل اَحکامِ ظاہری کے ان باطنی اَحکام پر عمل کرنا بھی فرض اور واجب ہے۔

باطنی خرابیوں سے ظاہری اعمال میں خرابی:

نیز ان باطنی خرابیوں کی وجہ سے اکثر ظاہری اعمال میں بھی خرابی آجاتی ہے، جیسے قلّتِ محبتِ حق سے نماز میں سستی ہوگئی، اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں، جس سے محبت ہو رہی ہے، پاس بیٹھنے کو جی چاہتا ہے، اور جی چاہتا ہے کہ اُٹھے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی تو نماز اللہ تعالیٰ کے پاس بیٹھنا ہے، اس میں بھی دِل لگے گا۔ تو یہ قلّتِ محبت کی بنا پر ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت نہیں اس لئے ہم نے نماز کی حقیقت کو نہیں سمجھا، ایسے ہی نماز کو ٹرخاتے ہیں یا تو پڑھنی نہیں، اگر پڑھتے ہیں تو جلدی جلدی پڑھ لی اور دِل کو حاضر نہیں کیا، جیسے قلّتِ محبتِ حق سے نماز میں سستی ہوگئی، نماز قضا ہوجاتی ہے کبھی کبھی یا جلدی جلدی بلا تعدیل ارکان پڑھ لی، یا بخل کی وجہ سے زکوٰۃ اور حج کی ہمت نہ ہوئی، یا کبر اور غلبۂ غضب کی وجہ سے کسی پر ظلم ہوگیا۔

کچھ اعمال ایسے ہیں جو آدمی کے ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو علمِ ظاہر کہتے ہیں اور اس کے مسائل معلوم ہوتے ہیں علم الفقہ سے، مسئلے مسائل کی کتابوں سے۔

کچھ اَحکام باطن سے متعلق ہیں، یعنی دِل سے ان کا تعلق ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ: جیسے نماز روزہ فرض ہے، یہ ظاہری فرائض و واجبات ہیں، ایسے ہی یہ چیزیں بھی فرائض و واجبات میں شامل ہیں، بعض چیزیں فرض ہیں، بعض چیزیں واجب ہیں، بعض چیزیں حرام ہیں، بعض چیزیں مکروہ ہیں، اور ان کی طرف لوگوں کو اِلتفات ہی نہیں، اس لئے اصلاح کے لئے باقاعدہ علاج کرنا پڑتا ہے۔

نفس کی تین قسمیں اور ان کی تعریف:

جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ یہ کہتے ہیں کہ نفس کی تین قسمیں ہیں، نفسِ لوّامہ: بُرائی کا حکم کرنے والا، پھر جب اس کو مہذّب کیا جائے تو رفتہ رفتہ اس کی عادت یہ ہوجاتی ہے کہ یہ بُرائی کی طرف جائے تو اس کو ملامت ہوتی ہے کہ میں نے اچھا نہیں کیا، اور اس کے تدارک کی فکر ہوتی ہے، اس کو نفسِ لوّامہ کہتے ہیں، آخر میں پھر اس کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر خواہ وہ تشریعی ہو یا تکوینی اطمینان ہوجاتا ہے۔ مالک نے جو حکم دیا ٹھیک ہے، اس کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں، تو نفسِ لوّامہ کو نفسِ مطمئنہ بنانے کے لئے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، محنت کرنی پڑتی ہے، بس اسی کا نام مجاہدہ ہے، اور یہی چیز اللہ والوں سے سیکھی جاتی ہے۔

نفس کی اصلاح ضروری کیوں؟

بہرحال فرماتے ہیں کہ اگر ظاہری اعمال میں احتیاط کی گئی تب بھی جب تک نفس کی اصلاح نہیں ہوتی وہ احتیاط چند روز سے زیادہ نہیں چلتی، پس نفس کی اصلاح ان دو سبق سے ضروری چاہیئے، نفس کی اصلاح کرنا دو طرح ضروری ٹھہرا، ایک تو باطن

کے اَحکام جو دِل سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بغیر رضائے اِلٰہی حاصل نہیں ہوسکتی، دُوسری یہ کہ جب تک باطن دُرست نہ ہو، ظاہر دُرست نہیں ہوسکتا، باطن کی اصلاح کے بغیر ظاہر دُرست نہیں ہوتا۔

ریاضات ومجاہدات کا حاصل:

ہمارے ایک بزرگ تھے فیصل آباد میں فوت ہوگئے، اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت فرمائے، حاجی امیرالدین صاحبؒ، ہمارے شیخ کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری قدس سرہٗ سے وہ بیعت ہوئے تھے، ایک سو سال کی عمر میں فوت ہوئے ہیں، مجھے بہت خطوط لکھا کرتے تھے، میرے پاس ان کے خطوط محفوظ ہیں، اسکول ماسٹر تھے، لیکن بزرگوں کی خدمت میں بیٹھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دولت دے دی تھی، ایک خط میں مجھے لکھا کہ تمام تر ریاضات اور مجاہدات کا حاصل یہ ہے کہ آدمی محنت و ریاضات کرتا رہے یہاں تک کہ اُمورِ شرعیہ، اُمورِ طبعیہ بن جائیں، جن چیزوں کا شریعت حکم دیتی ہے وہ ایسے بن جائیں جیسے ہمارا کھانا اور پینا، جیسے وہ ایک طبعی چیز ہے، ان اعمال کا کرنا بھی اتنا آسان ہوجائے، اور رفتہ رفتہ یہ طبیعتِ ثانیہ بن جاتے ہیں، جیسے کسی کو نشہ لگ جاتا ہے اور وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتا ہے، اب ہر آدمی کی فطرت میں تو نشہ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی عادت ڈال لے تو اس کی ایسی عادت بن جاتی ہے کہ اس کو چاہے روٹی نہ ملے مگر نشہ دے دو۔ اسی طرح نفس کو جب عبادات، طاعات اور باطنی اُمور کا پابند کیا جائے اور یہ پابندی کسی کی نگرانی میں، کسی کی ہدایت کے مطابق مسلسل کی جائے تو یہ چیزیں رفتہ رفتہ اُمورِ طبعیہ بن جاتی ہیں، پھر اس میں اتنی سہولت پیدا ہوجاتی ہے کہ ان کو کرنا مشکل نہیں ہوتا، چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح کی ضرورت:

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ پس نفس کی اصلاح ان دو سبب سے ضروری ٹھہری، لیکن یہ باطنی خرابیاں ذرا سمجھ میں کم آتی ہیں، اوّل تو سمجھ میں ہی نہیں آتیں، اگر سمجھ میں آتی ہیں تو ان کی دُرستگی کا طریقہ کم معلوم ہوتا ہے، اور جو معلوم ہوتا ہے نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے دِین کا یہ حل تجویز کیا جاتا ہے کہ شیخ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج اور تدبیر بھی بتاتا ہے، مزید یہ کہ نفس کے اندر دُرستگی کی استعداد اور ان معالجات میں سہولت اور تدبیرات کی قوّت پیدا ہونے کے لئے کچھ اَذکار اور اَشغال کی بھی تعلیم کرتا ہے اور خود ذکر اپنی ذات میں بھی عبادت ہے، تو سالک کو دو کام کرنے پڑتے ہیں، ایک یہ کہ اَحکامِ شرعیہ ظاہری اور باطنی کی پابندی ہے، اور دُوسرا مستحب جو کثرتِ ذکر ہے، یہ دونوں کام شیخ کی نگرانی میں پابندی کے ساتھ کرتا رہے، اس پابندیٔ اَحکام سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، یہ ہے خلاصہ طریق کا اور اس کے مقصود کا۔ اس لئے کسی سے اصلاح کا تعلق رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے نفس کے اندر جو عیوب ہیں ان کو بتاسکیں، اس لئے کہ ہمیں پتا نہیں چلتا وہ سالک بتائے گا تو شیخ تشخیص کے بعد تجویز کرسکے گا کہ اس کا علاج یہ ہے اور پھر علاج کی نگرانی کرسکے کہ علاج ٹھیک چل رہا ہے، اس کو بالکل ایسے ہی سمجھئے کہ جیسے ہم ظاہری امراض کا علاج ڈاکٹر یا طبیب سے کرواتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ اپنے باطن کا علاج کروائیں۔

شیخ پر اعتماد اور تسلیم:

حضرت مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہٗ میرے پہلے شیخ وہ شوال ۱۳۴۲ھ میں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پرچہ لکھا کہ: میں اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، اور اپنے حالات لکھے، حضرتؒ نے لکھا کہ: تم میں تکبر ہے! ہم تو

سمجھیں گے کہ ہمیں گالی دے دی، حضرتؒ نے لکھا کہ تم میں تکبر ہے! جواب میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب نے لکھا کہ: حضرت نے میری تشخیص فرمائی ہے اور بالکل صحیح تشخیص ہے، میں اس کو دِل و جان سے قبول کرتا ہوں، حضرت جس طرح اس کا علاج تجویز فرمائیں اس پر عمل کروں گا۔ حضرتؒ نے لکھا کہ: اللہ تعالیٰ اس علم و عمل کو مبارک کرے! یہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کی طرف حضرتؒ کا پہلا خط ہے، اپنے آپ کو اگر شیخ کے سپرد کردیا تو اس کی بات بھی ماننی پڑے گی، اس نے کہا کہ: ''تم میں تکبر ہے'' تم کہو گے کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے۔ تین سال سات ماہ میں حضرت تھانویؒ نے حضرت مولانا خیر محمدؒ کو خلافت دے دی۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ خطوط کے علاوہ ایک سال میں تین مرتبہ حضرتؒ کی خدمت میں سفر کیا کرتے تھے، ہر ماہ خط لکھنا، اپنے حالات کی اطلاع دینا اور تین ماہ میں سفر کرنا حضرت مولانا خیر محمدؒ کا معمول تھا، مدرسے میں پڑھاتے تھے، جب مدرسے کی دس دن کی چھٹی ہوتی تھی تو حضرتؒ کی خدمت میں چلے جاتے تھے، رمضان کی چھٹی ہوئی جب چلے گئے حضرتؒ کی خدمت میں۔ ہر رمضان حضرتؒ کی خدمت میں گزارتے تھے، تین سال سات ماہ کے بعد حضرتؒ نے خلافت دے دی، باقاعدہ علاج کیا نا!

چالیس خطوط پر خلافت:

یہ ہمارے حضرت مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ تھے، ان کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ انہوں نے صرف چالیس خط لکھے حضرتؒ کو، وہ چھپے ہوئے ہیں، ''عباد الرحمٰن'' کے نام سے، حضرت حکیم الامتؒ کو چالیس خط لکھے، چالیسویں خط میں حضرتؒ نے لکھ دیا کہ میں تم کو اجازت دیتا ہوں، خلافت دے دی۔ یہ کہنے لگے کہ: حضرت! میں تو بیعت بھی نہیں ہوا؟ انہوں نے لکھا: کیا مذاق ہے؟ بیعت اب کرلیں گے! خلافت پہلے ملی، بیعت بعد میں ہوئے۔ شیخ کی نگرانی میں

مسلسل عمل کرنا اور حالات بتانا اور پھر اس کی تجویز پر عمل کرنا یہ خلاصہ ہے پیری مریدی کا۔ تعویذ گنڈے، پھونکیں مارنا یہ مشیخیت نہیں ہے، یہ دُکان داری ہے، ویسے ہمارے اکابر لوگوں کے نفع کے لئے کوئی ضرورت ہو پھر تو دے دیتے ہیں، لوگوں کو نفع پہنچانے کے لئے، کوئی بے چارہ عقیدت کے ساتھ مانگ رہا ہے چلو دے دو۔

ضرورت پر تعویذ کی اجازت ہے:

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے تھے کہ: مجھے ان تعویذ گنڈوں سے نفرت ہے، لیکن حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمادیا تھا کہ: اشرف علی! کوئی ضرورت مند آجایا کرے تو بتادیا کرو۔ کہا کہ: حضرت! مجھے آتا نہیں ہے۔ فرمایا: جو بات ذہن میں آجایا کرے لکھ دیا کرو۔

بالکل یہی میرا ذوق ہے، الحمدللہ! مجھے نہیں آتے تعویذ گنڈے، بلکہ نفرت ہے۔ لیکن کوئی بے چارہ مجبور کرتا ہے تو جو بات ذہن میں آتی ہے تو لکھ دیتا ہوں، باقی نفع پہنچانا میرے اللہ تعالیٰ کا کام ہے، میرے تعویذ میں نفع نہیں ہے، تو یہ ضروری نہیں تعویذ گنڈے چل رہے ہیں اور پھونکیں چل رہی ہیں اور یہ اور وہ کہ دُعا کرو کہ مقدمہ چل رہا ہے، دُعا کرو کہ بیمار کو شفا ہوجائے، دُعا کریں گے ضرور لیکن شفا دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، یہ کوئی بزرگی نہیں ہے کہ ہم دُعا کریں اور فوراً شفا ہوجائے۔

تو طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ظاہری اعمال کی پابندی اور باطنی اعمال کی پابندی، باطنی اعمال کے لئے کسی شیخ سے تعلق رکھنا۔

نیک لوگوں کی صحبت

ایک دن آسمان صاف تھا، رات کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحن میں لیٹے ہوئے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں کہ: ستارے چمک رہیں: کوئی ایسا بندہ بھی ہوگا جس کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وہ عمر ہیں۔ ان کو فوراً خیال آیا کہ میرے اَبا کا نام تو نہیں آیا، کہنے لگیں: میرے ابا؟ فرمایا: عمر کی ساری زندگی کی نیکیاں اور تیرے ابا کی ایک نیکی برابر ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:... ''عَنْ عَلِیِّ ابْنِ أَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ لِعُمَرَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ: یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! اِنْ سَرَّکَ أَنْ تَلْحَقَ بِصَاحِبَیْکَ فَاقْصُرِ الْأَمَلَ، وَکُلْ دُوْنَ الشَّبْعِ، وَأَنْکَمِشِ الْاِزَارَ، وَارْقَعِ الْقَمِیْصَ وَاخْصُفِ النَّعْلَ تَلْحَقُ بِھِمَا۔'' (کنز العمال ج:۱۶ ص:۲۰۴ حدیث:۴۲۲۲۷)

ترجمہ:... ''اِمام بیہقی رحمہ اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ: امیر المؤمنین! اگر آپ کو اس بات کی خوشی ہے کہ آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے جاملیں تو اپنی اُمیدوں کو کم کردیجئے، پیٹ بھرنے سے کم کھایئے، لنگی چھوٹی کیجئے، قمیص کو پیوند لگایا کیجئے، اور جوتے کو گانٹھ لیا کیجئے، آپ ان دونوں کے ساتھ جاملیں گے۔''

۲:... ''عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: لَیْسَ الْخَیْرُ أَنْ یَّکْثُرَ مَالُکَ وَوَلَدُکَ، وَلٰکِنَّ الْخَیْرَ أَنْ یَّکْثُرَ عِلْمُکَ وَیُعْظِمُ حِلْمُکَ، وَأَنْ تَبَاھَی النَّاسَ بِعِبَادَۃِ

رَبِّکَ، فَاِنْ أَحْسَنْتَ حَمِدْتَّ اللهَ وَاِنْ أَسَأْتَ اِسْتَغْفَرْتَ اللهَ، وَلَا خَيْرَ فِی الدُّنْيَا اِلَّا لِأَحدٍ رَّجُلَيْنِ، رَجُلٌ أَذْنَبَ ذَنْبًا فَهُوَ تَدَارَکَ ذٰلِکَ بِتَوْبَةٍ، أَوْ رَجُلٌ يُّسَارِعُ فِی الْخَيْرَاتِ وَلَا يَقِلُّ عَمَلٌ فِیْ تَقْوٰی وَ کَيْفَ يَقِلُّ مَا يُتَقَبَّلُ۔"

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۷۵)

ترجمہ:... "اِمام ابونعیم رحمہ اللہ نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپؓ نے فرمایا: خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور اولاد زیادہ ہو، بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہارا حلم بڑھ جائے، اور یہ کہ تو اپنے رَبّ کی عبادت میں لوگوں کا مقابلہ کرے، اگر تو نیکی کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے، اور اگر کوئی بُرا کام کرے تو اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرے، دُنیا میں خیر صرف دو آدمیوں کے لئے ہے، ایک وہ آدمی جس نے گناہ کیا ہو پھر وہ اس کا تدارک کر رہا ہو توبہ کے ساتھ، اور دُوسرا وہ آدمی جو نیکی کے کاموں میں تیزی کرتا ہو اور کوئی عمل جو تقویٰ میں کیا جائے کم نہیں ہوتا اور کیسے کم ہوسکتا ہے وہ عمل جو قبول کرلیا جائے۔"

یہ دو روایتیں امیر المؤمنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مواعظ کی ہیں، پہلی روایت میں حضرت علیؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے وہ شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو ان کی زبان پر اور ان کے دِل پر جاری فرمادیا تھا، دِل میں حق رکھ دیا اور زبان سے جاری فرمادیا تھا، اور شیطان کے وسوسے سے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہاں تک حفاظت فرمائی تھی کہ جس راستے پر چل رہے ہوں، شیطان وہ راستہ چھوڑ کر دُوسرا

راستہ اختیار کرلیتا تھا، وہ وسوسہ کیا ڈالتا جو اتنا ڈرتا ہو، لیکن نصیحت کے وہ بھی محتاج ہیں، اپنے آپ کو نصیحت کا محتاج سمجھتے ہیں، جیسا کہ گزشتہ جمعہ میں نے عرض کیا تھا، حضرت عمرؓ حضرت علیؓ سے فرمائش کرتے تھے کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فرمائش پر ہی حضرت علیؓ نے کہا: امیر المؤمنین! اگر آپ اپنے ان دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں، جو آپ سے پہلے جاچکے ہیں اور یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ قرآنِ کریم نے کیا ہے:

”ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ .....“ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ:...”کہ وہ دُوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں، جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا.....“

حضرت عمرؓ پہلے امیر المؤمنین:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے آدمی ہیں، جن کو ”امیر المؤمنین“ کہا گیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین نہیں کہتے تھے، بلکہ ان کو ”خلیفۃ رسول اللہ“ کہتے تھے، جب بھی ان سے کوئی خطاب کرتا تھا ”یا خلیفۃ رسول اللہ“ کہہ کر خطاب کرتا تھا، تو گویا براہِ راست خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی ایک ہیں، اور پھر بعد میں جانشین کے جانشین ہوئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! اگر آپ اپنے ان دو ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں اور ملنے سے مراد رفاقت ہے، اس دسترخوان کی جس پر وہ دونوں تشریف فرما ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقؓ کا مقام:

مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ایک بادشاہ کی دعوت کی

گئی، اب بادشاہ کے ساتھ اس کے اہلِ خانہ بھی ہیں، اور جس مکان میں بادشاہ کو ٹھہرایا گیا، ظاہر بات ہے کہ وہاں بادشاہ کے اہلِ خانہ بھی ہوں گے، خدام بھی ہوں گے، وزراء، اُمراء بھی ہوں گے، جب دسترخوان لگے گا یہ تمام وزراء اور خدام اس دسترخوان پر بیٹھیں گے، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھیں گے لیکن مراتب کا فرق ہوگا۔ بادشاہ کا مرتبہ اپنی جگہ ہے، وزیر کا اپنی جگہ ہے، اور جو دُوسرے لوگ ساتھ مل گئے ان کا مقام اپنی جگہ ہوگا، ایسے موقع پر کچھ طفیلی بھی آجاتے ہیں، اسی طرح شاہی دسترخوان پر بیٹھ جانا اور بادشاہ کے ساتھ معیت اور رفاقت کا حاصل ہوجانا اپنی جگہ، مگر اس کا یہ معنی نہیں کہ وزیر، دوسرے لوگ یا طفیلی بادشاہ کے مرتبے کو پہنچ جائیں، ٹھیک اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے پر کون پہنچ سکتا ہے؟ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے کو دوسرا کون پہنچ سکتا ہے؟

صدیقؓ و فاروقؓ کی نیکیوں کا فرق:

ایک دن آسمان صاف تھا، رات کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحن میں لیٹے ہوئے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں کہ: ستارے چمک رہیں:

"…. هَلْ يَكُوْنُ لِأَحَدٍ مِّنَ الْحَسَنَاتِ عَدَدَ نُجُوْمِ السَّمَاءِ؟ قَالَ: نَعَمْ، عُمَرُ! قُلْتُ: فَأَيْنَ حَسَنَاتُ أَبِىْ بَكْرٍ؟ قَالَ: اِنَّمَا جَمِيْعُ حَسَنَاتِ عُمَرَ كَحَسَنَةٍ وَّاحِدَةٍ مِّنْ حَسَنَاتِ أَبِىْ بَكْرٍ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۶۰)

ترجمہ:…"کوئی ایسا بندہ بھی ہوگا جس کی نیکیاں آسمان کے ستاروں کے برابر ہوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وہ عمر ہیں۔ ان کو فوراً خیال آیا کہ میرے ابا

کا نام تو نہیں آیا، کہنے لگیں: میرے ابا؟ فرمایا: عمر کی ساری زندگی کی نیکیاں اور تیرے ابا کی ایک نیکی برابر ہے۔“

حضرت عمرؓ کی خواہش:

یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، اور خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: میں ابوبکرؓ کے ساتھ مصارفہ کرنے کے لئے تیار ہوں، ”مصارفہ“ کہتے ہیں سونے چاندی کا تبادلہ۔ میں ابوبکرؓ کے ساتھ مصارفہ کرنے کے لئے تیار ہوں، عمرؓ کی ساری عمر کی نیکیاں وہ لے لیں اور اپنی ایک رات اور ایک دن مجھے دے دیں، اور میری ساری عمر کی نیکیاں مصارفہ کرلیں۔

نبی و صدیق سے ملنے کا مفہوم:

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاملنا یا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جاملنا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی ان کے مرتبے کو پہنچ جائے، بلکہ اِکرام و اِنعامِ خداوندی کے جس دسترخوان پر ان کو بٹھایا گیا ہے، اس کو بھی اس پر جگہ دے دی جائے، یہ مطلب ہے اس کا۔ اس محفل میں اس کو بھی شریک کردیا جائے، اور یہی معنی ہیں ”وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ“ کے، یعنی یا اللہ! ہمیں وفات دے نیک لوگوں کے ساتھ، مطلب یہ کہ وفات دے کر ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ ملادے۔

حضراتِ انبیاء کی صالحین سے ملنے کی خواہش:

اور سیّدنا یوسف علیہ السلام فرمارہے ہیں:

”وَأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ۔“ (یوسف:۱۰۱)

ترجمہ:...”اور ملادے مجھے نیک لوگوں کے ساتھ۔“

سیّدنا یوسف علیہ السلام خود نبی ہیں، لیکن انبیائے کرام علیہم السلام کا ادب

دیکھئے فرمارہے ہیں کہ: ملادے مجھے نیک لوگوں کے ساتھ۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام تختِ سلیمانی پر بیٹھ کر کہہ رہے ہیں:

''وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ''

(النمل:۱۹)

ترجمہ:... ''اور داخل کردیجئے مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں میں۔''

قدوسیوں کی رفاقت کی شرائط:

تو یہ جو رفاقت ہے یہ رفاقت مرتبے میں نہیں ہے، مرتبہ ہر ایک کا اپنا اپنا ہے، الگ الگ ہے، مقصود یہ ہے کہ اس محفل میں باریابی نصیب ہوجائے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمادیں، لیکن اس محفل میں داخلے کا ٹکٹ ہر ایک کو نہیں ملتا، یہ قدوسیوں کی محفل جن کو کہیں صالحین فرمایا، کہیں ابرار فرمایا ہے، اور کہیں منعم علیہم فرمایا ہے، تو اس محفل میں داخلے کی بھی کچھ شرائط ہیں۔

پرل کانٹی نینٹل کا لباس:

مجھے ایک صاحب نے لطیفہ بتایا تھا کہ میانوالی کا بہت بڑا نواب تھا لیکن وہ پنجابی لوگ ہیں لمبی سی چادر پہنتے ہیں ...شلوار وغیرہ نہیں پہنتے تھے...اب تو وہ بھی شلوار پہننے لگے ہوں گے، نیا زمانہ ہے...اور خاص قسم کا ان کا کُرتا ہوتا تھا، اور خاص قسم کی ان کی پگڑی ہوتی تھی، تو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل اسلام آباد میں وہ جانا چاہتے تھے، کہنے لگے: آپ کو داخلے کی اجازت نہیں ہے، کیوں بھائی؟ کہنے لگے: اس ہوٹل میں جانے کے لئے خاص قسم کا یونیفارم استعمال کرنا پڑتا ہے، اور وہ ہے انگریزی لباس۔

قدوسی محفل کا یونیفارم:

میرے بھائیو! ان ابرار یا صالحین کی قدوسی محفل میں داخلے کے لئے بھی

کچھ یونیفارم چاہئے، اور امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ اسی کو بیان فرما رہے ہیں۔ امیر المؤمنین اگر آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں تو چند باتوں کا التزام کیجئے۔

قصرِ اَمل:

ایک تو یہ کہ دُنیا میں لمبی آرزوئیں رکھنا اس کو ختم کردیجئے، اگلے سال یہ کریں گے، فلاں سال یہ کریں گے، یہ ہوگا، وہ ہوگا، ہمارا منصوبہ شام تک کبھی نہیں ہوگا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

”مَرَّ بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا وَأُمِّي نَطِيْنُ شَيْئًا، فَقَالَ: مَا هٰذَا يَا عَبْدَاللّٰهِ؟ قُلْتُ: شَيْءٌ نُّصْلِحُهٗ! قَالَ: اَلْأَمْرُ أَسْرَعُ مِنْ ذٰلِكَ۔“

(مشکوٰۃ ص:۴۵۰، بحوالہ مسند احمد، ترمذی)

ترجمہ:... ”میں اپنی والدہ کے ساتھ مویشی کی کھلی جس میں اس کو چارہ ڈالا جاتا ہے، ٹھیک کر رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گزرے، فرمایا: کیا بن رہا ہے؟ کہا کہ: حضور! یہ ذرا مرمت کر رہے ہیں۔ فرمایا: معاملہ اس سے زیادہ جلدی کا ہے۔“

تمہارے مویشی بھی یہاں رہ جائیں گے، اور یہ کھلیاں بھی یہاں رہ جائیں گی، تم نہیں رہوگے۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:

”أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ۔ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔“

(الشعراء:۱۲۸ تا ۱۳۰)

ترجمہ:... ’’کیا بناتے ہو ہر اُونچی زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں شاید تم ہمیشہ رہوگے، اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو پنجہ مارتے ہو ظلم سے۔‘‘

جہاں تم اچھی جگہ دیکھتے ہو وہاں نشانِ پاکستان بنا کے بیٹھ جاتے ہو، گھر اور کارخانے اتنے مضبوط بناتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، پہلے تو مرنے کی اُمید نہیں، اتنے موٹے موٹے سریے اور اس کے اندر سیمنٹ اور زمین کے اندر تک کھدائی، وہاں تک بھرائی ہورہی ہے، شاید تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔

’’مصنع‘‘ کہتے ہیں کارخانے کو اور تم اتنے بڑے بڑے اُونچے کارخانے لگاتے ہو، اور اتنے مضبوط، ایسا لگتا ہے کہ تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے؟ اور جب پکڑتے ہو تو جباروں کی طرح پکڑ کرتے ہو، پھر تمہارے ہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں، کسی قصوروار کو معاف بھی کردو، کہتے ہیں: نہیں! اس نے ہماری توہین کی ہے، یہ بچ کے نہیں جاسکتا۔ تو یہ ہے لمبی اُمیدیں ہونا۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

’’کُنْ فِی الدُّنْیَا کَأَنَّکَ غَرِیْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ۔‘‘

(مشکوٰۃ ص:۴۵۰، بحوالہ صحیح بخاری)

ترجمہ:... ’’دُنیا میں اس طرح رہو کہ تم اجنبی وطن میں آئے ہوئے یا رہ چلتے مسافر۔‘‘

یہ زندگی ویزا ہے اور جب ویزے کے دن ختم ہوجائیں گے تو پھر یہاں نہیں رہنے دیں گے، سعودیہ والے پندرہ دن کا ویزا دیتے ہیں، پھر نہیں رہنے دیتے، یہاں چھپ کر کوئی رہ جائے تو اس کی مرضی ہے، ورنہ پکڑا جائے تو فوراً چلتا کردیتے ہیں، ’’خروج‘‘ لگادیتے ہیں، گویا تم اجنبی وطن میں ہو، تمہیں یہاں رہنا نہیں ہے،

نہیں! نہیں! بلکہ راستے پر چلنے والا اجنبی، کوئی وطن میں ٹھہرا ہوا ہے، چلو رات کو ٹھہر گیا وہ بھی ایک درجے میں رہائش ہے، لیکن راہ چلنے والے کی تو رات ہی نہیں ہوتی۔

اور ہمارے فقہاء فرماتے ہیں کہ جنگل میں اِقامت کی نیت ہی صحیح نہیں، اگر کوئی کہے کہ مجھے پندرہ دن جنگل میں رہنا ہے، تو یہ نیت غلط ہے، اس کی نیت ہی صحیح نہیں، وہ مقیم نہیں بنے گا، مسافر ہی رہے گا، اس لئے کہ وہ رہنے کی جگہ ہی صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”.... مَا لِیْ وَلِلدُّنْیَا؟ وَمَا أَنَا وَالدُّنْیَا اِلَّا کَرَاکِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَهَا۔“

(مشکوٰۃ ص:۴۴۲، بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداوٗد)

ترجمہ:...”مجھے دُنیا سے کیا تعلق؟ میری حیثیت تو اس سوار کی ہے کہ چلتے چلتے دوپہر کو کسی درخت کے نیچے سایہ لینے، سستانے کے لئے ٹھہر گیا، پھر چھوڑ کر چل دیا۔“

دِین داری صرف نماز روزے کا نام نہیں ہے:

یہ ہے قصرِ امل یعنی اُمیدوں کا کم کردینا، دِین داری صرف نماز روزے کا نام نہیں ہے، حج اور عمرے کا نام دِین داری نہیں ہے، یہ تو دِین داری کے مظاہر ہیں، دِین داری یہ ہے کہ دُنیا کے اندر تمہیں نہیں رہنا، اس لئے فرمایا گیا ہے کہ دُنیا کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں یہاں رہنا ہے، اور قبر کے لئے اور آخرت کے لئے اتنا عمل کرو جتنا تمہیں وہاں رہنا ہے۔

تو حضرت علیؓ نے کہا: امیر المؤمنین آپ اگر اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہیں تو ایک کام تو یہ کیجئے کہ اپنی اُمیدوں کو کوتاہ کرلیجئے، چھوٹا کرلیجئے۔ یہ نہیں

کہ پاکستان کے حکمرانوں کی طرح جو تخت پر آگیا اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اب مجھی کو ساری زندگی اَمر کرنا ہے، جب تک پاکستان ہے، جب تک میں ہوں، نہیں! نہیں! جب تک پاکستان ہے میں ہی اس کا حکمران ہوں۔ یہ غلط فہمی سب کو ہوجاتی ہے، پھر چاہے پانچ سال بھی پورے نہ کریں۔

شکم سیری سے احتراز:

اور دُوسرا کام یہ کیجئے کہ شبع یعنی پیٹ بھرنا۔ اس سے کم کھایا کیجئے، شکم سیر ہوکر، پیٹ بھر کر نہ کھایا کیجئے، بلکہ تھوڑی سی گنجائش رکھ کر کھایا کیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

"بِحَسْبِ ابْنِ اٰدَمَ اُکُلَاتٌ یُّقِمْنَ صُلْبَهٗ، فَاِنْ کَانَ لَا مَحَالَةَ فَثُلُثٌ طَعَامٌ وَّثُلُثٌ شَرَابٌ وَّثُلُثٌ لِّنَفْسِهٖ۔"

(مشکوٰۃ ص:۴۴۲، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:... "ابنِ آدم کے لئے چند چھوٹے چھوٹے لقمے کافی ہیں، جو اس کی کمر کو سیدھا رکھیں، اور اگر بہت ہی کھانا ہو تو ایک تہائی پیٹ روٹی سے بھرو، ایک تہائی پانی سے بھرو، اور ایک تہائی پیٹ سانس کے لئے رہنے دو۔"

زیادہ کھانے سے آدمی صحت مند نہیں ہوتا، لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے۔

ہمارے حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ افریقہ تشریف لے گئے تو وہاں فرمایا کہ: وہاں وہ لوگ بہت کھاتے ہیں، کھلاتے بھی بہت ہیں، مسکراکر فرمایا کہ: لوگ جینے کے لئے روٹی کھایا کرتے ہیں، لیکن افریقہ والے مرنے کے لئے روٹی کھاتے ہیں۔

تو دُوسری بات یہ ہے کہ پیٹ کا حدودِ اَربعہ ناپ لیجئے کہ معدہ شریف اتنا

ہے، اور یہ دیکھئے کہ اتنے سے یہ بھر سکتا ہے، بھرنے سے کم کھایا کریں۔

لنگی چھوٹی کرنا:

تیسری بات یہ ہے کہ لنگی ذرا چھوٹی پہنیں۔ ہمارے پنجاب کے چودھری، جیسا کہ میں نے بتایا تھا نا! کہ لنگی پہنتے ہیں، لیکن دو ہاتھ پیچھے لٹکتی ہے اور سڑک کو جھاڑو دیتی ہوئی جاتی ہے، عرب بھی لنگی پہنتے تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی لنگی پہنا کرتے تھے، البتہ شلوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمائی اور اس کو پسند فرمایا، اور ایک روایت میں ہے کہ:

”.... فَجَاءَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْشِیْ فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِیْلَ فَبِعْنَاہُ .....“

(مشکوٰۃ ص:۲۵۳، بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:... ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ نے بھاؤ کیا، پھر آپ نے شلوار خرید بھی فرمائی۔“

لیکن کسی روایت سے پہننا ثابت نہیں۔ بہرکیف! لنگی آپ پہنئے، لیکن چھوٹی ہو، یعنی ٹخنوں سے اُونچی ہو۔

حضرت خریم اسدی رضی اللہ عنہ جو قبیلہ بنو اسد کے تھے، صحابی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مجلس میں بیٹھے بیٹھے فرمایا:

”.... نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَیْمُ الْأَسَدِیُّ لَوْ لَا طُوْلُ جُمَّتِہٖ وَاِسْبَالُ اِزَارِہٖ، فَبَلَغَ ذٰلِکَ خُرَیْمًا فَأَخَذَ شَفْرَۃً فَقَطَعَ بِھَا جُمَّتَہٗ اِلٰی اُذُنَیْہِ وَرَفَعَ اِزَارَہٗ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْہِ۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۸۲)

ترجمہ:... ”خریم اسدی بہت اچھا آدمی ہے، لیکن کاش!

کہ اس کی زُلفیں زیادہ بڑی نہ ہوتیں اور چادر زیادہ نیچے نہ ہوتی، یعنی لنگی زیادہ نیچے نہ ہوتی۔ سبحان اللہ! خریم اسدیؓ کو اس سے زیادہ کیا چاہئے تھا، "نِعمَ الرَّجُلُ" کا خطاب مل گیا کہ بہت اچھا آدمی ہے، انہوں نے سنا تو گھر گئے اور کانوں کی لَو تک بال کٹوادیئے، یعنی پٹھے بنوالئے اور اپنی لنگی آدھی پنڈلی تک کرلی۔"

ساری عمر پھر اسی طرح گزری۔ ان کا ایمان اس طرح بنا تھا کہ ایک دفعہ اشارہ ہوجانا کافی تھا، حکم نہیں، حکم تو حکم ہوتا ہے، اشارۂ ابروئے چشم، آنکھوں کا اشارہ بھی ان کے لئے کافی ہوجاتا تھا۔

تو لنگی چھوٹی کرو، کتنی کرو؟ مؤمن کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہوتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"....اِزَارَۃُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْہِ لَا جُنَاحَ عَلَیْہِ .... فِیْمَا بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ، وَمَا أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ فَفِی النَّارِ۔" (مشکوٰۃ ص:۳۷۴، بحوالہ ابوداؤد، ترمذی)

مؤمن کی لنگی آدھی پنڈلی تک ہوتی ہے، اور اس کا کوئی گناہ نہیں، آدھی پنڈلی سے لے کر ٹخنوں کے درمیان رہنے تک اگر ٹخنوں سے اُوپر رہے تو کوئی گناہ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر ٹخنوں سے نیچے لنگی چلی گئی تو وہ دوزخ میں ہے۔ لنگی اکیلی دوزخ میں نہیں جائے گی، وہ تمہیں بھی ساتھ لے کر جائے گی۔

تو تیسرا کام یہ کیجئے کہ لنگی چھوٹی کیجئے۔

قمیص کو پیوند لگانا:

اور چوتھا کام یہ کیجئے کہ قمیص کو پیوند لگایئے، کُرتے کو پیوند لگایئے، جب تک کہ کُرتے کو پیوند نہ لگ جائیں، اس کو پُرانا نہ سمجھئے۔

میں نے بتایا تھا کہ جس دن حضرت عمرؓ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں، اس دن امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کُرتے مبارک کو چودہ پیوند لگے ہوئے تھے، جس میں تین یا چار چمڑے کے پیوند تھے، کپڑے کو چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا، یہ مسلمانوں کا امیر المؤمنین جارہا ہے اور پادریوں کے مطالبے پر جارہا ہے، اپنی نمائش کرانے کے لئے نہیں۔ پادریوں نے حضرت عمرؓ کو دُور سے دیکھ کر کہا کہ اگر دمشق کا فاتح یہی ہے تو ہم لڑائی کے بغیر دروازہ کھول دیں گے، اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تم ہزار ٹکریں مارتے پھرو، تم دمشق کو فتح نہیں کرسکتے، بیت المقدس کو فتح نہیں کرسکتے۔

جوتا گانٹھنا:

اور پانچواں کام یہ کیجئے اپنا جوتا گانٹھ لیا کیجئے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاغل گھر میں آنے کے بعد کیا ہوتے ہیں؟ فرمانے لگیں:

".... كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ، يَفْلِيْ ثَوْبَهٗ وَيَحْلِبُ شَاتَهٗ وَيَخْدِمُ نَفْسَهٗ۔" (شمائل ترمذی ص:۲۴، ۲۵)

ترجمہ:... "آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان تھے، آپ اپنا کپڑا سلائی کرلیتے تھے، اور بکری کا دُودھ نکال لیتے تھے، بکری دوہ لیتے تھے، اور اپنی ضروریات بدستِ خود پوری فرمالیتے تھے۔"

یہ پانچ کام ہوگئے، امیر المؤمنین ان پانچ نمبروں پر عمل کیجئے، اِن شاء اللہ آپ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ جاملیں گے۔

خلاصہ یہ کہ:

۱:...امیدیں کم کرنا۔

۲:...بھوک سے کم کھانا۔

۳:...لنگی چھوٹی پہننا۔

۴:...قمیص کو پیوند لگانا۔

۵:...جوتے خود گانٹھ لینا۔

میرا ذوق:

میری شلوار درزیوں کے پاس جاتی ہے تو درزی لوگ مذاق کرتے ہیں کہ کسی بچے کی شلوار لے آئے ہو، میرے بچوں کی شلواریں مجھ سے بڑی ہیں، لیکن پھر وہ زبردستی نیچا کردیتے ہیں، میں ہرموقع پر کہہ کر بھیجتا ہوں کہ ایک اِنچ کم رکھنا، اگر میری نصیحت پر عمل ہوتا تو اب تک گھٹنوں تک آگیا ہوتا، مگر وہ میری سنتے نہیں، اور اس کا اثر یہ ہے کہ مجھے اُوپر کرکے باندھنا پڑتا ہے، جی چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاجامے، شلواریں آدھی پنڈلی تک ہوں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی محبوب تھا، اور یہی ان کا عمل تھا، محبوب کا نقشہ یہ ہے، لیکن خیر اِجازت ہے، لیکن ٹخنوں سے نیچے پہننا تو خالص کبر ہے جو میں بتا ہی چکا ہوں۔

پیوند کا بدل:

اِزار کہو، شلوار کہو، پاجامے کہو، یا پینٹ کہو، پینٹ پہننا ویسے ہی گناہ ہے، کیونکہ تم لوگ صرف انگریزوں کی مشابہت کے لئے پہنتے ہو، پینٹ پہننا مکروہِ تحریمی ہے، باقی سرد علاقے کے لوگ اپنا گرم لباس بنالیں تو ان کو یہ مناسب ہے، لیکن تم یہاں بیٹھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سرد علاقے کے لوگوں کو تو پینٹ پہننا لازم ہوگا، میں وہاں بھی گیا ہوں، ان کے لباس بھی دیکھے ہیں، ان کے ہاں بھی یہ چیزیں کوئی لازم نہیں، یہ تمہارا اِحساسِ کہتری ہے، اور قمیصوں کو پیوند لگاؤ، اب بھئی اس سنت پر عمل

نہیں ہوسکتا، میں خود اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتا ہوں، اس کا پھر بدل یہ ہے کہ ایک نیا کپڑا بنے تو دُوسرا دے دو، میرے گھر والے ایک دن کہنے لگے کہ: تم نیا جوتا اور نئے کپڑے بہت پہننے لگے ہو۔ میں نے کہا کہ: ایک بزرگ تھے اللہ تعالیٰ ان کو ہر روز نیا لباس پہناتے تھے، نیا جوتا پہناتے تھے، تو میں خرید کر نہیں لاتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ مجھے روزانہ جوتوں اور کپڑوں کا نیا جوڑا پہنایا کریں تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ دیتے رہو جو اُتر جائے وہ دیتے رہو، اور یہی مسئلہ جوتے گانٹھنے کا بھی ہے۔

لطیفہ:

جوتے گانٹھنے پر مجھے لطیفہ یاد آیا، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی نوّر اللہ مرقدہٗ جو ہمارے پیر و مرشد ہیں، وہ سناتے تھے کہ بھئی ایک دن ہمارا جوتا ٹوٹ گیا تو ہم نے بنانے کے لئے موچی کو دیا، ہم بھی وہاں اتنی دیر کھڑے رہے، تو وہ اس کے ٹانکے بہت بڑے لگا رہا تھا، میں نے کہا: میاں! چھوٹے چھوٹے ٹانکے لگاؤ۔ تو مجھے بگڑ کے کہنے لگا: میاں! کبھی جوتا گانٹھا بھی ہے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اس کی یہ بات سن کر مجھے بڑا مزہ آیا، جوتے گانٹھنے کا کام بھی جانتے ہو؟ پھر اس نے بتایا کہ یہ جو پُرانا جوتا ہوتا ہے، ان کے ٹانکے چھوٹے چھوٹے نہیں لگتے، کیونکہ چمڑا گل جاتا ہے اور دھاگہ یعنی ڈور جوتے کے چمڑے کو کاٹ دیتی ہے، اس کے ٹانکے بڑے بڑے لگائے جاتے ہیں۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ: بھئی جوتے گانٹھنا بھی ایک فن ہے، اور یہ بھی اُستاذ سے سیکھنا پڑتا ہے۔

مال، اولاد نہیں، علم زیادہ ہو:

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دُوسرا ارشاد ہے کہ خیر یہ نہیں کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو، بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہارا حلم بڑھتا رہے۔ علم کے ساتھ حلم، جتنا علم بڑا ہو اتنا حلم بھی بڑا ہو۔

مال کی زیادتی فضلِ اِلٰہی نہیں:

عام طور پر لوگ کسی سے پوچھیں گے: تمہارا کیا حال ہے؟ کہتا ہے کہ: ’’بڑا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے!‘‘ کیا فضل ہے؟ نماز کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، زکوٰۃ، حساب کرکے دینے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی، حج سالہا سال سے فرض ہے اس کی کبھی توفیق نہیں ہوئی، زمین پر زمین خرید رہے ہیں، کارخانے پر کارخانے بنا رہے ہیں، فیکٹریوں پر فیکٹریاں بنا رہے ہیں، دُکانوں پر دُکانیں بنا رہے ہیں، اور بچے پیدا کر رہے ہیں، اور جب پوچھا جائے تو کہتے ہیں کہ: ’’اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے!‘‘ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے، اس سے انکار نہیں کہ یہ دُنیا کی نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اس پر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و اولاد دے کر اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائی، اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ورنہ ہندوؤں کے پاس، سکھوں کے پاس، چوڑھوں کے پاس، عیسائیوں کے پاس، یہودیوں کے پاس، اور لامذہب قوموں کے پاس پیسہ تم سے زیادہ ہے، تمہارے پاس پاکستانی روپیہ ہے، ان کے پاس ڈالر ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضل تھا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا، کندھے پر ایک چادر اور ہاتھ میں ایک عصا تھا، اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اور قارون جس کے خزانوں کو قرآنِ کریم کے مطابق خزانے کی کنجیوں کو ایک بڑی جماعت نہیں اُٹھا سکتی تھی:

’’اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓأُ بِالْعُصْبَةِ اُولِی الْقُوَّةِ۔‘‘ (القصص:۷۶)

ایک طاقت ور جماعت سے مراد ایک اُونٹوں کی جماعت مراد ہے، اتنے خزانے تھے کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں اُونٹوں کی جماعت پر لادی جاتی تھیں، تو ان کو تھکا دیتے تھے۔ اتنا خزانہ، اتنا مال، کیمیاگری حاصل کرلی تھی اس بدبخت نے،

حضرت جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کی سم سے کہ نیچے سے مٹی اُٹھالی تو اس کے ذریعے سے اس کو کیمیا گری حاصل ہوئی ہے، کوئی بوٹی مل گئی ہوگئی، سونا بنانا جانتا تھا، سیٹھ ہوگیا اور اتنا بڑا سیٹھ، اس پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں تھا، اللہ تعالیٰ کا فضل موسیٰ علیہ السلام پر تھا۔

تو امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: خیر کثرتِ مال کا نام نہیں بلکہ کثرتِ علم اور حلم کے زیادہ ہونے کا نام ہے۔

لڑائی جھگڑا کرنا مؤمن کی شان نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:
’’جو شخص علم اس واسطے حاصل کرتا ہے کہ علماء کے ساتھ بحث مباحثہ کیا کرے گا، یا احمقوں کے ساتھ جھگڑا کرے گا، یا یہ کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیرے گا...یعنی علم پڑھ کے تقریریں کیا کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ بڑا آدمی ہے، ماشاء اللہ! بڑی اچھی تقریر کرتا ہے... اس شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم میں ڈالیں گے، (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!)۔‘‘

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

گفتگو اس میں چل رہی تھی کہ لڑائی جھگڑا کرنا، بحث مباحثہ کرنا مؤمن کی شان نہیں ہے۔

لوگوں کی تین قسمیں:

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: لوگ دو قسم کے ہیں، ایک شخص تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہے، آخرت کو چاہنے والا ہے، تو یہ شخص تمہارے راستے پر چلنے والا ہے، اس کے ساتھ تو تمہاری ردّ و کد نہیں ہونی چاہئے، جس راستے پر تم چل رہے ہو اسی راستے پر یہ بھی چل رہا ہے، جہاں تم جانا چاہتے ہو، یہ بھی وہاں یہ جانا چاہتا ہے، جس سے تم ملنا چاہتے ہو اسی سے یہ بھی ملنا چاہ رہا ہے، تو اس کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہونا چاہئے۔

دُوسرا آدمی وہ ہے جو اس کے برعکس دُنیا کا طالب ہے، اس کی رغبت دُنیا کی چیزوں میں ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا میں اس کی رغبت نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اَجر وثواب ہے، وہ اس کے سامنے نہیں، اگر وہ شخص تمہارے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتا ہے تو اس کے ساتھ بھی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اس پر شفقت اور رحمت ہونی چاہئے کہ یہ غریب فتنے میں مبتلا ہے، ایک آفت اور مصیبت میں گرفتار ہے، اور اس کا لڑائی جھگڑا کرنا اس کے نفس امّارہ کی شرارت کی وجہ سے ہے، تو ایسا شخص تو تمہارے لئے لائقِ رحم ہونا چاہئے، نہ کہ تم کو اس پر غصہ آئے۔

جسمانی مریض کی طرح رُوحانی مریض:

بھائی! کسی آدمی کے ظاہری بدن پر کوئی عیب ہو، کوئی بیماری ہو، کوئی تکلیف ہو، ظاہر ہے کہ ہمیں اس پر رحم آیا کرتا ہے، خدانخواستہ کوئی شخص کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہے، خدانخواستہ کسی کے ناسور ہوگیا ہے، جس سے ہر وقت پیپ بہتی رہتی ہے یا اسی قسم کا کوئی اور مرض ہے تو اس کو دیکھ کر ہمیں اس پر غصہ آئے گا یا اس پر رحم آئے گا؟ ظاہر بات ہے کہ عقل مند کو کبھی غصہ نہیں آئے گا، بلکہ رحم آئے گا، اب اسی مثال کو سوچ لیجئے کہ اگر کوئی شخص باطنی بیماری میں مبتلا ہو، یعنی ظاہری جسم کا کوڑھی نہ ہو، بلکہ باطنی کوڑھی ہو، اس کے باطنی ناسور ہو، یعنی اس کے باطن میں ایسی کوئی تکلیف ہو، تو جس شخص کی نظر اس کی بیماری پر ہوگی، وہ اس پر ترس کھائے گا کہ بے چارا غریب کس بیماری میں مبتلا ہے۔

تو شیخ فرماتے ہیں کہ: تم کو اس پر بھی غصہ نہیں آنا چاہئے، بلکہ اس پر رحم آنا چاہئے۔

اپنے ہم سفر سے لڑائی:

پہلی قسم جو ذکر کی تھی، یعنی وہ شخص جو اپنے مولیٰ کی رضامندی کا طالب ہے، آخرت کے اجر وثواب کو چاہنے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے والا ہے، تو اس کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ تم اور وہ ایک ہی راستے کے مسافر ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس میں بھی جھگڑا کرتے ہیں، چنانچہ بعض دفعہ مسجد میں لڑائی ہوجاتی ہے اور بعض دفعہ بیت اللہ میں لڑائی ہوجاتی ہے، لوگ طواف کر رہے ہوتے ہیں، مثلاً ایک آدمی لوگوں کو ہٹا کر خود آگے بڑھ رہا ہے، بیت اللہ شریف کے ملتزم پر پہنچنے کے لئے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ رہا ہوتا ہے، بڑے دُکھ کی بات ہے اور بڑی جہالت کی بات ہے۔ ارے کس کے پاس جا رہے ہو؟ کیا وہ

تمہیں یہاں نہیں دیکھ رہا؟ بھلا تم کمزوروں کو اور دُوسروں کو دھکے دے کر اور پیچھے ہٹا کر آگے بڑھو گے تو تم زیادہ ثواب حاصل کرلوگے؟ معلوم ہوا کہ اس بے چارے کی حقیقت پر نظر نہیں ہے ورنہ وہ یہ کام نہ کرتا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کا شعر ہے کہ:

اگرچہ کوچۂ جاناں میں بھی پھر پھر کے سر مارا
نہ دیکھا یار کو، گھر بار کو دیکھا تو کیا دیکھا؟

کیا تم وہاں پتھروں کو دیکھنے کے لئے جاتے ہو؟ یا مسجد میں سے کسی چیز کے لئے آتے ہو؟ اگر اس پاک ذات کی رضا کے لئے آتے ہو جس کے گھر میں آرہے ہو تو یہ دیکھو کہ ہمارے اس عمل سے وہ راضی ہو رہا ہے یا ناراض ہو رہا ہے؟ تم اس کو دِکھانا چاہتے ہو کہ کتنے بڑے صوفی ہیں ہم؟

اسی طرح ایک آدمی نے مسجد میں اپنی جگہ روکی ہوئی ہے، وہ وضو کرنے کے لئے گیا، دُوسرا آدمی آیا اس نے اس کا رُومال یا مصلّٰی اُٹھالیا اور خود نیت باندھ کے کھڑا ہوگیا، ماشاء اللہ! یہ صفِ اوّل کا ثواب حاصل ہو رہا ہے، ارے جس کی خاطر تم صفِ اوّل میں کھڑے ہو، کیا اس کو معلوم نہیں ہے کہ تم کب آئے تھے؟ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ حقیقت ناشناسی کی وجہ سے اب ایک ہی راستے کے جو مسافر ہیں، ان میں بھی لڑائی ہو رہی ہے، حاجیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، نمازیوں میں لڑائی ہو رہی ہے، اِعتکاف والوں میں لڑائی ہو رہی ہے اور خدا کے گھر میں لڑائی ہو رہی ہے، کس بات پر؟ اور کیوں لڑائی ہو رہی ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ حقیقت شناس نہیں ہیں، نہیں بھائی! ان کے ساتھ کوئی لڑائی نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے کا واقعی مسافر ہو اور جس کے سامنے واقعی منزلِ لیلیٰ ہو، اس سے لڑائی نہیں کرنی چاہئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہم لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں، اس لئے ہم نے ان چیزوں کو مقصود سمجھ لیا ہے، بھائی! ہماری تمام تگ و دو سے مقصود حق تعالیٰ شانہٗ کی رضا حاصل

کرنا ہونا چاہئے! بے شک آپ سات حج کرلیں لیکن اگر رضائے مولیٰ حاصل نہ ہو تو خاک ہیں، اور اگر رضائے مولیٰ یہیں بیٹھے حاصل ہوجائے تو حج فرض ہی نہیں ہے، جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اسی لئے فرماتے ہیں کہ:

اے قوم! باز رفتہ، کجا روید کجا روید
محبوب شما اینجا است بیاید ، بباید

ترجمہ:... ”اے وہ لوگو جو حج کے لئے جارہے ہو! کہاں جارہے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟ تمہارا محبوب تو یہیں ہے یہیں آجاؤ۔“

میرا مقصود حج وعمرے کی نفی کرنا نہیں ہے، وہ بلاتے ہیں تو ضرور جائیں:

اجازت ہو تو آکر میں بھی شامل ان میں ہوجاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہوگا

عاشقوں کا ہجوم ہورہا ہے تو ہر مؤمن کی خواہش ہوتی ہے کہ ان میں شامل ہوجائے، شاید اس کا بھی عاشقوں میں نام لکھا جائے، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب کا یہ شعر ہے:

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ ان کو یاد آجاتا ہوں میں

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تو بہت اُونچی چیز ہے، اللہ تعالیٰ کسی کو سعادت عطا فرمائے، اس سے بڑی دولت اور کیا ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنے دروازے پر بلائے، محبوب آنے کی خود دعوت دے تو ضرور آؤ۔

محبوب کا بلاوا:

ہمارے حضرت قاری رحیم بخش صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ تھے، ہمارے

خیرالمدارس کے اُستاذ تھے، ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے، مجھ سے بہت ہی شفقت فرماتے تھے، بہت ہی محبت فرماتے تھے، حد سے زیادہ، ان کے داماد ...مولانا قاری محمد یٰسین صاحب... یہاں کراچی میں ہوتے ہیں، وہ مجھے بتا رہے تھے کہ ایک دن حضرت قاری صاحب ملتان سے تشریف لائے، مجھے کہنے لگے کہ حج کے لئے جانا ہے، آخری جہاز جاچکا تھا، میں نے کہا: حضرت! آپ کس طرح جائیں گے؟ جہاز تو چھوٹ چکا ہے، اب کوئی جہاز نہیں ہے۔ فرمایا: میں نہیں جانتا ہوں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی ہے اور فرما رہے ہیں کہ تم اس دفعہ آ نہیں رہے ہو؟

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ ان کو یاد آجاتا ہوں میں

جب سے خواب میں آپ کا یہ فرمان سنا کہ: ''اس دفعہ تم نہیں آرہے؟'' اس وقت سے میں بے تاب ہوگیا ہوں اور پاسپورٹ لے کر آگیا ہوں، میں نہیں جانتا اس بات کو۔ ان کے داماد کہنے لگے کہ میں نے کہا: اچھی بات ہے، میں نے پاسپورٹ اُٹھایا، حج افسر کے پاس چلا گیا، شاید قاری صاحب کو بھی ساتھ لے لیا، اور یہ کہا کہ: ہمارے یہ بزرگ حج پر جانا چاہتے ہیں، اس کے منہ سے نکلا کہ ضرور جائیں گے، بعد میں وہ افسر خود کہہ رہا تھا کہ میں نے خود کیسے کہہ دیا یہ ضرور جائیں گے، تمام دفاتر بند ہوچکے ہیں، جہاز جاچکا ہے، کیسے جائیں گے؟ اور عجیب بات یہ ہے کہ اگلے دن جمعہ تھا، چھٹی تھی، حج افسر نے اسی وقت انتظامات کئے، فوراً کاغذات بنائے گئے، سارے کے سارے اور بینک کے ذریعے جو معاملات تھے وہ پورے کئے گئے اور پورے کاغذات ایک گھنٹے میں مکمل کردیئے، اب جائیں کیسے؟ اللہ تعالیٰ کی شان کہ ایک مستقل جہاز تیار ہوا جانے کے لئے، اس سے بڑھ کر سعادت اور خوش نصیبی اور کیا ہوسکتی ہے کہ محبوب خود بلاتے ہیں کہ چلو! لیکن یہ تو عشق و محبت کی لائن ہے، لڑائی

جھگڑے کی لائن تھوڑی ہے، نہ نمود و نمائش کی لائن ہے، نہ لڑائی جھگڑے کی لائن ہے، مجھے بہت اذیت ہوتی ہے جب میں نمازیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نماز میں صفوں پر لڑتے ہوئے دیکھتا ہوں، اور جب حاجیوں کو سفرِ حج میں لڑتے ہوئے دیکھتا ہوں، اتنی اذیت ہوتی ہے کہ کچھ نہ پوچھو مجھ سے، کیا کہوں اللہ تعالیٰ کے بندے تم کس کے لئے آئے ہو؟

ایک عارف فرماتے ہیں کہ: اگر عشق کے راستے میں عشق کے بیابان میں چل رہے ہو اور کیکروں کے کانٹے تمہارے پاؤں میں چبھ رہے ہیں تو پروا نہ کرو، اس لئے کہ جو شخص اس منزل کو قطع کرتا ہے اس کو یہ بھی برداشت کرنا ہوگا، اگر تو تم عشق کے راستے پر چل پڑے ہو تو عاشق بن کے دِکھاؤ، کوئی ایذا پہنچے تو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرو، یہ سمجھو کہ یہ سب کچھ محبوب کے راستے میں مل رہا ہے، جو کچھ بھی مل رہا ہے، قبول ہے، ارے مجنوں تو پتھر کھانے والے کو کہتے ہیں، لوگ اس کو دیوانہ کہتے ہیں، اور پتھر مارتے ہیں، تم نے بھی مجنونانہ کپڑے پہن لئے ہیں، سلے ہوئے کپڑے اُتار کر دو چادریں پہن لیں ہیں، لیکن اندر سے بھی مجنوں بن کر کے دِکھاؤ نا! نقشہ تو مجنوں اور دیوانوں کا بنالیا ہے حقیقت بھی بنا کے دِکھاؤ نا:

ٹکتے نہیں ایک جا عاشقِ بدنام کہیں
دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

یہ مارے مارے پھرتے ہو! اور دو چادریں پہن کر نعرے مارتے پھرتے ہو لبیک کے، یہ ساری ادائیں تو عاشقوں کی ہیں، لیکن اندر سے بھی تو عاشق بنو نا! اندر سے وہی کچھ رکھا ہوا ہے، عاشق تو اپنی خواہشات کو ترک کردیا کرتا ہے، اس کے پاس اپنی خواہش نہیں ہوتی، محبوب کا وصال ہی اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے، مال جائے، عزت جائے، آبرو جائے، وقار جائے، اس کو کوئی پروا نہیں ہوتی، گھربار لٹ جائے، اس کو کوئی پروا نہیں، بس وصالِ محبوب ہونا چاہیئے۔

جس کو ہو جان و دِل عزیز!

بہت دنوں کی بات ہے، ایک دفعہ حرم شریف میں بیٹھا تھا، ایک صاحب کسی کرنل کو ساتھ لے کر آئے، آج کل لوگوں کو بال رکھنے کا بھی مرض ہے نا! بیماری ہے بال رکھنے کی، چنانچہ وہ حج و عمرے کے بعد بھی بال نہیں مونڈتے بلکہ دو چار بال اِدھر سے کتر دیئے، دو چار بال اُدھر سے کتر دیئے۔ تو وہ صاحب جو کرنل صاحب کے ساتھ تھے کہنے لگے کہ چلو مولوی صاحب کے پاس مسئلہ پوچھتے ہیں کہ تمہارا اِحرام نہیں کھلا، وہ ان کو میرے پاس لے آئے، تو میں نے کہا کہ: بھائی! اس سے اِحرام نہیں کھلتا، بہتر تو یہ ہے کہ اِحرام کھولنے کے لئے آدمی سر پر اُسترا پھروائے، اور سر کا حلق کروائے، اور یہ نہ ہو تو کم از کم ایک پور برابر پورے سر کے بالوں کو قینچی سے کاٹ لے، جس کو قصر کہتے ہیں، اور ہمارے اِمامؒ کے نزدیک اگر چوتھائی سر کے بال کاٹ لئے جائیں تو اِحرام کھلے گا، اور اگر چوتھائی سر سے کم بال کاٹے گا تو اِحرام نہیں کھلے گا۔ تو کرنل صاحب فرمانے لگے کہ: جی اتنی تنگ نظری نہیں ہونی چاہئے! مجھے غصہ آگیا، تو میں نے کہا: تمہیں کس حکیم نے کہا تھا یہاں آنے کو؟ تمہیں کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا یہاں آنے کا؟ عمرے کے لئے آنے کا؟ اور میں نے غالب کا شعر پڑھا:

ہاں! ہاں! نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان و دِل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟

تمہیں اپنے بالوں سے ایسی محبت تھی تو یہاں کیا لینے آئے تھے؟ کس نے کہا تھا کہ تم آؤ یہاں؟ اپنے بال بھی ساتھ لے کر پھر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کی شان کہ یہ عاشق ہیں، حج و عمرہ کے لئے جارہے ہیں، سبحان اللہ! داڑھی مونڈی ہوئی ہے اسی طرح مونڈی رہے گی اور ہمیشہ مونڈی رہے گی میں حلفاً کہتا ہوں کہ ان کا حج نہیں

ہوتا، جو داڑھی مونڈ کر جاتے ہیں اور واپس آکر بھی منڈاتے ہیں، میں حلفاً کہتا ہوں کہ ان کا حج نہیں ہوتا، ان کا حج مردود ہے، یہ لوگ پیسے ضائع کرتے ہیں، کیا اس کو حج کہتے ہو؟ کہ وہاں بھی اپنی خواہشات کا ساتھ دیتے ہو، اور یہاں واپس آکر بھی! اللہ تعالیٰ کے گھر کو جاکر ناپاک کرتے ہو، یہ حج وعمرہ نہیں ہے، پیسے مت ضائع کرو، اگر وہاں جانا ہے تو عاشق بن کر جاؤ اور عاشق کی کوئی رائے نہیں ہوتی، عاشق اپنے آپ کو مٹادیتا ہے، اپنے آپ کو مٹا کر جاؤ، جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑ نہیں لگا تو کسی اور کے ساتھ کیا جوڑ لگے گا؟ اس لئے یہ آپس میں لڑتے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی، معلوم ہوا کہ ایک راستے کے مسافر نہیں بنے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہے، تم بھی رضائے اِلٰہی کے طالب ہو وہ بھی رضائے اِلٰہی کا طالب ہے، ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں، اس سے تمہاری کیا لڑائی جھگڑا ہے؟ اگر وہاں جانا ہے تو گناہوں کو چھوڑ کر جاؤ اپنے سے نکل جاؤ، اپنی خواہشات کو چھوڑ کر جاؤ، ورنہ چل کرکے آجاؤ گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ایک وقت آئے گا کہ میری اُمت کے کھاتے پیتے لوگ سیر وتفریح کے لئے حج کیا کریں گے، تاجر پیشہ لوگ تجارت کے لئے اور فقراء بھیک مانگنے کے لئے۔

طالبِ دُنیا سے لڑائی:

اسی طرح دُوسری قسم کا وہ آدمی جو دُنیا کا طالب ہے اور تم تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب ہو، اس کے ساتھ بھی تو تمہارا جھگڑا نہیں ہونا چاہئے، اور اگر تمہارا اس کے ساتھ جھگڑا ہو رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے تم بھی اسی لائن کے آدمی ہو، جس لائن کا وہ ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ میں نے اپنے اُستاذ سے شکایت کی کہ مدرسہ کے طالب علم مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ تو میرے اُستاذ نے ...اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے... بڑے اطمینان کے ساتھ فرمایا کہ: بیٹا! کوئی بات نہیں ہے، کم از کم دونوں ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں، وہ بھی جہنم کے راستے پر چل رہا ہے، تم بھی جہنم کے راستے پر چل رہے ہو، وہ حسد کے ذریعے جہنم کے راستے پر چل رہے ہیں، تم غیبت کے ذریعے جہنم کے راستے پر چل رہے ہو، خیر سے دونوں پہنچیں گے، تو اگر کوئی طالبِ دُنیا ہے اور بیچارہ طلبِ دُنیا کی وجہ سے مبتلائے فتنہ ہے، اور تم اس سے ٹکراتے ہو تو معلوم ہوا کہ تم بھی اسی لائن کے آدمی ہو، دونوں چشمِ بدڈور ایک ہی لائن پر چل رہے ہیں، اس کے بعد شیخؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لَا تُمَارِ أَخَاکَ وَلَا تُمَازِحْهُ وَلَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ۔“ (ترمذی ج:۲ ص:۲۰)

ترجمہ:... ”اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو جھگڑا کرو اور نہ اس سے وعدہ کرکے وعدہ خلافی کرو۔“

یعنی اپنے بھائی سے نہ جھگڑو اور نہ وعدہ خلافی کرو، یا تو وعدہ ہی نہ کرو، اگر وعدہ کیا ہے تو اس کو نبھاؤ، وعدہ خلافی نہ کرو۔

حرام کام کے وعدے کی تکمیل؟

وعدے کے متعلق ایک بات یاد رہنی چاہئے کہ بعض لوگ غلط بات کا وعدہ کرلیتے ہیں، یا آپس میں غلط کام، گناہ کی بات اور ناجائز معاملے کا معاہدہ کرلیتے ہیں، ایسا معاہدہ کرنا، یا ایک دُوسرے سے وعدہ کرنا حرام اور ناجائز ہے، ایسے ہی اس کا نبھانا بھی حرام ہے، اگر کسی نے وعدہ کرلیا ہے تو اس وعدے کو توڑا اور ختم کیا

جائے، مطلب یہ کہ اگر کسی سے غلط بات کا وعدہ کیا ہے تو اس غلط وعدے کو پورا نہیں کیا جائے گا۔

ایک صاحب نے مجھے خط لکھا کہ میں نے ایک لڑکی کے ساتھ قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا تھا کہ ہم دوسری جگہ شادی نہیں کریں گے، کیا ہم اس وعدے کو نبھائیں یا توڑیں؟ ارے بھائی! اس غلط وعدے کو پورا نہیں کیا جائے گا، اب وعدہ خلافی ہوتی ہے تو ہونے دو، تم کو کس حکیم نے کہا تھا کہ وعدہ کرو؟ ایسا وعدہ کرنا ناجائز ہے، یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔ غرض اس قسم کے ناجائز وعدوں کا پورا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

وعدہ خلافی نفاق کی علامت:

دُوسری بات یہ کہ تم نے اپنے بھائی سے کسی جائز چیز کا وعدہ کیا، مگر وعدہ کرتے وقت یہ نیت کی کہ میں نے پورا تو کرنا نہیں ہے، بس ٹال دو کہ ہاں کریں گے اِن شاء اللہ گویا وعدہ کرتے وقت ہی پورا کرنے کی نیت نہیں تھی محض دھوکا دینا مقصود تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں کہ وہ جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں تو وعدہ کرتے وقت ہی ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ مجھے پورا تو کرنا نہیں، اس وقت اس کو ٹالو، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین علامتوں میں سے ایک علامت بیان فرمایا ہے۔

منافق کی چار علامتیں:

چنانچہ حدیث میں ہے کہ منافق کی چار علامتیں ہیں:

”عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: أَرْبَعٌ مَّنْ کُنَّ فِیْہِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنْھُنَّ کَانَتْ فِیْہِ خَصْلَۃٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَھَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا

حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا عَاھَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۷)

ترجمہ:... ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چار خصلتیں ایسی ہیں، جس شخص میں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان خصلتوں میں سے کوئی ایک پائی جائے تو جب تک اس کو چھوڑ نہ دے تو وہ بھی نفاق کے ایک درجے پر ہے، جب امانت دیا جائے تو وہ خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کوئی وعدہ کرے تو دھوکا دے اور جب جھگڑا کرے تو گالم گلوچ کرے۔“

منافق کی تین نشانیاں:

اسی طرح ایک دُوسری روایت میں منافق کی تین علامتوں کا ذکر ہے:

”اٰیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۷، متفق علیہ)

ترجمہ:... ”منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے، اور جب امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے۔“

بلاقصد وعدہ خلافی کا حکم:

اگر وعدہ کرتے وقت کسی کی پکی نیت تھی کہ اِن شاء اللہ اس کام کو کرنا ہے، لیکن بعد میں کوئی ایسا عذر پیش آ گیا جس کی بنا پر وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا، یعنی واقعی

صحیح عذر پیش آ گیا، مثال کے طور پر جیسے کوئی بات کہی پھر یاد نہیں رہی، یا کوئی دوسرا مانع یا ایسی رُکاوٹ آ گئی کہ وعدہ پورا نہ کرسکا تو اکابر فرماتے ہیں کہ اس شخص کو وعدہ خلافی کا گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ یہ وعدہ خلافی خود اس کی طرف سے نہیں ہوئی ہے، قدرتی طور پر، من جانب اللہ صورت ہی ایسی پیش آ گئی کہ یہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا، تو یہ جو فرمایا کہ اپنے بھائی سے وعدہ نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وعدہ کرکے وعدے کی خلاف ورزی کرو، اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے قصد، اپنے ارادے سے وعدہ خلافی نہ کی جائے، لیکن خدانخواستہ اگر کوئی مانع ایسا پیش آ جائے جس کی وجہ سے تم وہ وعدہ نہیں نبھا سکے، یا پورا نہیں کرسکے تو پھر اِن شاء اللہ تم پر مؤاخذہ نہیں ہوگا اور تم اس میں معذور ہوگے۔

جھگڑا کرنا منافق کی علامت:

منافق کی چار علامتوں میں سے ایک جھگڑا کرنا بتلائی گئی ہے، اسی جھگڑے کی نحوست کا بیان ایک اور حدیث میں بھی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

’’مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِیَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْ لِيُمَارِیَ بِهِ السُّفَهَاءَ اَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۳۴ بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:... ’’جو شخص علم اس واسطے حاصل کرتا ہے کہ علماء کے ساتھ بحث مباحثہ کیا کرے گا، یا احمقوں کے ساتھ جھگڑا کرے گا، یا یہ کہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف پھیرے گا ...یعنی علم پڑھ کے تقریریں کیا کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ بڑا آدمی ہے، ماشاء اللہ! بڑی اچھی تقریر کرتا ہے... اس شخص کو اللہ تعالیٰ جہنم میں ڈالیں گے، (نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ!)۔‘‘

علم کا معنی؟

علم کے معنی جاننے کے ہیں، لہٰذا آدمی اپنی حقیقت کو جان جائے اور جس کو یہ حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی حقیقت کو بھی جان جائے، پھر اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو تو کوئی پانہیں سکتا تو اللہ تعالیٰ کا جاننا یہی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی ذات کی معرفت، اس کی صفات کی معرفت، اس کی عظمت و جلال کی معرفت حاصل ہوجائے، تو یہ شخص عالم ہے، اور جس کو اپنی حقیقت کی خبر نہیں، حق تعالیٰ شانہٗ کے جلال و جمال کی اور اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال کی خبر نہیں، وہ بے چارہ عالم نہیں ہے، حرف خواں ہے، ہماری طرح حرف خواں ہے، لفظوں کے اُلٹے سیدھے ترجمے کرلیتا ہے اور بس۔

بے سود حرف خوانی:

بہت سی احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مضمون ارشاد فرمایا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

"…. وَسَيَجِيْئُ بَعْدِىْ قَوْمٌ يُرَجِّعُوْنَ بِالْقُرْاٰنِ
تَرْجِيْعَ الْغِنَاءِ وَالنَّوْحِ، لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ…"

(مشکوٰۃ ص:۱۹۱)

ترجمہ:… "بہت سے لوگ آئیں گے جو قرآنِ کریم پڑھیں گے، لیکن قرآنِ کریم ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔"

یعنی وہ لوگ قرآن پڑھیں گے، لیکن قرآن ان کے گلے سے نیچے نہیں اُترے گا اُوپر ہی اُوپر اور زبان ہی زبان تک رہے گا، اور قرآنِ کریم کے انوار دِل تک نہیں پہنچیں گے، گویا اس کے اثرات گلے سے نیچے اترتے ہی نہیں۔ ایسے لوگ حقیقت میں عالم نہیں ہیں، اس لئے شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ: "سعدی دِل کی تختی کو غیر

حق کے نقوش سے صاف کردو“ دِل کی تختی پر حق کا نقش ہو، باقی جتنے نقوش ہیں ان کو مٹا ڈالو، صاف کردو، دِل کی تختی پر تو بس ایک ہی نقش ہونا چاہئے، اور وہ ہے نقشِ حق، یعنی اللہ تعالیٰ کا نام نقش ہونا چاہئے۔

ذکرِ اِلٰہی کا مقصد:

میرے ایک دوست اللہ کا ذکر کرتے ہیں، یعنی ”اللہ، اللہ“ کرتے ہیں، وہ مجھے بتا رہے تھے کہ ایک دفعہ مجھے منکشف ہوا کہ میرا دِل سامنے ہے اور اس پر سنہری حروف سے لکھا ہوا ہے: ”اللہ“، سبحان اللہ! یہ ہے نقشِ حق اور یہ جو اللہ والے ذکر کرتے ہیں اور ”اللہ، اللہ“ کی ضربیں لگاتے ہیں، یہ دراصل اسی نقش کو پکا کرنے کے لئے اور نقشِ غیرِحق کو مٹانے کے لئے ہوتا ہے، تاکہ دِل کی تختی سے غیرحق کا نقش مٹ جائے، یہ جو ”لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ“ کی ضربیں لگاتے ہیں، یا ”اللہ، اللہ“ کی ضربیں لگاتے ہیں، اس سے بھی صرف یہی مقصود ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں کہ دِل کے اندر اللہ تعالیٰ کا پاک نام بیٹھ جائے، جم جائے، دِل کے اندر اُتر جائے، اور اللہ تعالیٰ کا نام دِل میں آئے گا تو یہ دُوسری چیزیں نکل جائیں گی، بوتل خالی ہو تو اس میں ہوا بھری ہوئی ہوگی، شربت ڈالوگے تو ہوا نکل جائے گی، تو شربت اس کی جگہ لے لے گا۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے دل خالی ہوگا تو اس میں وہ چیزیں ہوں گی جو ہمارے دِل میں ہوا کرتی ہیں، اِدھر کی چیزیں، اُدھر کی چیزیں، اِدھر کے خیالات، اُدھر کے خیالات، اِدھر کی پریشانیاں، اُدھر کی پریشانیاں، یہ افکار، وہ افکار، ہمارا دل کیا ہے؟ پوری کباڑیئے کی دُکان ہے، اللہ تعالیٰ کے بندے اسی کے لئے ذکر بتاتے ہیں تاکہ اس کباڑیئے کی دُکان کو جھاڑو دو، اور جتنی تم نے یہ گندی قسم کی چیزیں جمع کر رکھی ہیں سب کو نکال دو، اسی لئے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

سعدی بشوی لوحِ دِل از نقش غیرِ حق
علمے کہ راہ بحق نہ نمایند جہل است

نقش غیرِ حق سے اپنے دِل کو دھو ڈالو، اپنے دِل کی تختی کو دھو ڈالو، جو علم کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں بتاتا وہ علم نہیں جہل ہے۔

تو ایک آدمی اس واسطے علم حاصل کرتا ہے کہ مولویوں کے ساتھ بحث و مناظرے کیا کرے گا، جاہلوں کے ساتھ جھگڑا کیا کرے گا، اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے گا، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ! اس کو جہنم میں داخل کریں گے، یہ عالم نہیں ہے، عالم نما جاہل ہے۔

اُمت میں اختلاف کا سبب

ہمارے بعض اکابر نے فرمایا اور بہت ہی اچھا فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں اور آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اور آپ کی شریعت اَسود و اَحمر یعنی کالے گورے، مشرقی مغربی سب کے لئے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اُمت میں اختلاف پیدا کردیا جائے تاکہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے تمام پہلو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال و افعال محفوظ رہیں، کچھ ایک حصے پر پر عمل کریں، اور کچھ دُوسرے پر عمل کریں، شریعت ایک ہی ہے، لیکن یہ اس پہلو کو اِختیار کر رہے ہیں، اور وہ اس پہلو کو اِختیار کر رہے ہیں، اور یہ سب کے سب مقبول عنداللہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ا :...’’عَنْ اِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيِّؒ قَالَ: خَلَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ ذَاتَ يَوْمٍ فَجَعَلَ يُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فَأَرْسَلَ اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: كَيْفَ تَخْتَلِفُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ وَكِتَابُهَا وَاحِدٌ وَّنَبِيُّهَا وَاحِدٌ وَّقِبْلَتُهَا وَاحِدَةٌ؟ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍؓ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! اِنَّا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْقُرْاٰنُ وَعَلِمْنَا فِيْمَا نَزَلَ، وَاِنَّهٗ يَكُوْنُ بَعْدَنَا أَقْوَامٌ يَّقْرَؤُوْنَ الْقُرْاٰنَ لَا يَعْرِفُوْنَ فِيْمَ نَزَلَ، فَيَكُوْنُ لِكُلِّ قَوْمٍ فِيْهِ رَأْىٌ، فَاِذَا كَانَ لِكُلِّ قَوْمٍ فِيْهِ رَأْىٌ اِخْتَلَفُوْا، فَاِذَا اخْتَلَفُوْا اِقْتَتَلُوْا، فَزَجَرَهٗ عُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ وَانْتَهَرَهٗ وَانْصَرَفَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ثُمَّ دَعَاهُ بَعْدُ فَعَرَفَ الَّذِىْ قَالَ، ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا اَعِدْ۔‘‘ (کنز العمال ج:۲ ص:۳۳۳ حدیث نمبر:۴۱۶۷)

ترجمہ:...’’حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن اکیلے بیٹھے تھے، کوئی چیز سوچ رہے تھے، اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

کو بلایا اور فرمایا کہ: اس اُمت کی کتاب ایک ہے، ان کا نبی ایک ہے، قبلہ ایک ہے، ان میں پھوٹ کیسے پڑے گی؟ مختلف گروہ اور مختلف جماعتیں کیسے ہوجائیں گی؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: امیر المؤمنین! بات یہ ہے کہ قرآن ہمارے درمیان نازل ہوا اس وقت یعنی نزولِ قرآن کے وقت جو لوگ موجود تھے ان کو یہ بات معلوم تھی کہ یہ آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی اور فلاں شخص کے بارے میں نازل ہوئی، ...یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین خصوصاً جو صحابہؓ اہلِ علم تھے ان کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ فلاں آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی، فلاں آدمی کے بارے میں نازل ہوئی، اس لئے ہم میں تو اختلاف نہیں ہوا۔ بعد میں لوگوں کے سامنے واقعات تو ہوں گے نہیں -ناقل... قرآن کی آیتیں تو ہوں گی مگر یہ معلوم نہیں ہوگا کہ یہ آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے! اور فلاں شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے! ہر ایک آدمی اپنی اپنی رائے دے گا، کوئی آدمی کچھ کہے گا، کوئی کچھ کہے گا، جب ہر ایک کی الگ الگ رائے ہوگی تو ان میں اختلاف بھی ہوگا، ...یعنی جب ان میں اختلاف ہوگا تو ان میں لڑائی بھی ہوگی، دیوبندی اور بریلوی لڑیں گے، شیعہ اور سنی لڑیں گے ان کے ہاتھ میں بھی وہی کتاب ہے، ان کے ہاتھ میں بھی وہی کتاب ہے، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مانتے ہیں وہ بھی مانتے ہیں، لیکن لڑائی ایسی ہے کہ ایک مسجد

میں ایک ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتے، تو یہ وجہ ہوگی کہ ان کے درمیان اختلاف ہوجائے گا- ناقل... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات سن لی اور جھڑک دیا، وہ ان کے مقابلے میں بچے تھے، وہ اُٹھ کر چلے گئے، اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات پر غور کیا تو یہ بات ان کی سمجھ میں آئی کہ وہ بات ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ چنانچہ ان کو پھر بلایا، وہ حاضرِ خدمت ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: میاں! وہ تم نے کیا بات کہی تھی؟ ذرا دوبارہ کہو! چنانچہ انہوں نے پھر وہی بات سنائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔"

یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہماری کتاب ایک ہے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں، ہمارا قبلہ بھی ایک ہے، کتاب اللہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، نبی میں کوئی اختلاف نہیں، قبلہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں، لیکن اس کے باوجود اُمت میں اختلاف ہے اور میری کتاب "اختلافِ اُمت اور صراطِ مستقیم" جو کسی کے اصرار پر لکھی گئی تھی، اسی مسئلے کے بارے میں ہے، اس میں میں نے یہی لکھا ہے کہ:

ایک اختلاف ہے عقائد کا، آپ کا نظریہ اور ہے، میرا نظریہ اور ہے، دونوں لڑ رہے ہیں، دیوبندی بریلوی آپس میں ایک دُوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں، یہ اختلاف بعد میں اُمت میں پیدا ہوا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان یہ اختلاف نہیں تھا، آج کچھ حضرات نے بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اختلاف کیا اور کچھ نے جان بوجھ کر اختلاف پیدا کیا۔

فروعی اختلاف:

اور دُوسری قسم کا اختلاف ہے: فروعات کا اختلاف، حضرت اِمام ابوحنیفہ، اِمام مالک، اِمام شافعی اور اِمام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ یہ چار اِمام ہیں، ان کے علاوہ اور بھی ائمہ ہوئے ہیں، یہ اپنی اپنی فہم، اپنی اپنی عقل اور شریعت کے اُصول و قواعد کے مطابق اللہ اور اللہ کے رسول کے منشا کو سمجھنے کے لئے اختلاف کرتے ہیں، یہ کوئی بُری بات نہیں ہے، بلکہ یہ اختلاف ایک فطری اور طبعی چیز ہے۔

فروعی اختلاف کی مثال:

اسی کتاب میں میں نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ اَحزاب سے فارغ ہوئے جو مدینہ میں ہوا تھا اور جس میں خندق کھودی گئی تھی، اب تو خندق کے نشانات نہیں ہیں، لیکن جاننے والے بتاتے ہیں کہ یہ خندق کی جگہ تھی، کفار خندق سے پار تھے اور مسلمان اندر تھے، اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھوک کی بنا پر پیٹ پر پتھر باندھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”حَبَسُوْنَا عَنْ صَلٰوۃِ الْوُسْطٰی صَلٰوۃِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللہُ بُیُوْتَھُمْ وَقُبُوْرَھُمْ نَارًا۔“ (مشکوٰۃ ص:۶۳ بحوالہ بخاری ومسلم)

ترجمہ:... ”انہوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ نہیں پڑھنے دی، اللہ ان لوگوں کے یعنی کافروں کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھردے۔“

عصر کی نماز، مغرب کی نماز اور عشاء کی نماز یہ تینوں نمازیں فوت ہوگئی تھیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ پہلے عصر کی

نماز پڑھائی، پھر مغرب کی، اس کے بعد عشاء کی نماز پڑھائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب سے فراغت کے بعد گھر تشریف لائے، چونکہ جنگ ختم ہوگئی تھی، کافر بھی واپس مکہ چلے گئے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے، کپڑے اُتار دیئے اور غسل فرمایا، اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لے آئے اور کہا: آپ لوگوں نے تو کپڑے اُتار دیئے ہیں، لیکن ہم لوگوں نے ابھی تک کپڑے نہیں اُتارے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا حکم ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: حکم یہ ہے کہ بنو قریظہ پر چڑھائی کرو، کیونکہ انہوں نے غزوۂ اَحزاب کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدعہدی کی تھی، ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ تھا، لیکن انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور کافروں کی مدد کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور باہر نکل کر کے فرمایا:

”لَا یُصَلِّیَنَّ أَحَدُکُمُ الْعَصرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ۔“

(استذکار، حدیث:۱۰۳۱۱)

ترجمہ:...”تم میں سے کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ پہنچ کر۔“

اب لشکر کا تیار ہونا اور اس کے لئے سفر کرنا اس میں کچھ نہ کچھ وقت تو لگ جاتا ہے، اس تک پہنچنے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عصر کا وقت راستے میں ہوگیا اور اندازہ ہوا کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے بنو قریظہ نہیں پہنچ سکتے، تو دو جماعتیں ہوگئیں۔

بعض حضرات نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: بنو قریظہ جاکر نماز پڑھنا اور آپ کا منشا مبارک یہ تھا کہ غروب سے پہلے عصر کے وقت تم بنوقریظہ پہنچو، اور ہم نہیں پہنچ سکے، اب اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہم نماز بھی قضا کردیں، انہوں نے سواریوں سے اُتر کر نماز پڑھی اور پھر آگے چلے۔

اور دُوسری جماعت نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ: ”لَا یُصَلِّیَنَّ أَحَدُکُمُ الْعَصْرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَةَ“...تم میں سے کوئی آدمی نماز نہ پڑھے عصر کی مگر بنوقریظہ پہنچ کر... خواہ نماز قضا ہوجائے، ہم تو وہاں جاکر ہی نماز پڑھیں گے، انہوں نے نماز نہیں پڑھی، چلتے رہے نماز قضا ہوگئی۔

فروعی اختلاف پر تقریر:

یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا اور آپ نے کسی پر نکیر نہیں فرمائی، کیونکہ دونوں فریقوں کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل تھا، تو اِمام ابوحنیفہؒ، اِمام مالکؒ، اِمام شافعیؒ اور اِمام احمد بن حنبلؒ یا دُوسرے اَئمہ کرام کا منشا اور مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکام کی تعمیل ہے، اپنی ذاتی غرض نہیں، لیکن ایک شخص کی رائے اس طرف کو چلی گئی، ایک کی اُدھر کو چلی گئی، دونوں ٹھیک ہیں۔

فروعی اختلاف کی حکمت:

ہمارے بعض اکابر نے فرمایا اور بہت ہی اچھا فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہیں اور آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اور آپ کی شریعت اَسود و اَحمر یعنی کالے گورے، مشرقی مغربی سب کے لئے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اُمت میں اختلاف پیدا کردیا جائے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے تمام پہلو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال و افعال محفوظ رہیں، کچھ ایک حصے پر پر عمل کریں، اور کچھ دُوسرے پر عمل کریں، شریعت ایک ہی ہے، لیکن یہ اس پہلو کو اِختیار کر رہے ہیں، اور وہ اس پہلو کو اِختیار کر رہے ہیں، اور یہ سب کے سب مقبول عنداللہ ہیں۔

حضراتِ ائمہ کا اختلاف للّٰہیت پر مبنی:

جن حضرات کا اختلاف محض للّٰہیت کے لئے تھا اور محض اللہ اور اللہ کے رسول کی خاطر تھا وہ تو صحیح ہے، اس کو فروعی اختلاف کہا جاتا ہے، ورنہ ان اکابر: اِمام ابوحنیفہ، اِمام شافعی، اِمام احمد بن حنبل اور اِمام مالک رحمہم اللہ میں عقائد کا کوئی اختلاف نہیں، جو عقیدہ اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، وہی دُوسرے حضرات کا ہے۔ جو اِمام مالک رحمہ اللہ کا عقیدہ ہے، وہی ہمارا عقیدہ ہے۔

بہرکیف! اُمت میں اختلاف پیدا ہوا، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''ان کا خدا ایک ہے، ان کا رسول ایک ہے، ان کا قبلہ ایک ہے اس کے باوجود ان میں اختلاف کیسے پیدا ہوگا؟''

تو میں نے کہا کہ کبھی تو ذاتیات کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا اور کبھی اجتہادی اختلاف پیدا ہوا۔

یہ جو فرقوں کا اختلاف ہے، یہ بھی دو قسم کا ہے، کچھ اختلاف تو ائمہ متبوعین کی اقتدا کی وجہ سے ہے، ایک اِمام کی رائے یہ ہے، ایک کی یہ ہے، دونوں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔

فروعی اختلاف میں ادب کی ضرورت:

ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: جب میں حدیث پڑھاتا تھا، مشکوٰۃ شریف شروع کی تو میں نے ائمہ کے اختلاف کو نوٹ کرنا شروع کردیا، مثال کے طور پر دو رکعت نمازِ فجر کی نیت باندھی، ثنا پڑھی، فاتحہ پڑھی، سورت پڑھی، چھوٹی پڑھی یا بڑی پڑھی، رُکوع کیا، سجدہ کیا، اس کے بعد اُٹھ گئے، پھر دُوسری رکعت پڑھی، یہاں بھی وہی عمل کیا اور دُوسری رکعت میں

بیٹھ گئے، التحیات پڑھی، دُرود شریف پڑھا، دُعائیں پڑھیں، سلام پھیر دیا۔ شیخؒ فرماتے ہیں: میں نے نوٹ کیا کہ دو رکعت والی نماز میں دو سو اختلاف ہیں، اور ہم بڑے مزے لے کر اس اختلاف کو بیان کرتے ہیں، اس مسئلے میں اِمام شافعی رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں، اور اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں، نہایت ادب کے ساتھ، احترام کے ساتھ کیونکہ سب برحق ہیں، اور انہوں نے جو کچھ بھی اختلاف کیا ہے محض اللہ اور رسول کے منشا اور تعمیل کے لئے اختلاف کیا ہے، اس لئے یہ تو بالکل صحیح ہے، اس پر کوئی نکیر نہیں، اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں: تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ میں کہتا ہوں: بھائی! تم بھی ٹھیک کرتے ہو، ہم بھی ٹھیک کرتے ہیں۔

فروعی اختلاف میں شدّت نہ ہو:

مکہ مکرّمہ میں ایک دفعہ اِعتکاف میں بیٹھا ہوا تھا، تو یہ لونڈے آکر کے گھیرا ڈال لیتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ: میاں! اللہ تعالیٰ کی جنت بڑی کشادہ ہے، تم جنت میں پہلے چلے جانا، ہم تمہارے پیچھے پیچھے آجائیں گے، خواہ مخواہ جھگڑا کیوں کرتے ہو؟ غرضیکہ فروعی اختلافات میں کوئی نکیر نہیں، کوئی اعتراض نہیں، جو کچھ جس نے کہا ہے وہ محض اللہ کو راضی کرنے کے لئے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لئے کہا ہے۔

عقائد کا اختلاف مذموم ہے:

لیکن ایک اور اختلاف ہے جو عقائد کا اختلاف ہے، میرا عقیدہ یہ ہے، دُوسرے کا عقیدہ یہ ہے، اب میں کیا کہوں، بھائی! رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

”.... وَاِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰی ثِنْتَیْنِ

وَسَبْعِیْنَ مِلَّةً، وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِیْ عَلٰی ثَلٰثٍ وَّسَبْعِیْنَ مِلَّةً، کُلُّهُمْ فِی النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً، قَالُوْا: مَنْ هِیَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَیْهِ وَأَصْحَابِیْ۔" (مشکوٰۃ ص:۳۰ بحوالہ ترمذی)

ترجمہ:... "بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، وہ سب کے سب جہنمی ہیں، سوائے ایک فرقے کے، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ فرمایا: جو اس طریقے پر چلتے ہیں جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔"

حق و باطل کا ترازو:

اب تم دیکھ لو، معیار میں نے بتادیا ہے اور اس کتاب میں میں نے لکھا بھی ہے کہ: معیار کہو یا ترازو کہو، وہ میں نے تمہیں دے دی ہے، اب تم تول تول کر دیکھ لو، لڑائی جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

نیک اعمال کی افادیت وثمرات:

"عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: قَرَأْتُ اللَّیْلَةَ اٰیَةً أَسْهَرَتْنِیْ: "أَیَوَدُّ أَحَدُکُمْ أَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّأَعْنَابٍ" مَاعَنٰی؟ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: اَللّٰهُ أَعْلَمُ! فَقَالَ: اِنِّیْ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ أَعْلَمُ، وَلٰـکِنْ اِنَّمَا سَأَلْتُ اِنْ کَانَ عِنْدَ أَحَدٍ مِّنْکُمْ عِلْمٌ فَسَمِعَ فِیْهَا بِشَیْءٍ اَنْ یُّخْبِرَ بِمَا سَمِعَ، فَسَکَتُوْا، فَرَاٰنِیْ وَأَنَا أَهْمِسُ قَالَ: قُلْ یَا ابْنَ أَخِیْ! وَلَا تُحَقِّرْ نَفْسَکَ، قُلْتُ: عَنٰی بِهَا الْعَمَلَ، قَالَ: وَمَا عَنٰی بِهَا الْعَمَلُ؟ قُلْتُ: شَیْءٌ

اَلْقٰی فِیْ رَوْعِیْ فَقُلْتُہٗ! فَتَرَکَنِیْ وَأَقْبَلَ وَھُوَ یُفَسِّرُھَا، صَدَقْتَ یَا ابْنَ أَخِیْ، عَنٰی بِھَا الْعَمَلُ، اِبْنُ اٰدَمَ أَفْقَرَ مَا یَکُوْنُ اِلٰی جَنَّۃٍ اِذَا کَبُرَ سِنُّہٗ وَکَثُرَتْ عِیَالُہٗ وَابْنُ اٰدَمَ أَفْقَرَ مَا یَکُوْنُ اِلٰی عَمَلِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ صَدَقْتَ یَا ابْنَ أَخِیْ۔“

(کنز العمال ج:۲ ص:۳۵۶ حدیث:۴۲۲۸)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں نے آج ایک آیت پڑھی جس نے ساری رات مجھے جگائے رکھا اور سونے نہیں دیا، وہ آیت یہ تھی:

”أَیَوَدُّ أَحَدُکُمْ أَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْأَنْھٰرُ لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَھَآ اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ....“ (البقرۃ:۲۶۶)

ترجمہ:... ”کیا تم میں سے کوئی شخص یہ چاہے گا کہ اس کے پاس کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو، اور ہر قسم کے میوے اور پھل اس میں موجود ہوں، کمانے کے قابل نہیں رہا، اور بچے چھوٹے چھوٹے ہیں، خود بوڑھا ہوگیا ہے، بچے چھوٹے ہیں کمانے کے قابل نہیں، چنانچہ آگ بگولا آیا اس میں آگ تھی اور اس نے اس کو جلا کر رکھ دیا۔“

لوگوں سے پوچھا اس کا کیا مصداق و مفہوم ہے؟ کسی نے کہا کہ مجھے پتا نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: میں نے آپ حضرات سے ایک بات پوچھی اور آپ نے کہا: ”واللہ اعلم“ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ اللہ بہتر جانتے ہیں، میں تو تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کسی کو اس آیت کے بارے میں علم ہو یا اس نے اس

آیت کے بارے میں کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو وہ بتائے، یہ کہہ دینا تو بہت آسان بات ہے کہ مجھے پتا نہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ذرا آہستہ آواز سے بات کہہ رہا تھا جیسے گنگناتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ: بھتیجے! تم جھجکتے کیوں ہو؟ تمہارے ذہن میں کوئی بات آئی ہو تو بتایئے! اپنے آپ کو چھوٹا کیوں سمجھتے ہو؟ میں کھل گیا اور میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کی مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک آدمی کا باغ لگا ہوا ہے، اس میں تمام قسم کے میوے موجود ہیں، بہت اچھا باغ تھا، لیکن اب یہ بڈھا ہوگیا۔ آپ جانتے ہیں کہ بڑھاپے کی حالت میں آدمی کو مدد اور تعاون کی اتنی احتیاج ہوتی ہے کہ پہلے نہیں ہوتی، اب نیا باغ لگا بھی نہیں سکتا، اور وہ جو باغ لگا ہوا تھا آگ بگولا آیا اور آکر کے اس کو لے گیا، فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے اعمال کی۔

آج تو ہم اپنی جگہ عمل کر رہے ہیں، لیکن کل کو اللہ کی بارگاہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ کس کا عمل جل گیا؟ اور کس کا مقبول ہوگیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنے پاس سے کہتے ہو یا تمہارے پاس کوئی دلیل بھی ہے؟ قرآنِ کریم نے تو عمل کو بیان نہیں کیا، قرآنِ کریم نے تو یہ بیان کیا ہے کہ: ''کیا تم میں سے ایک آدمی چاہے گا کہ اس کے لئے کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو، اس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں، اور باغوں میں ہر قسم کے میوے موجود ہوں، اس پر آگ بگولا آئے اور آکر کے خاکستر کردے۔'' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے کہا: حضرت! تذکرہ تو نہیں آیا، لیکن میرے دِل میں یہی بات آتی ہے، یہ بات جب میں نے کہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اس کی تفسیر فرمانے لگے، فرمایا: تم ٹھیک کہتے ہو، بات یہ ہے کہ زندگی میں تو آدمی کام کرتا رہتا ہے اور اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں، قیامت کے دن جب یہ جائے گا تو اس حالت میں ہوگا کہ سب

سے زیادہ محتاج ہوگا اور معلوم ہوگا کہ وہ باغ جو لگایا تھا اعمال کا سارا کا سارا جل چکا ہے، تو اس بیچارے کی کیفیت کیا ہوگی؟

نیک اعمال کے ثمرات کی شرائط:

نیک اعمال کا پھل قیامت کے دن ملے گا لیکن دو شرطوں کے ساتھ:

پہلی شرط:

ایک شرط یہ ہے کہ وہ اعمال ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق ادا کئے ہوں۔ میرا جی چاہا میں نے یہ کرلیا، آپ کا جی چاہا آپ نے وہ کرلیا، یہ جی چاہے کی بات نہیں ہے بلکہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

دُوسری شرط:

دُوسری شرط یہ ہے کہ اِخلاص ہو، یعنی خالص اللہ کی رضا کے لئے یہ کام کیا جائے، بڑا بننے کے لئے، لوگوں کی واہ واہ دیکھنے کے لئے کوئی کام نہ کیا جائے۔

رِیاکار کا انجام:

جو عمل لوگوں کو دِکھانے کے لئے یا رِیا کے لئے کیا گیا، وہ کوئی عمل نہیں ہے، مشکوٰۃ میں مسلم کے حوالے سے وہ طویل حدیث آتی ہے کہ:

سب سے پہلے تین آدمیوں کا نامہ عمل پیش ہوگا، ایک مولوی صاحب اور ایک سخی اور ایک شہید کا۔ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب سے فرمائیں گے کہ: میں نے تجھے اپنا علم دیا تھا، تو نے کیا کیا؟ کہے گا: میں نے بہت وعظ کئے، لوگوں کو ہدایت کی... نعوذ باللہ، ثم نعوذ باللہ!... اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو نے صرف اس لئے کیا کہ تجھے عالم کہا جائے، لوگ کہیں کہ بہت اچھا عالم ہے، بڑی اچھی تقریر کرتا ہے، "فَقَدْ قِيلَ" وہ تو کہہ

دیا گیا، مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ گھسیٹ کر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ...نعوذ باللہ! استغفر اللہ!...سخی کے بارے میں یہی، شہید کے بارے میں بھی یہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ تین آدمی ہیں کہ جن پر سب سے پہلے جہنم کی آگ بھڑکے گی ...نعوذ باللہ! یا اللہ! ہمیں معاف فرما...۔

میں نے کہا کہ سنت کے مطابق عمل ہو، یہ نہیں کہ جیسا آپ کا جی چاہا، آپ نے کرلیا، جیسا میرا جی چاہا میں نے کرلیا۔

دوسرے یہ کہ وہ عمل خالص اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ یہ دو شرطیں پائی جائیں اور اللہ کرے ہم سب میں پائی جائیں، تو اِن شاء اللہ مقبول ہیں۔

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ عُمَرُ يُدْخِلُنِي مَعَ أَشْيَاخِ بَدْرٍ، فَقَالَ لَهُ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ: لِمَ تُدْخِلُ هٰذَا الْفَتٰى مَعَنَا وَلَنَا أَبْنَاءٌ مِّثْلُهٗ؟ فَقَالَ: اِنَّهٗ مِمَّنْ قَدْ عَلِمْتُمْ، فَدَعَاهُمْ ذَاتَ يَوْمٍ وَدَعَانِيْ، وَمَا رَأَيْتُهٗ دَعَانِي يَوْمَئِذٍ اِلَّا لِيُرِيَهُمْ مِنِّيْ، فَقَالَ: مَا تَقُوْلُوْنَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ”اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ“ حَتّٰى خَتَمَ السُّوْرَةَ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: أَمَرَنَا اللهُ أَنْ نَّحْمَدَهٗ وَنَسْتَغْفِرَهٗ اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَفُتِحَ عَلَيْنَا، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَا نَدْرِيْ، وَبَعْضُهُمْ لَمْ يَقُلْ شَيْئًا، فَقَالَ لِيْ: يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! أَكَذٰلِكَ تَقُوْلُ؟ قُلْتُ: لَا! قَالَ: فَمَا تَقُوْلُ؟ قُلْتُ: هُوَ أَجَلُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَعْلَمَهُ اللهُ ”اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ“ وَالْفَتْحُ فَتْحُ مَكَّةَ، فَذٰلِكَ عَلَامَةُ أَجَلِكَ ”فَسَبِّحْ بِحَمْدِكَ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا“ فَقَالَ

عُمَرُ: مَا أَعْلَمُ مِنهَا اِلَّا مَا تعْلَمُ۔"

(کنز العمال ج:۲ ص:۵۵۸ حدیث:۴۷۲۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس محفل میں مجھے بھی بلاتے تھے جس محفل میں اشیاخِ ...اکابرینِ... بدر کو بلاتے تھے، یعنی وہ بوڑھے جو بدر میں شریک ہوئے اس محفل میں مجھے بھی بلاتے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: آپ اس بچے کو بلاتے ہیں ہماری مجلس میں، حالانکہ ہمارے لڑکے بھی ان سے بڑے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی اور سن کر خاموش ہوگئے، کچھ کہا نہیں، ایک دن ان سب حضرات کو بلایا اور مجھے بھی بلایا اور سورۂ اِذَا جَآءَ نَصرُ اللّٰهِ پوری پڑھی، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"جب اللہ کی مدد آجائے اور مکہ فتح ہوجائے، اور آپ دیکھیں کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں، پس آپ اپنے رَبّ کی تسبیح کہئے اور اس سے بخشش مانگئے، وہ بہت توبہ قبول کرنے والے رحم کرنے والے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان بڑے صحابہ سے فرمانے لگے کہ بتاؤ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ: ہمیں معلوم نہیں۔ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خاص ادا تھی، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھریں، ان کو جو بات معلوم ہوتی تھی وہ بتادیتے تھے اور جو بات معلوم نہیں ہوتی تھی تو کہہ دیتے تھے اللہ اعلم، اللہ بہتر جانتا ہے، ہمیں معلوم نہیں، جیسا کہ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی گئی ہے کہ:

"قُلْ مَآ أَسْئَلُكُم مِّنْ أَجْرٍ وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ"

ترجمہ:... "اے نبی! آپ فرمادیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا، اور میں تکلف کرنے والوں میں سے

نہیں، بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔‘‘

حضرات صحابہ کرامؓ بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں تھے، بات معلوم ہوتی تھی تو عرض کردیتے تھے، بات معلوم نہیں ہوتی تھی تو صاف کہہ دیتے تھے: ’’اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!‘‘ ہمیں معلوم نہیں۔

تو بعض حضرات نے کہا کہ: ہمیں معلوم نہیں، اور بعض حضرات خاموش ہی رہے، انہوں نے کوئی بات ہی نہیں کہی، اور بعض حضرات نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ: جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ہوجائے اور لوگ جوق در جوق دِین میں داخل ہونے لگیں تو اِستغفار کرو اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں تسبیح کرو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمرؓ نے بلایا تھا، مجھے کہنے لگے کہ: بھتیجے! تیرا بھی یہی خیال ہے؟ حضرت ابن عباسؓ فرمانے لگے: نہیں! میرا یہ خیال نہیں ہے، حضرت عمرؓ کہنے لگے: تم اس سورت سے کیا سمجھے ہو؟ حضرت ابن عباسؓ کہنے لگے: میں یہ سمجھا ہوں کہ اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی وفات کی خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی فتح آگئی اللہ تعالیٰ کی مدد دیکھ لی، مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے تو اب آپ کا کام ختم ہوگیا، آپ نے جو کام کرنا تھا اور آپ سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہوگیا، اب آپ آخرت کی تیاری کیجئے، اب رَبّ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے، اِستغفار کیجئے، یعنی تسبیح، تحمید اور اِستغفار، تین چیزوں کا اہتمام کیجئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت شریفہ کی تعمیل میں بکثرت فرماتے تھے: ’’سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ‘‘ تو میں اس کا مطلب یہ سمجھا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بھتیجے! تم نے ٹھیک کہا ہے، میں بھی یہی سمجھا ہوں۔

یہ اکابر صحابہ کو بتانا تھا کہ چھوٹا بچہ نہیں ہے، ہے تو بچہ، لیکن اس کو اللہ نے علم اس طرح عطا فرمایا ہے، فہم اتنی عطا فرمائی ہے کہ سبحان اللہ۔

ابنِ عباسؓ اور عمرؓ کا علمی مکالمہ:

زبیر بن بکار نے اپنی کتاب ’’موفقیات‘‘ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ:

’’سَأَلْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ عَنْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ: ’’یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ‘‘ قَالَ: كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْمُهَاجِرِیْنَ فِیْ أَنْسَابِهِمْ شَیْءٌ، فَقَالُوْا یَوْمًا: وَاللّٰہِ! لَوَدِدْنَا أَنَّ اللّٰہَ أَنْزَلَ قُرْاٰنًا فِیْ نَسَبِنَا، فَأَنْزَلَ اللّٰہُ مَا قَرَأْتَ، ثُمَّ قَالَ لِیْ: اِنَّ صَاحِبَكُمْ هٰذَا – یَعْنِیْ عَلِیَّ بْنَ أَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ – اِنْ وُلِّیَ زَهَدَ، وَلٰكِنْ أَخْشٰی عُجْبَهٗ بِنَفْسِهٖ أَنْ یَّذْهَبَ بِهٖ، قُلْتُ: یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! اِنَّ صَاحِبَنَا مَنْ قَدْ عَلِمْتَ وَاللّٰہِ! مَا تَقُوْلُ اِنَّهٗ مَا غَیَّرَ وَلَا بَدَّلَ وَلَا أَسْخَطَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ أَیَّامَ صُحْبَتِهٖ؟ فَقَالَ: وَلَا بِنْتَ أَبِیْ جَهْلٍ وَهُوَ یُرِیْدُ أَنْ یَّخْطِبَهَا عَلٰی فَاطِمَةَ؟ قُلْتُ: قَالَ اللّٰہُ فِیْ مَعْصِیَةِ اٰدَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: ’’وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا‘‘ فَصَاحِبُنَا لَمْ یَعْزِمْ عَلٰی أَسْخَاطِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنَّ الْخَوَاطِرَ الَّتِیْ لَا یَقْدِرُ أَحَدٌ دَفْعَهَا عَنْ نَّفْسِهٖ، وَرُبَمَا كَانَتْ مِنَ الْفَقِیْهِ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ الْعَالِمِ بِأَمْرِ اللّٰہِ، فَاِذَا نُبِّهَ عَلَیْهَا رَجَعَ وَأَنَابَ، فَقَالَ: یَا ابْنَ عَبَّاسٍ! مَنْ ظَنَّ أَنَّهٗ یَرُدُّ بُحُوْرَكُمْ فَیَغُوْصُ فِیْهَا مَعَكُمْ حَتّٰی بَلَغَ قَعْرَهَا فَقَدْ ظَنَّ عِجْزًا۔‘‘

(کذافی المنتخب ج:۵ ص:۲۲۹ بحوالہ حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۲۲۴، ۲۲۵)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس آیت کا کیا مطلب ہے: ”اے ایمان والو! تم ایسی چیزیں نہ پوچھا کرو کہ اگر تمہارے سامنے ان کا اظہار کردیا جائے تو تم کو ناگواری ہو“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کے نسب پر لوگوں کو اعتراض تھا کہ یہ صحیح النسب آدمی ہے کہ نہیں؟ تو ان حضرات نے آپس میں بیٹھ کر کہا کہ: کاش! اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں کوئی آیت شریفہ نازل فرمادیتے تو یہ بات ختم ہوجاتی، اس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غضبناک ہونا:

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک موقع پر بہت ناراض تھے، غیظ وغضب آپ کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا، پتا نہیں کس بات پر ناراض ہوگئے، منبر پر تشریف فرما تھے اور فرمایا کہ: مجھ سے جو پوچھنا ہے پوچھ لو، تو ایک صحابی کے نسب کے بارے میں لوگوں کو اعتراض تھا انہوں نے اسی حالت میں کہہ دیا کہ میرے باپ کا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: تیرا باپ فلاں شخص ہے۔ وہی جس کو عام طور پر اس کا باپ کہا جاتا تھا، جب وہ گھر آیا تو اس کی والدہ نے اس کو نہایت ڈانٹا کہنے لگی: تم ایسے نالائق بیٹے ہو کہ آج مجھے رُسوا کرنے لگے تھے، تمہیں یہ خیال ہوا کہ شاید جاہلیت کی عورتیں جو غلط کام کیا کرتی تھیں، میری ماں نے بھی وہ غلطی کی ہو، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور کا نام لے لیتے تو ساری عمر میری رُسوائی ہوتی۔ یہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے باپ کا نام لیا۔

حضرت عمرؓ کا غضبِ نبوی سے ڈرنا:

بہرحال جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بات کو دیکھا تو گھٹنے ٹیک دیئے اور ”اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ!“... ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں

اللہ کے غصّے سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصّے سے... وہ بار بار اس کو پڑھتے رہے، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ ختم ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جن کے نسبوں کے بارے میں اشتباہ تھا اور جو یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی کوئی آیت نازل ہوجائے، اللہ نے ان کی ماؤں کو رُسوا نہیں کیا، بلکہ ان کو منع کردیا کہ خبردار! آئندہ ایسی بات نہ پوچھو، بس ہوگیا جو کچھ ہوگیا ایک تو یہ بات ہوئی۔

حضرت عمرؓ کا ابنِ عباسؓ کی علمیت کا اعتراف:

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: یہ جو تمہارا ساتھی ہے نا! ابن عباسؓ کو فرمایا یہ جو تمہارا ساتھی ہے نا! یعنی حضرت علی، اگر اس کو امیر بنادیا جائے آدمی تو بہت اچھا ہے، کام تو بہت چلائے گا، لیکن مجھے خطرہ ہے کہ کہیں عجب میں مبتلا نہ ہوجائے، خودپسندی میں مبتلا نہ ہوجائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ: حضرت! بات یہ ہے کہ آپ کو حضرت علیؓ کے بارے میں یہ شبہ کیوں ہوا؟ کہنے لگے: اصل میں بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہوں نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا، بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا، اور اس میں یہ فرمایا تھا کہ: اللہ کے دُشمن کی بیٹی اور اللہ کے رسول کی بیٹی ایک گھر میں نہیں رہ سکتی، اگر علی، ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دیدے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ: جہاں تک حضرت علی کا تعلق ہے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا باعث ہو اور جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے ہوں، باقی حضرت علیؓ نے جو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی بھول چوک سے ایسا ہوجاتا ہے دیکھو حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا“ ...بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی نہیں پائی... جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھول سکتے ہیں، اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ...ہم نے ان میں پختگی نہیں پائی...تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی بھول سکتے ہیں، جب ان کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں تو انہوں نے فوراً توبہ کرلی۔ جب ابن عباسؓ سے یہ بات سنی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو ایسا گہرا علم دیا ہے کہ اس سمندر میں نہ کوئی عام آدمی غوطہ لگا سکتا ہے اور نہ کسی کی مجال میں ہے کہ اس کے ساتھ چلے، مطلب یہ کہ حضرت عمرؓ لاجواب ہوگئے۔

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

علم سے زیادہ عمل کا اہتمام

علم حاصل کرو، لیکن علم کے ساتھ بھائی! عمل بھی کرو۔

یہاں تین چیزیں ہیں: ۱:...علم ہے، ۲:...عمل ہے، ۳:...اِخلاص ہے۔ علم یہ پہلی سیڑھی اور پہلا زینہ ہے، اگر ہم نے علم ہی حاصل نہیں کیا، عمل کاہے پر کریں گے؟ علم حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کرنے کی توفیق مانگو، کبھی تو عمل کرلوگے، اور تیسری بات یہ ہے کہ اِخلاص ہو، خالص اللہ کی رضا کے لئے عمل کرو، اِخلاص کے یہ معنی ہیں کہ مخلوق کو دِکھانے کے لئے نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو اِخلاص نصیب فرمائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:...”عَنْ أَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا قَالَ: تَعَلَّمُوْا مَا شِئْتُمْ أَنْ تَعلَمُوْا فَلَنْ یَّنْفَعَکُمُ اللهُ حَتّٰی تَعْمَلُوْا بِمَا تَعْلَمُوْنَ۔“ (حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۷)

ترجمہ:...”حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم جو سیکھنا چاہتے ہو سیکھ لو، لیکن اللہ تعالیٰ تمہیں نفع نہیں دیں گے تمہارے سیکھنے پر جب تک کہ تم اپنے سیکھے ہوئے پر عمل نہ کرلو۔“

سیکھنے کی تین چیزیں:

سیکھنے کی چیزیں تین قسم کی ہیں، جن کو آدمی سیکھتا ہے:

۱:...بعض چیزیں وہ ہیں جیسے ایران توران کی کہانیاں اور اِدھر اُدھر کے قصے، آدمی پڑھتا رہتا ہے، اس کو لایعنی کی مد میں شمار کرنا چاہئے، یہ سب بے فائدہ ہیں، جس آدمی نے اپنا وقت ضائع کرنا ہو وہ یہ کام کرے، افسانے اور دُوسرے قسم کے فیچر آدمی پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے، مجھے بھی اس کی بڑی عادت رہی ہے، جو بھی چیز سامنے آگئی اس کو پڑھ لیا۔

۲:...دُوسری چیز وہ ہے جس کو آدمی پڑھتا ہے اور اس کو سمجھتا ہے کہ میرے

لئے یہ مضر ہے، یہ میرے فائدے کی چیز نہیں ہے، فحش قسم کی باتیں، لایعنی باتیں، بے حیائی کی باتیں، ان میں تو آدمی کو مشغول ہونا ہی نہیں چاہئے۔

۳:...اب رہی تیسری چیز بظاہر مفید علم ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: تم جتنا چاہو سیکھ لو، لیکن صرف تمہارے سیکھنے پر اجر نہیں ملے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اجر عطا فرمائیں گے عمل کرنے پر، آدمی اچھی باتیں پڑھتا رہے، پڑھتا رہے لیکن عمل نہ کرے بے فائدہ ہے۔

۲:..."عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا: تَعَلَّمُوا مِنَ الْعِلْمِ مَا شِئْتُمْ فَوَاللّٰہِ! لَا تُوْجَرُوْا بِجَمِیْعِ الْعِلْمِ حَتّٰی تَعْمَلُوْا۔" (حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۸، بحوالہ جامع الصغیر)

ترجمہ:..."ابوالحسن بن اخرم المدینی نے اپنی امالی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم جتنا چاہو علم سیکھ لو، لیکن اللہ کی قسم! تمہیں تمام علم پر اجر نہیں ملے گا جب تک تم اس پر عمل نہ کرو۔"

۳:..."عَنْ مَکْحُوْلٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ غَنْمٍ قَالَ: حَدَّثَنِیْ عَشْرَةٌ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا: کُنَّا نَتَدَارَسُ الْعِلْمَ فِیْ مَسْجِدِ قُبَاءَ اِذْ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: تَعَلَّمُوْا مِنَ الْعِلْمِ مَا شِئْتُمْ، فَوَاللّٰہِ! لَا تُوْجَرُوْا بِجَمِیْعِ الْعِلْمِ حَتّٰی تَعْمَلُوْا۔" (حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۲۴۸)

ترجمہ:..."حافظ ابن عبدالبرؒ نے جامع بیان علم میں مکحولؒ سے اور انہوں نے عبدالرحمٰنؒ بن غنم سے نقل کیا ہے کہ: ہم مسجد قباء میں دس آدمی تھے ایک دُوسرے سے سن رہے تھے،

پڑھ پڑھا رہے تھے، اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: تم پڑھ لو جتنا چاہو، لیکن اگر تم عمل نہیں کروگے تو تمہیں اجر نہیں ملے گا۔"

دِین سیکھنا باعثِ اجر ہے:

دِین کی کسی بات کو سیکھنا اور اس کے لئے محنت کرنا یہ مستقل اجر و ثواب کا موجب ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اجر عطا فرماتے ہیں، اس لئے کہ اگر سارے آدمی دُوسرے کام کرنے لگیں اور دِین کا علم کوئی نہ سیکھے تو پھر اُمت کی تباہی ہے۔

شہر یا بستی میں عالم کا ہونا:

اسی لئے علماء فرماتے ہیں کہ: بستی میں کم از کم ایک عالم ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو حلال و حرام بتاسکے، کسی کو پوچھنے کی ضرورت ہو تو بتاسکے، اور اگر کوئی بھی حلال و حرام بتانے والا نہیں ہے تو سارے کے سارے گناہ گار ہوں گے، اسی طرح شہر میں، محلے میں ایک عالم ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو دِین کی ضروری باتیں بتاسکے کہ یہ ناجائز ہے، حرام ہے، حلال ہے، لوگ اس سے رُجوع کرسکیں، اس سے قطع نظر کہ لوگ اس سے رُجوع کرتے ہیں یا نہیں کرتے؟ لیکن عالم موجود ہونا چاہئے جو دِین کی باتیں بتاسکے اور لوگوں کی راہ نمائی کرسکے، اور اگر کوئی بھی عالم وہاں نہیں ہے تو سارے کے سارے شہر والے گناہگار ہوں گے۔

حصولِ علم فرض ہے:

تو علم کا حاصل کرنا یہ ایک مستقل فرض ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا اجر و ثواب بھی ملے گا، لیکن علم سے مقصود عمل کرنا ہے۔ اگر آدمی سیکھتا جائے، پڑھتا جائے لیکن عمل نہ کرے تو گناہگار ہوگا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا علم پڑھنے لگے تو اللہ تعالیٰ عمل

کی بھی توفیق عطا فرمادیتے ہیں۔

ایک شبہ کا جواب:

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ عمل تو ہم نے کرنا ہی نہیں، لہٰذا دِین کی بات کیوں سیکھیں؟ جبکہ اس پر عمل نہیں کرنا۔ یہ غلط فہمی ہے اور شیطان کا مغالطہ ہے۔ میرے بھائی! علم حاصل کرلو، مسئلہ معلوم کرلو اور اپنے پاس محفوظ رکھو، مسئلہ معلوم کرلو عمل نہ کرو، لیکن ایک وقت آئے گا کہ تمہارا علم خود تمہیں عمل کرنے پر مجبور کرے گا۔

علم، عمل پر مجبور کرتا ہے:

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

”تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ، وَیَأْبٰی أَنْ یَّکُوْنَ اِلَّا لِلّٰہِ۔“

ترجمہ:... ”ہم نے جو علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے، بڑے بننے کے لئے، عزت کرانے کے لئے، وہ کرنے کے لئے، لیکن علم نے انکار کردیا کہ میں تو اللہ کے لئے ہوں گا اور کسی کے لئے نہیں ہوں گا۔“

اس لئے دِین کی بات صحیح معلوم کرلو اور چاہے فیصلہ کرلو کہ ہمیں اس پر عمل نہیں کرنا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہیں توفیق عطا فرمائیں گے اور جو تمہارا علم محفوظ ہے اور جو تم نے سن رکھا ہے، وہ اِن شاء اللہ کسی وقت عمل کی بھی توفیق عطا فرمادے گا اور اس وقت تمہیں افسوس ہوگا کہ اس وقت کیوں نہ اس پر عمل کیا؟ اس لئے شیطان اگر ورغلاتا ہے اور دھوکا دیتا ہے کہ علم پر عمل تو کرنا نہیں ہے، اس کو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ سیکھنے سے کیا فائدہ؟ وعظ سننے سے کیا فائدہ؟ تو یہ شیطان کا دھوکا ہے، تم اللہ کے لئے، اللہ کی رضا کے لئے علم حاصل کرو، لوگوں کو دِکھانے کے لئے نہیں، اِن شاء اللہ! اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

۳:... ”عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا يَنْفِيْ عَنِّيْ حُجَّةَ الْجَهْلِ؟ قَالَ: اَلْعِلْمُ! قَالَ: فَمَا يَنْفِيْ عَنِّيْ حُجَّةَ الْعِلْمِ؟ قَالَ: اَلْعَمَلُ!“

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۴ حدیث:۲۹۳۶۱)

ترجمہ:... ”حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! میرے اندر جہل پایا جاتا ہے اور یہ گویا اللہ کی حجت ہے میرے اُوپر کہ تم نے کیوں نہیں سیکھا تو میری اس حجت کو جو میرے ذمے لازم ہوگئی اس کو کون سی چیز ہٹاسکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علم! ...یعنی علم حاصل کرلوگے تو جہل کی حجت، کہ کیوں نہیں سیکھا، نہیں رہے گی...اس شخص نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! علم تو میں نے سیکھ لیا، اب علم کی حجت کو کون مجھ سے ہٹاسکتا ہے؟ فرمایا: عمل!“

گویا دو مرحلے ہوگئے، ایک ہے دِین کا سیکھنا، اور دُوسرا ہے دِین کی بات پر عمل کرنا۔ اگر کسی نے دِین کی بات کو سیکھا ہی نہیں تو اس پر اس کا جہل، اس کے خلاف حجت ہے، قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے دِین کی بات کو کیوں نہیں سیکھا؟ کیا تجھے بتانے والے نہیں آئے تھے؟ کیا تو سیکھ نہیں سکتا تھا؟ قیامت کے دن آپ یہ حجت نہیں کرسکیں گے کہ یا اللہ! مجھے کوئی بتانے والا ہی نہیں تھا، بتانے والے تو اللہ تعالیٰ نے بہت پیدا کردیئے۔

اور جب علم حاصل کرلیا تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ اس علم پر کتنا عمل کیا؟ ایک مستقل حجت ہوگی، اللہ تعالیٰ ہمیں علم کی توفیق عطا فرمائے یعنی دِین کا مسئلہ صحیح سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور جب دِین کا مسئلہ سیکھ لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائیں گے۔

۴:...’’عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: تَعَلَّمُوْا كِتَابَ اللّٰهِ تَعْرِفُوْا بِهٖ! وَاعْمَلُوْا بِهٖ تَكُوْنُوْا مِنْ أَهْلِهٖ۔‘‘

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۴ حدیث:۲۹۳۶۰)

ترجمہ:...’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سیکھو! تم اس کے ذریعے سے پہچانے جاؤ گے، معلوم ہوجائے گا کہ فلاں عالم ہے، فلانے شخص کو کتاب آتی ہے، فلانا قاری صاحب ہے، لیکن صرف کتاب کے سیکھنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ اس پر عمل کرو تب تم اہلِ علم میں سے ہوگے، یعنی تب تم کہلاؤ گے کہ یہ صاحبِ علم و کتاب ہے، یعنی اگر تم اس علم پر عمل کروگے، تو صاحبِ علم کہلاؤ گے، اگر عمل نہ کیا اور صرف سیکھ لیا تو پڑھ کے پتھر ہوگئے۔‘‘

۵:...’’عَنْ عَلِيٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ تُعْرَفُوْا بِهٖ! وَاعْمَلُوْا بِهٖ تَكُوْنُوْا مِنْ أَهْلِهٖ، فَإِنَّهٗ سَيَأْتِيْ مِنْ بَعْدِكُمْ زَمَانٌ يُّنْكَرُ فِيْهِ الْحَقُّ تِسْعَةَ أَعْشَارِهٖ وَإِنَّهٗ لَا يَنْجُوْ فِيْهِ إِلَّا كُلُّ نَوْمَةٍ مُّنْبَتٍ إِنَّمَا أُولٰئِكَ أَئِمَّةُ الْهُدٰى وَمَصَابِيْحُ الْعِلْمِ لَيْسُوْا بِالْعَجِلِ الْمَذَايِيْعِ الْبُذُرِ۔‘‘

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۵۶ حدیث:۲۹۳۶۵)

سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ سے روایت ہے وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ علم سیکھو، تم اس کے ذریعے پہچانے جاؤ گے، عالم میں اور غیر عالم میں کیا فرق ہے؟ ایک آدمی نے علم سیکھ لیا ہے اور وہ علم کو اچھی طرح سمجھتا ہے، اور دُوسرے نے علم نہیں سیکھا دونوں کے درمیان امتیاز کیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کرو، علم پر عمل کروگے تو تم اس کے اہل میں سے ہوگے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ

ارشاد فرماتے تھے کہ: اب تو ماشاء اللہ سیکھنے والے بھی موجود ہیں، سکھانے والے بھی موجود ہیں، لوگوں میں دِین کا علم سیکھنے کا سکھانے کا، قرآنِ کریم پڑھنے کا، حدیث شریف پڑھنے کا چرچا ہے، کہتے ہیں تین درس گاہیں تھیں، ایک مکہ مکرمہ میں اور ایک مدینہ طیبہ میں اور ایک کوفہ میں۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کوفہ چلے گئے تھے تو فرمایا کہ: آج تو تم پڑھ سکتے ہو، لیکن ایک وقت آئے گا جس میں حق کا انکار کردیا جائے گا، دِین کے دس حصوں میں سے ایک حصہ باقی رہے گا، نو حصے ختم کردیئے جائیں گے۔ ذرا اندازہ فرمایئے! اپنے محلے کی، اپنے شہر کی مردم شماری کرکے دیکھئے! کتنے آدمی یہاں رہتے ہیں، اور ان میں سے جو دِین کی شدبد رکھتے ہیں وہ کتنے ہیں؟ اور ان میں سے جو دِین کو پورے طور پر سمجھنے والے ہیں، وہ کتنے ہیں؟ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ایک وقت آئے گا کہ دِین کے نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا، صرف ایک حصہ باقی رہے گا، اب مجموعی حالات کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے، یہ چند آدمی جو مسجد میں بیٹھے ہیں ان سے دھوکا نہ کھاؤ، یا تبلیغ میں چند آدمی چلے جاتے ہیں اس سے دھوکا نہ کھاؤ، مسجد کا اور بازار کا مقابلہ کرو اور دِین داروں کا بے دِینوں کے ساتھ مقابلہ کرو، تو پھر معلوم ہوگا کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے صحیح فرمایا تھا کہ ایک حصہ باقی رہے گا، نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا، اور انکار بھی پوری طرح کا انکار۔ علمائے کرام، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، لوگ ان کو کیا کیا کہتے ہیں؟ مجھے معلوم ہے، ہم لوگ تو منبر پر بیٹھ کر یا جو بھی دِین کا مسئلہ صحیح بتائے، تم اس کے دُشمن ہوجاتے ہو، تم اس کو مُلّا کہتے ہو، اور اس کیفیت کو مُلّائیت کہتے ہو، نعوذ باللہ! استغفر اللہ! تو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ دِین کا ایک حصہ چھوڑ کر باقی نو حصوں کا انکار کردیا جائے گا اور اس میں صرف وہی شخص نجات پائے گا جو بے چارہ گم نام ہو اور الگ تھلگ رہتا ہو، اور لوگوں کی باتیں ہی نہ سنے، فرمایا: یہ لوگ ائمہ ہدیٰ ہیں، مصابیح علم ہیں، ہدایت کے

اِمام ہیں، ہدایت کے چراغ ہیں اور علم کے چراغ ہیں اور جلد بازی کرنے والے نہیں بلکہ دِین کو سمجھ کے اس پر عمل کرنے والے ہیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دِین کو صحیح سمجھیں اور حتی الامکان جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کو پہنچانے کی کوشش کریں، بہت سے لوگ اپنی خواہشات کے لئے دِین کو بگاڑ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے نہ بنائے۔

علم کی زکوٰۃ:

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ کا مقولہ ہے، وہ مدارس میں ...جہاں حدیث کے درس ہوتے تھے... جاتے تھے، یہ اللہ والے اور بزرگ تھے اور مدارس میں جاکر کہا کرتے تھے کہ: میاں! اپنے علم کی زکوٰۃ ادا کیا کرو! یعنی سو میں سے ایک بات پر عمل کرلیا کرو۔ لیکن اب تو لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں ...لا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

مُلَّا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ اُحد میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون ہے جو ان کافروں کو ہٹائے؟ چند صحابہ آگے بڑھے، ان کا مقابلہ کرتے رہے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں آنے دیا، یہاں تک کہ وہ شہید ہوگئے، پھر اور بڑھے یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہوگئے، ان کی سعادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہید ہوگئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آنچ نہیں آنے دی۔

میں دوستوں کو کہا کرتا ہوں کہ تم مُلَّاؤں کو جو کچھ کہتے ہو، بہت بڑی خوشی کی بات ہے، واللہ! یہ مُلَّا تمہارے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بن گیا ہے، جس کی وجہ سے تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں کہہ سکتے، اور مُلَّاؤں کو کہتے ہو کہ وہ ایسا کرتے ہیں، وہ ایسا کرتے ہیں، حالانکہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہنا

چاہتے ہو، لیکن بات نکلتی ہے مُلاَّ کے خلاف، میرے اللہ کا شکر ہے کہ تم مُلاَّ کو کچھ کہتے ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں کہتے، الحمدللہ! مجھے اس پر بہت خوشی ہے کہ ہم کل قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنابِ عالی میں عرض کریں گے کہ: آپ کی خاطر ہمیں یہ، یہ کہا گیا تھا، جس طرح ان صحابہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر شہید کیا گیا، آج تم مسلمان کہلانے والے بھی مُلاَّؤں پر اپنا غصہ نکال رہے ہو، حالانکہ مُلاَّؤں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ دِین کا صحیح مسئلہ بتاتے ہیں۔

۶:... ”عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: يَا حَمَلَةَ الْعِلْمِ! اِعْمَلُوْا بِهٖ! فَاِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ عَلِمَ ثُمَّ عَمِلَ وَوَافَقَ عِلْمُهٗ عَمَلَهٗ، وَسَيَكُوْنُ أَقْوَامٌ يَّحْمِلُوْنَ الْعِلْمَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، يُخَالِفُ سَرِيْرَتُهُمْ عَلَانِيَتَهُمْ وَيُخَالِفُ عَمَلُهُمْ عِلْمَهُمْ، يَجْلِسُوْنَ حِلَقًا فَيُبَاهِيْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا حَتّٰى اِنَّ أَحَدَهُمْ لَيَغْضَبُ عَلٰى جَلِيْسِهٖ حِيْنَ يَجْلِسُ اِلٰى غَيْرِهٖ وَيَدَعُهٗ أُولٰئِكَ لَا تَصْعَدُ أَعْمَالُهُمْ فِيْ مَجَالِسِهِمْ تِلْكَ اِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ۔“ (کنز العمال ج:۱۰ ص:۲۷۲ حدیث:۲۹۴۱۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے کہ: اے حاملینِ علم! اپنے علم پر عمل کرو، اس لئے کہ عالم تو وہی ہوتا ہے جو سیکھے اور پھر عمل کرے، اور پھر اس کا عمل، علم کے موافق ہو۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ آخر زمانے میں کچھ لوگ ایسے آئیں گے ...حضرت کے زمانے میں تو نہیں تھے بعد میں آئیں گے... علم ان کی ہنسلی سے نیچے نہیں اُترے گا، ان کا ظاہر کچھ اور ہوگا، باطن کچھ اور ہوگا، ظاہر میں تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہوں گے، اور باطن میں اللہ کا خوف نہیں ہوگا، ظاہر اور باطن کے درمیان اختلاف ہوگا، اور ان کا عمل ان کے علم کے خلاف ہوگا، حلقے بناکر بیٹھیں گے، فخر کریں گے کہ آج ہم نے یہ تیر مارا ہے، آج ہم نے وہ کام کیا ہے، اور اگر ان کے حلقے کا آدمی

دُوسری جگہ چلا جائے گا تو ان سے ناراض ہوجائیں گے کہ یہ ہمیں چھوڑ کر فلاں جگہ چلا گیا ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ: یہ وہ لوگ ہوں گے کہ ان کے اعمال ان کی مجلسوں میں سے اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ پاتے۔

تین چیزیں:

علم حاصل کرو، لیکن علم کے ساتھ بھائی! عمل بھی کرو۔

یہاں تین چیزیں ہیں: ۱:...علم ہے، ۲:...عمل ہے، ۳:...اِخلاص ہے۔

علم:

علم یہ پہلی سیڑھی اور پہلا زینہ ہے، اگر ہم نے علم ہی حاصل نہیں کیا، عمل کاہے پر کریں گے؟ اللہ کا شکر کرو کہ ہمارے پاس علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں وقت اور فرصت بھی عطا فرمائی ہے، جبکہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب ہماری روانگی ہوجائے گی اور اس وقت کہیں گے:

"رَبِّ لَوْ لَآ أَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی أَجَلٍ قَرِیْبٍ، فَأَصَّدَّقَ وَأَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ"

ترجمہ:..."یا اللہ! تھوڑی سی مہلت مجھے اور دے دیتے، میں تصدیق کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہوجاتا۔"

وہ وقت مجھ پر بھی آنے والا ہے، آپ پر بھی آنے والا ہے، اور سفید بالوں کے بعد تو اب اسی کا انتظار ہے، کالے بال تو اب آنے سے رہے، اب تو اس کا انتظار ہے، لہٰذا مرنے سے پہلے علم حاصل کرلو۔

عمل:

علم حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کرنے کی توفیق مانگو، کبھی تو

عمل کرلو گے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں یوں کہہ سکو گے: یا اللہ! تیری یہ بات سنی تھی تیرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنی تھی اور میں نے اس پر عمل کرلیا تھا۔

اِخلاص:

اور تیسری بات یہ ہے کہ اِخلاص ہو، خالص اللہ کی رضا کے لئے عمل کرو، اِخلاص کے یہ معنی ہیں کہ مخلوق کو دِکھانے کے لئے نہیں، ذرا سوچو کہ مخلوق کو دِکھا کے کریں گے تو ہمیں کیا ملے گا؟ تم سارے مل جاؤ تو مجھے کیا دے دو گے؟ کچھ بھی نہیں ملے گا مجھے! تمہیں دِکھانے سے کچھ بھی نہیں ملے گا، اور اللہ کو دِکھانے سے سب کچھ مل جائے گا۔ اس لئے علم، عمل، اور تیسرے اِخلاص، خالص اللہ کے لئے کام کرو گے تو پھر اِن شاء اللہ تعالیٰ! کام چل جائے گا، چاہے علم میں کھوٹ تھا، یا عمل میں کھوٹ تھا یا اِخلاص نہیں تھا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہم سب لوگوں کو اِخلاص نصیب فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

”یَا أَیُّھَا النَّاسُ! تَعَلَّمُوْا فَمَنْ عَلِمَ فَلْیَعْمَلْ۔“

(مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۶۴)

ترجمہ:... ”لوگو! علم حاصل کرو، اور جس شخص نے ایک بات کا علم حاصل کرلیا وہ اس پر عمل کرے۔“

۷:... ”عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُکَیْمٍ قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ مَسْعُوْدٍ فِیْ ھٰذَا الْمَسْجِدِ یَبْدَأُ بِالْیَمِیْنِ قَبْلَ الْکَلَامِ فَقَالَ: مَا مِنْکُمْ مِّنْ أَحَدٍ اِلَّا أَنَّ رَبَّہٗ تَعَالٰی سَیَخْلُوْ بِہٖ کَمَا یَخْلُوْا أَحَدُکُمْ بِالْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ، فَیَقُوْلُ: یَا ابْنَ اٰدَمَ! مَا غَرَّکَ بِیْ؟ اِبْنَ اٰدَمَ! مَاذَا أَجَبْتَ الْمُرْسَلِیْنَ؟ اِبْنَ اٰدَمَ! مَاذَا عَمِلْتَ فِیْمَا عَلِمْتَ۔“ (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۱۳۱)

ترجمہ:... ’’عبداللہ بن عکیمؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کوفہ کی اس مسجد میں سنا، اور وہ بات کرنے سے پہلے قسم کھاتے تھے،... یعنی قسم کھا کر بات کرتے تھے تاکہ تم لوگ اس پر یقین رکھ سکو، بعضے لوگ تو قسم کے بغیر اللہ کی بات پر بھی اعتبار نہیں کرتے... اور فرماتے تھے کہ تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ رَبّ العزت کی بارگاہ میں پیش ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں بات کرے گا، جس طرح کہ چودھویں رات کے چاند کو ہر آدمی الگ الگ دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! تجھ کو کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں ڈالا؟ اے ابن آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ اے ابن آدم! تو نے جو سیکھا تھا، کیا اس پر عمل کیا تھا؟‘‘

ایک دیہاتی کا علم وعمل:

تفسیر نسفی میں نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی قسم کے آدمی آئے اور آکر کہنے لگے کہ: مجھے بھی قرآن مجید کا کچھ علم سکھاؤ! انہوں نے ایک آیت سکھادی، کہنے لگے: بس بہت کافی ہوگیا۔ دیہاتی بڑے سادے ہوتے ہیں، علم عمل کے لئے کرنا ہے نا تو بس یہی آیت کافی ہے، ایک سال کے بعد پھر آئے، اور پھر فرمانے لگے کہ: وہ جو میں نے ایک سال پہلے ایک آیت سیکھی تھی اس پر عمل کرلیا ہے، اب مجھے اگلا سبق سنایئے! اگلا سبق تھا:

’’فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ۔‘‘ (الذاریات:۲۳)

ترجمہ:... ’’قسم ہے آسمان اور زمین کے رَبّ کی! کہ یہ بات برحق ہے جو کہہ رہے ہیں ہم، جیسے کہ تم آپس میں ایک دُوسرے سے باتیں کرتے ہو۔‘‘

کم از کم اتنی بات کا تو یقین کرلو! چنانچہ جب وہ بزرگ یہ پڑھ رہے تھے تو دیہاتی کہنے لگا کہ: یہ اللہ کا کلام ہے؟ کہنے لگے کہ: ہاں اللہ کا کلام ہے! تو کہنے لگا کہ: ایسا کون آدمی تھا جس کو میرے رَبّ کی بات پر اعتماد نہیں ہوا؟ یقین نہیں آیا اور میرے رَبّ کو قسم کھا کر بات کہنی پڑی؟ ’’فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ‘‘ کہنا پڑا، یہ بات کہی اور نعرہ مار کر مرگیا، کیونکہ اس کے دِل پر علم نے اثر کیا تھا۔ اور یہودی اور منافق کہا کرتے کہ ہمارے دِل پردوں میں ہیں، آپ کا کلام اثر نہیں کرتا۔

ہمارے دِلوں پر پردے:

ہمارے دِل بھی پردوں میں ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سن لیتے ہیں لیکن اس طرح جھاڑ کر کے چلے جاتے ہیں جس طرح کہ کوئی اجنبی چیز لگ جاتی ہے۔ جیسے اس کو آدمی جھٹک دیتا ہے اور وہ صاف ہوجاتی ہے، ہمارے دِل پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات اثر نہیں کرتی، دِل میں رچتی بستی نہیں، لا اِلٰہ اِلَّا اللہ!

اللہ کی پیشی کا منظر:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی عادت شریفہ تھی کہ جو وعظ فرماتے تھے وہ قسم کھاتے تھے تاکہ لوگوں کو ان کی بات کا یقین آجائے اور قسم کھا کر فرماتے تھے کہ: تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ رَبّ العزّت کی بارگاہ میں پیش ہوگا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہائی میں بات کرے گا، جس طرح کہ چودھویں رات کے چاند کو ہر

آدمی الگ الگ دیکھتا ہے، کوئی اس کے درمیان اور چاند کے درمیان حائل نہیں ہوتا، تم میں سے ہر ایک آدمی بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا اور ہر ایک آدمی اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوگا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی مجھ سے ہم کلام ہو تو تمہارے ساتھ ہم کلام ہونے سے مانع نہیں، تم سے بھی ہم کلام ہو، فلانے سے بھی ہم کلام ہو، فلانے سے بھی ہم کلام ہو، تمام اہلِ محشر سے بیک وقت ہم کلام ہوں، ان کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہم تو ایسے ہیں کہ اگر ایک بات کرنے لگے، کہیں گے ٹھہر جاؤ بھئی دُوسرے آدمی کو بات کرنے دو، مگر وہاں ایسا نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ بیک وقت ساری دُنیا کے انسانوں سے بات کریں گے اور ایک کا کلام دُوسرے کے کلام سے مانع نہیں ہوگا، بات خلط ملط نہیں ہوگی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی مثال یوں دی کہ جیسے چودھویں کا چاند چمک رہا ہو، ہر ایک آدمی اس کو دیکھتا ہے۔

ضعیف بندوں کا اِستحضار:

ہمارے ایک بزرگ حضرت قاری رحیم بخش رحمہ اللہ تھے، میں نے ان کو دیکھا ہے، ان کی خدمت میں بیٹھا ہوں، ان کے پاس طالب علم پڑھا کرتے تھے، پورا کمرہ بھرا ہوا ہوتا تھا، اور طالب علم ایک دُوسرے کے پیچھے بیٹھتے تھے، جگہ تنگ ہوتی تھی، پڑھنے والے زیادہ ہوتے تھے اور وہ اپنا اپنا پڑھ رہے ہوتے، حضرت قاری صاحب ایک آدمی کا نام لے کر کہتے کہ تو نہیں پڑھ رہا، حالانکہ دس آدمی آپ کے اِردگرد لائن بنا کر سنانے کے لئے بیٹھے ہوتے تھے، اسی طرح دُوسرے طالب علم بھی پڑھ رہے ہوتے تھے، جو دس آدمی سنانے کے لئے حاضر ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک آدمی کی غلطی پر آپ ٹوکتے تھے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ضعیف اور کمزور بندوں کا حال ہے، اللہ تعالیٰ کی کیا بات ہے؟ یہ بات ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، ہم اپنے ذہن سے اُوپر سوچ ہی نہیں سکتے۔

اللہ کی سماعت کا حال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: اندھیری رات میں اگر چھوٹی سی چیونٹی چلتی ہے، تو اس کے چلنے کی آواز بھی اللہ تعالیٰ سنتے ہیں۔ اور یہ تو اللہ تعالیٰ کے سننے کی بات ہے۔

اللہ کی رُبوبیت کا حال:

اللہ تعالیٰ کے پالنے کی بات یہ ہے کہ ایک پتھر لے لو اس کو توڑ لو، سات ٹکڑے اس کے ہوئے ہیں، سات تہیں اور ساتویں تہہ کے اندر ایک کیڑا نکلا جس کے منہ میں ہرا پتا ہے، ''فَتَبَارَکَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ'' بابرکت ہے وہ ذات جو بہترین پیدا کرنے والی ہے۔ اور جو سب سے عمدہ رزق دینے والا ہے، وہ ان کو بھی نہیں بھولتے۔

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: ایک وقت آئے گا کہ تم میں سے ایک ایک آدمی اللہ تعالیٰ سے اس طرح ہم کلام ہوگا اور اس کو اس طرح دیکھے گا جس طرح کہ ایک کا دیکھنا دُوسرے کے دیکھنے سے مانع نہیں ہوگا۔

اللہ کا بندے سے سوال:

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! تجھ کو کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں ڈالا؟ قرآنِ کریم میں ہے:

''يَآأَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِيْمِ''

(الانفطار:٦)

ترجمہ:... ''اے انسان! تیرے کریم رَبّ کے معاملے میں تجھے کس چیز نے دھوکے میں ڈالا؟''

ایک بزرگ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے: ''يَا رَبِّ غَرَّنِيْ

حِلْمُکَ وَکَرَمُکَ!" آپ کے حلم نے اور آپ کے کرم نے ہمیں دھوکے میں ڈالا۔ اے ابنِ آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟ اے ابنِ آدم! تو نے جو سیکھا تھا اس پر کتنا عمل کیا تھا؟

علم پر عمل کرنے کی ترکیب:

آج ایک فہرست بنالو ایک دن کی کہ ہم نے آج کے دن کتنی چیزیں سیکھیں اور کتنی سیکھی ہوئی چیزوں پر ہم نے عمل کیا؟ باقی عمر کا اندازہ بعد میں ہوجائے گا، ایک دن کے علم کا اور عمل کا موازنہ کرنا اور اس کے بعد پھر دُوسری زندگی کو قیاس کرلو، یہ کمپیوٹر کا دور آگیا ہے، اب تو یہ چھوٹا سا کمپیوٹر ہوتا ہے دُنیا کی سب چیزیں بھردی جاتی ہیں، عقل حیران ہے کہ ساری چیزیں اس میں کیسے سما جاتی ہیں؟ اور بٹن دباؤ تو ساری چیزوں کی تفصیل بتادے گا، ہمارے چھوٹے سے دِماغ نے اس کمپیوٹر کو بنایا ہے، تو جس اللہ نے اس دِماغ کو بنایا ہے، اس کی قوّت وقدرت کا کیا حال ہوگا؟ تو جس اللہ تعالیٰ نے اس کمپیوٹر کو بنایا ہے، ساری دُنیا کی معلومات اس کے پاس محفوظ ہیں، بس بٹن دبانے کی ضرورت ہے، سب کچھ سامنے آجائے گا۔ میرے بھائی! یہ دیکھیں کہ ہمارے کمپیوٹر میں کتنی معلومات ہیں؟ اور ہم نے ان معلومات میں سے کتنی باتوں پر عمل کیا ہے؟

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ، أَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُکَ وَأَتُوْبُ اِلَیْکَ۔

سوال:...عورت جانور ذبح کرسکتی ہے؟

جواب:...جی ہاں! کرسکتی ہے۔

سوال:...آدھا پارہ صبح کو اور آدھا پارہ شام کو تلاوت کرتا ہوں، ٹھیک ہے؟

جواب :...جی ہاں! ٹھیک ہے۔

سوال :...میری اہلیہ صبح کو آدھا پارہ پڑھتی ہیں، شام کو مغرب کے بعد الم سجدہ، یٰسین شریف، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ، سورۂ حدید، سورۂ ملک پڑھتی ہیں، اور کہتی ہیں کہ میری ایک پارے کے برابر تلاوت ہوگئی، کیا یہ دُرست ہے؟

جواب :...ٹھیک ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں، لیکن پورا قرآن مجید پڑھنا الگ چیز ہے، اور ٹکڑے سورتوں کے پڑھنا الگ چیز ہے، سورتیں بھی پڑھ لو، لیکن پورے قرآن کی تلاوت بھی کرو۔

سوال :...بہن کے شوہر سے پردے کا حکم ہے؟

جواب :...اس سے پردہ ہوتا ہے۔

سوال :...کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا ہے؟

جواب :...میرے بھائی! اپنے دیدار کی بات کرو۔

سوال :...حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کے خواب میں آئے؟ اگر آئے تو اس کا ثبوت دے دیں۔

جواب :...ثبوت تو میرے پاس یہاں نہیں ہوتا، کتابیں میرے پاس نہیں ہوتیں، باقی یہ بات حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہے کہ اکابر صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے اُمت اور بزرگانِ دِین کے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم آتے رہے اور اس معاملے میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں!

بغیر علم کے مسئلہ مت بتاؤ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی وراثت کا مسئلہ کسی نے پوچھا تھا، تو انہوں نے فرمایا: بھائیو! مجھے معلوم نہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں، سالہا سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، لیکن ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ لوگ کہیں گے کہ ان کو مسئلہ بھی معلوم نہیں، صحابہ کرامؓ کی یہی شان تھی، اگر بات ان کو معلوم ہوتی تھی تو بتادیتے تھے اور اگر نہیں معلوم ہوتی تھی تو بتادیتے تھے: ”لا ادری!“ میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:... ”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: مَكَثْتُ سَنَتَيْنِ أُرِيْدُ أَنْ أَسْئَلَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ عَنْ حَدِيْثٍ، مَا مَنَعَنِیْ مِنْهُ اِلَّا هَيْبَتَهٗ حَتّٰى تَخَلَّفَ فِیْ حَجٍّ وَّعُمْرَةٍ .... اَلَّتِیْ بِبَطْنِ مَرّا الظَّهْرَانِ فِیْ حَاجَتِهٖ فَلَمَّا جَاءَهٗ وَخَلَوْتُ بِهٖ قُلْتُ: يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! أُرِيْدُ أَنْ أَسْئَلَكَ عَنْ شَیْءٍ مُّنْذُ سَنَتَيْنِ مَا يَمْنَعُنِیْ اِلَّا هَيْبَةً لَّكَ، قَالَ: فَلَا تَفْعَلْ، اِذَا أَرَدْتَّ أَنْ تَسْئَلِیْ فَسَلْنِیْ فَاِنْ كَانَ مِنْهُ عِنْدِیْ عِلْمٌ أَخْبَرْتُهٗ وَاِلَّا قُلْتُ: لَا أَعْلَمُ! فَسَئَلْتَ مَنْ يَّعْلَمُ، قُلْتُ: مَنِ الْمَرْئَتَانِ اللَّتَانِ ذَكَرَهُمَا اللهُ أَنَّهُمَا تَظَاهَرَتَا عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: عَائِشَةُ وَحَفْصَةُ۔ فَذَكَرَ الْحَدِيْثَ بِطُوْلِهٖ۔“

(حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۲۱۶، بحوالہ ابن عبدالبر فی العلم ج:۱ ص:۱۳۰)

ترجمہ:... ”یعنی حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان علم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ میں دو سال تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا،

لیکن ان کی ہیبت اور ان کا رُعب آڑے آتا تھا، اس وجہ سے دو سال تک میں پوچھ نہیں سکا، حضرت عمرؓ ایک دفعہ حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے ...دُوسرے لوگ آگے چلے گئے... وہ اپنی کسی ضرورت کے لئے پیچھے رہ گئے، میں ان کے ساتھ تھا، اور پھر اپنی ضرورت پوری کرکے واپس آئے ...اور پیلو کے درخت کے نیچے آکر کے لیٹ گئے... میں نے کہا: امیرالموٴمنین! دو سال ہوگئے ہیں میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، لیکن آپ کا رُعب اور آپ کی ہیبت مجھے پوچھنے نہیں دیتی۔ فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، جو بات پوچھنی ہو، پوچھ لیا کرو۔ بات یہ ہے کہ اگر وہ بات مجھے معلوم ہوگی تو میں بتادوں گا، اور اگر مجھے معلوم نہیں ہوگی، تو میں کہہ دوں گا کہ مجھے معلوم نہیں، کسی اور سے معلوم کرلو۔ میں نے کہا: میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ سورۂ تحریم میں جن دو عورتوں کا تذکرہ آیا ہے اور ان کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ”أَنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ“ یعنی دونوں عورتوں نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز پوچھنا چاہی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈانٹا، یہ کون عورتیں تھیں؟ حضرت عمرؓ فرمانے لگے: تمہیں معلوم نہیں، یہ کون عورتیں تھیں؟ وہ دونوں عورتیں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ تھیں۔“

اُم الموٴمنین حضرت عائشہ اور اُمّ الموٴمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما، ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہیں اور ایک امیر الموٴمنین حضرت عمرؓ کی بیٹی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ان سے خطاب ہے: ”اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا“... اگر تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی بات کرتی ہو تو تمہیں اس سے رُجوع

کرلینا چاہئے کیونکہ تمہارے دِل مائل ہوگئے ہیں...۔

عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ کرتے ہیں ”فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا“ کہ تمہارے دِل ٹیڑھے ہوچکے ہیں، ہمارے حضرت حکیم الامتؒ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: پس تمہارے دِل مائل ہوچکے ہیں توبہ کی طرف، اب موقع ہے اور اگر تم بے پروائی کروگی تو ”فَاِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلٰـهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَهِیْرٌ“... اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آقا ہے اور جبریل امین بھی آپ کے رفیق ہیں اور نیک ایمان والے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر ہیں... یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔

دُوسری روایت میں ہے کہ کسی شخص نے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ”صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ“ کن کو کہا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ فرمانے لگے: ابوبکرؓ وعمرؓ ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ان کی مدح فرمائی ہے۔

۲:... ”عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ قَالَ: قُلْتُ لِسَعْدِ بْنِ مَالِکٍ - رَضِیَ اللهُ عَنْهُ- : اِنِّیْ أُرِیْدُ أَنْ أَسْأَلَکَ عَنْ شَیْءٍ وَّاِنِّیْ أَهَابُکَ، فَقَالَ: لَا تَهِبْنِیْ یَا ابْنَ أَخِیْ! اِذَا عَلِمْتَ أَنَّ عِنْدِیْ عِلْمًا فَسَلْنِیْ عَنْهُ! قَالَ: قُلْتُ: قَوْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ - رَضِیَ اللهُ عَنْهُ - فِیْ غَزْوَةِ تَبُوْکَ حِیْنَ خَلَّفَهٗ؟ فَقَالَ سَعْدٌ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: یَا عَلِیُّ! أَمَا تَرْضٰی أَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی؟“

(طبقات ابن سعد ج:۳ ص:۲۴)

ترجمہ:...”حضرت سعید بن مسیّبؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سعد بن مالک (سعد بن ابی وقاص) رضی اللہ عنہ سے

میں نے پوچھا، میں نے کہا کہ: میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں لیکن مجھے ہیبت ہوتی ہے، وہ کہنے لگے: میرے بھتیجے! تم مجھ سے ہیبت نہ کرو، اگر اس کا علم مجھے ہوگا تو میں تمہیں بتادوں گا، اور اگر علم نہیں ہوگا تو میں بتادوں گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے جارہے تھے، حضرت علیؓ کو چھوڑ گئے تھے اپنی جگہ ...لوگوں نے ان کو طعنہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سب صحابہؓ کو ساتھ لے گئے ہیں اور ان کو چھوڑ گئے ہیں، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا: منافق میرے بارے میں اس طرح کہہ رہے ہیں... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کیا ارشاد فرمایا تھا؟ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: علی! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری میرے نزدیک وہی حیثیت ہو جو ہارون (علیہ السلام) کی حیثیت موسیٰ (علیہ السلام) کے نزدیک تھی۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر کتاب لینے کے لئے تشریف لے گئے تھے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چالیس دن کا روزہ رکھو، تو حضرت کا چلہ وہاں لگ گیا، حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی جگہ قوم کے لئے اپنا خلیفہ بنا کر گئے تھے۔

حدیث ”أَنْتَ مِنِّی“ متواتر ہے:

چنانچہ یہ حدیث جو حضرت علیؓ سے فرمائی تھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث

دہلویؒ اپنی کتاب ''ازالۃ الخفاء'' میں لکھتے ہیں کہ: یہ حدیث متواترات میں سے ہے، یعنی اس حدیث کو بہت سے حضرات روایت کرنے والے ہیں۔ ان میں سب سے اوّل نمبر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: ''اما ترضیٰ أن تکون مِنّی بمنزلة هارون من موسٰی؟'' یہاں تو روایت اتنی ہی ہے، لیکن اگلی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''انہ لا نبی بعدی'' مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت ہارون علیہ السلام تھے اور اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ حضرت علیؓ تھے۔

روافض کے شبہ کا جواب:

یہ بے چارے شیعہ استدلال کیا کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ بنایا تھا، ہم کہتے ہیں: ٹھیک کہتے ہو، لا ریب فیہ، لیکن جتنی دیر تک کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام رہے، اس وقت تک حضرت ہارون علیہ السلام ان کے خلیفہ رہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آگئے تو ان کی خلافت ختم ہوگئی، جنگِ تبوک کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہینے سے زیادہ وقت لگا تھا، اور ان دنوں میں حضرت علیؓ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو ان کی خلافت و نیابت ختم ہوگئی۔

حضرت علیؓ اور حضرت ہارونؑ کی مشابہتیں تلاش نہ کرو:

عجیب بات یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں چھوٹے تھے، اور اس سے بڑھ کر بات یہ کہ حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دُنیا سے تشریف لے گئے تھے، ان کی وفات پہلے ہوئی، اگر ساری چیزوں میں

مشابہت نکالنا چاہتے ہو تو پھر یہ بھی ہوگا۔ اور یہ عجائبات میں سے ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے قوم گمراہ ہوگئی تھی، اور بالکل یہی ہوا حضرت علیؓ کے ساتھ بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے، ان کے بعد حضرت عمرؓ ہوئے، ان کے بعد حضرت عثمانؓ ہوئے، اور ان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے، ان کی خلافت کے زمانے میں قوم بگڑ گئی۔

''نہج البلاغہ'' شیعوں کی کتاب ہے، اس میں انہوں نے حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ تیار کیا ہے، اس میں ایک جگہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

لوگ کہتے ہیں کہ ابوطالب کے بیٹے کو سیاست نہیں آتی۔ بھائی! وقت کی بات ہوتی ہے۔

اہلِ سنت کے ہاں علیؓ کا مقام:

ہمارا اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں جو کچھ کیا حضرت علیؓ اگر ان کی جگہ ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے، اور اپنے زمانے میں جو کچھ حضرت علیؓ نے کیا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کے زمانے میں ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے۔ ہم لوگ حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی ٹکر کا آدمی سمجھتے ہیں، اس صف کا آدمی سمجھتے ہیں، یہ چار ہی پیدا ہوئے تھے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ، ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم، اس کے بعد ان جیسا کوئی نہیں آیا اور نہ ہی کوئی آسکتا ہے۔

سچے فقیہ کی علامت:

۳:... ''مَرَّ جُبَیْرُ بْنُ مُطْعِمٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ عَلٰی مَاءٍ فَسَأَلُوْہُ عَنْ فَرِیْضَةٍ، فَقَالَ: لَا عِلْمَ لِیْ وَلٰکِنْ أَرْسِلُوْا

مَعِیْ حَتّٰی أَسْأَلَ لَکُمْ عَنْھَا! فَأَرْسَلُوْا مَعَهٗ فَأَتٰی عُمَرُ رَضِیَ اللہُ عَنْهُ فَسَأَلَهٗ فَقَالَ: مَنْ سَرَّهٗ أَنْ یَّکُوْنَ فَقِیْھًا عَالِمًا فَلْیَفْعَلْ کَمَا فَعَلَ جُبَیْرُ بْنُ مُطْعَمٍ! سُئِلَ عَمَّا لَا یَعْلَمُ، فَقَالَ: اَللہُ أَعْلَمُ۔"

(کنز العمال ج:۶ ص:۲۹۹، ۳۰۰، حدیث: ۲۹۵۰۸)

ترجمہ:... "حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ایک پانی پر گئے تو لوگ آپ سے وراثت کا مسئلہ پوچھنے لگے، جلیل القدر صحابی ہیں، لیکن فرمانے لگے: بھائی! مجھے معلوم نہیں، تم کچھ آدمیوں کو میرے ساتھ بھیج دو، میں مسئلہ پوچھ کر ان کو بتاتا ہوں۔ ایک دو آدمی ان کے ساتھ آگئے مدینہ طیبہ، حضرت عمرؓ سے مسئلہ پوچھا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: جو شخص پکا اور سچا فقیہ بننا چاہے وہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی طرح کرے، ان کو مسئلہ نہیں آتا تھا تو انہوں نے کہہ دیا کہ مجھے مسئلہ نہیں آتا۔"

یعنی حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ ایک چشمے پر گئے، وہاں کچھ آبادی تھی لوگوں کی، جہاں پانی ٹھنڈا ملتا تھا، کوئی چشمہ وغیرہ ہوتا تھا، وہاں کچھ آبادی ہوجاتی تھی لوگوں کی، چنانچہ مکۃ المکرّمۃ جنگل بیابان تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی لگانے سے اور حقیقت میں حضرت جبریل علیہ السلام کے پَر مارنے سے چشمہ پھوٹ پڑا، اور وہ چشمہ آج تک ہے اور قیامت تک رہے گا، ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور ایک ان کی والدہ ماجدہ ہیں، ان کے علاوہ کوئی آدمی و بشر نہیں وہاں، ایک قافلہ جارہا تھا قبیلہ بنی جرہم کا، انہوں نے دیکھا کہ یہاں پرندے نظر آرہے ہیں، جاکر دیکھا تو وہاں پانی ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سے کہنے لگے: بی بی! اگر تم اجازت دو تو ہم یہاں ٹھہر جائیں؟ اللہ تعالیٰ آبادی کا سامان کر رہے ہیں،

فرمانے لگیں: تم شوق سے ٹھہر سکتے ہو، لیکن اس پانی پر کسی کا حق نہیں ہوگا۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے! چنانچہ انہیں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بڑے ہوکر شادی بھی کرلی، تو عرب میں پانی کی شدید قلّت ہے، کسی جگہ کوئی چشمہ نکل آتا ہے تو لوگ اس کے اِردگرد جمع ہوجاتے ہیں جس کی بنا پر وہاں بستی بن جاتی ہے۔

مسئلہ نہ آئے تو نہ بتاؤ:

خلاصہ یہ کہ ایک آدمی کو مسئلہ نہیں آتا تو اپنی طرف سے گھڑ کر نہ بتائے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ بتایا ہوگا۔ وراثت کا مسئلہ ذرا مشکل ہوجاتا ہے، صحابہ کرامؓ میں اس کے سب سے زیادہ ماہر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔

ابنِ عمرؓ کا اظہارِ لاعلمی:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی وراثت کا مسئلہ کسی نے پوچھا تھا، تو انہوں نے فرمایا: بھائیو! مجھے معلوم نہیں۔ جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں، سالہا سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، لیکن ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ لوگ کہیں گے کہ ان کو مسئلہ بھی معلوم نہیں، صحابہ کرامؓ کی یہی شان تھی، اگر بات ان کو معلوم ہوتی تھی تو بتادیتے تھے اور اگر نہیں معلوم ہوتی تھی تو بتادیتے تھے: ”لا ادری!“ میں نہیں جانتا۔

غلط مسئلہ بتلانے کا وبال:

۳:... ”عَنْ عُقْبَةَ بْنِ مُسْلِمٍ قَالَ: صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ أَرْبَعَةً وَّثَلَاثِيْنَ شَهْرًا فَكَانَ كَثِيْرًا مَّا يُسْأَلُ فَيَقُوْلُ: لَا أَدْرِيْ! ثُمَّ يَلْتَفِتُ اِلَيَّ فَيَقُوْلُ: أَتَدْرِيْ مَا يُرِيْدُ هٰؤُلَاءِ؟ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّجْعَلُوْا ظُهُوْرَنَا جِسْرًا اِلٰى جَهَنَّمَ۔“

(ابن عبدالبر، فی جامع العلم ج:۲ ص:۵۴)

ترجمہ:...''ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں چونتیس مہینے رہا، اور لوگ آپ سے مسئلہ پوچھتے تو آپ فرماتے: ''لَا اَدْرِیْ!'' مجھے معلوم نہیں! ایک دن مجھ سے کہنے لگے: آپ جانتے ہو کہ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہ مجھ سے جو مسائل پوچھتے ہیں، کیا چاہتے ہیں؟ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اگر جہنم میں جائیں تو ہمیں پل بنا کر جائیں۔''

اگر مسئلہ معلوم نہیں ہوتا تو آج کا عالم یہ نہیں کہتا کہ میں کسی سے پوچھ لوں گا، یا کتاب دیکھ لوں گا، پھر بتاؤں گا، نہیں! کوئی نہ کوئی گھڑ کر بات ضرور بتاتا ہے، اور لوگوں کی غرض اور مقصد یہ ہے کہ لوگ اکیلے جہنم میں نہ جائیں ہمیں پل بنا کر کے جائیں۔

محاسبۂ آخرت کے خوف سے چپ ہونا:

۴:...''عَنْ نَّافِعٍ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ ابْنَ عُمَرَ عَنْ مَّسْأَلَةٍ فَطَأْطَأَ ابْنُ عُمَرَ رَأْسَهٗ وَلَمْ يُجِبْهُ حَتّٰى ظَنَّ النَّاسُ أَنَّهٗ لَمْ يَسْمَعْ مَسْأَلَتَهٗ، قَالَ: فَقَالَ لَهٗ: يَرْحَمُكَ اللهُ! أَمَا سَمِعْتَ مَسْأَلَتِيْ؟ قَالَ: بَلٰى! وَلٰكِنَّكُمْ كَأَنَّكُمْ تَرَوْنَ أَنَّ اللهَ لَيْسَ بِسَائِلِنَا عَمَّا تَسْأَلُوْنَنَا عَنْهُ، أُتْرُكْنَا يَرْحَمُكَ اللهُ! حَتّٰى نَتَفَهَّمَ فِيْ مَسْأَلَتِكَ، فَإِنْ كَانَ لَهَا جَوَابٌ عِنْدَنَا، وَإِلَّا أَعْلَمْنَاكَ أَنَّهٗ لَا عِلْمَ لَنَا بِهٖ۔''

(ابن سعد ج:۴ ص:۱۶۸)

ترجمہ:...''ابن سعدؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کوئی مسئلہ پوچھا، انہوں نے سر جھکالیا، سر جھکا کر بیٹھے رہے، لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید انہوں نے بات سنی نہیں، اور پوچھتے ہیں کہ جناب! میں نے آپ سے ایک بات پوچھی تھی، آپ نے سنی نہیں؟ فرمایا کہ: سن لی ہے، تمہاری بات تو سن لی ہے، لیکن شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی پوچھیں گے کہ تم نے کیسا بتایا تھا؟ ہمیں مہلت دو تاکہ ہم تمہارے سوال کا جواب سوچ لیں، اگر آپ کے سوال کا جواب معلوم ہوگا تو ہم بتادیں گے، ورنہ ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں اس کا جواب نہیں آتا۔"

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو محاسبۂ آخرت کا خوف خاموش ہونے پر مجبور کرتا تھا۔

صحابہؓ کا ایک دُوسرے پر ٹالنا:

ایک مرتبہ متعدّد صحابہ کرامؓ موجود تھے، ایک صاحب نے مسئلہ پوچھا، آپ نے فرمایا: دُوسرے سے پوچھ لو! انہوں نے کہا: اس سے پوچھ لو! انہوں نے کہا: اس سے پوچھ لو! لوٹ پھر کر وہی آدمی پہلے کے پاس آگیا۔ اور اگر ہماری جماعت موجود ہو، ہمارے آدمی موجود ہوں، کوئی عالم موجود ہو، کوئی مسئلہ پوچھے، مولوی تو بعد میں بتائے گا، ہم پہلے بتادیں گے، ہم مسئلہ پہلے بتادیں گے، اس لئے کہ ہمیں احساس ہی نہیں کہ قیامت کے دن ہم سے بھی پوچھا جائے گا۔

مسئلہ آدمی کو معلوم ہو تو بتادے، ضرور بتانا چاہئے اور اگر معلوم نہ ہو تو بجائے اپنے پاس سے گھڑنے کے یہ کہہ دے کہ بھائی! مجھے معلوم نہیں۔

مسئلہ آتا ہو تو بتلا دو، ورنہ کہہ دو نہیں آتا:

۵:...''عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: أَیُّھَا النَّاسُ! مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ یَّعْلَمُہٗ فَلْیَقُلْ بِہٖ! وَمَنْ لَّمْ یَکُنْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ فَلْیَقُلْ: اَللّٰہُ أَعْلَمُ! فَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ یَّقُوْلَ لِمَا لَا یَعْلَمُ: اَللّٰہُ أَعْلَمُ۔ اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی قَالَ لِنَبِیِّہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: قُلْ مَآ أَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ۔'' (ابن عبدالبر فی جامع العلم ج:۲ ص:۵۱)

ترجمہ:...''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تقریر فرمائی، اس میں فرمایا: لوگو! جس سے کوئی دِین کی بات پوچھی جائے اگر اس کو علم ہو تو اس کو بتادے، اور اگر علم نہ ہو تو صاف کہہ دے کہ بھائی! مجھے معلوم نہیں، کسی اور سے پوچھ لو۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں: اے نبی! آپ یہ فرمادیجئے کہ میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگ رہا، (اللہ کا دِین ہے جو اللہ بتاتے ہیں میں تم کو بتادیتا ہوں) اور میں تکلف کرنے والا نہیں ہوں کہ بناکے خود ہی بات گھڑلوں۔''

۶:...''عَنْ عَبْدُاللّٰہِ بْنِ بَشِیْرٍ أَنَّ عَلِیَّ بْنَ أَبِیْ طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سُئِلَ عَنْ مَّسْأَلَۃٍ فَقَالَ: لَا عِلْمَ لِیْ بِھَا! ثُمَّ قَالَ: وَأَبْرَدَھَا عَلَی الْکَبِدِ، سُئِلْتُ عَمَّا لَا أَعْلَمُ فَقُلْتُ: لَا أَعْلَمُ۔'' (کنز العمال ج:۱۰ ص:۳۰۲ حدیث:۲۹۵۱۸)

ترجمہ:...''حضرت عبداللہ بن بشیرؒ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے مسئلہ پوچھا گیا

تو انہوں نے فرمایا: مجھے علم نہیں۔ اس صاحب نے کوئی اور بات پوچھی تو فرمایا: مجھے اس کا علم نہیں۔"

ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ ارشاد فرماتے تھے کہ: ان کے اُستاذ حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے کوئی مسئلہ پوچھتا تھا، ...حضرتؒ تو علوم کے حافظ تھے، کوئی مسئلہ پوچھتا... کہ: حضرت! یہ مسئلہ کس طرح ہے؟ تو فرماتے کہ: حنفیہ تو اس بارے میں کچھ نہیں لکھتے، یعنی حضرت اِمام ابوحنیفہؒ کے مقلد تو اس بارے میں کچھ نہیں لکھتے، البتہ مالکیہؒ کچھ نہ کچھ لکھ دیتے ہیں، پھر حضرتؒ ان کا مسلک بتاتے۔ اور کبھی فرماتے کہ: یہ مسئلہ میں نے کسی جگہ نہیں دیکھا، البتہ میں نے چارہ کرلیا ہے، یعنی میں نے کچھ نہ کچھ اس کا جواب بنالیا ہے۔

خیر! ہمارے حضرت بنوری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ نے ساری زندگی اسی ایک مسئلے میں گزار دی ہے، اتنے بڑے آدمی تھے۔

مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے اُستاذ تھے، وہ ارشاد فرماتے کہ: جب میرے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو میں دارالعلوم کا کتب خانہ کھنگال لیتا، جب کہیں سے اس کا حل نہ ملتا تو میں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں جاتا اور کہتا کہ: حضرت! یہ مسئلہ درپیش ہے۔ اگر اس کا حل کسی کتاب میں ہوتا تو حضرت فرماتے کہ فلاں کتاب میں ہے، اور اگر حضرت یہ فرماتے کہ نظر سے کہیں نہیں گزرا تو میں سمجھ لیتا کہ دُنیا کی کسی کتاب سے نہیں مل سکتا۔

اب یہ دیکھو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان سے بڑا آدمی کون ہوگا؟ لیکن بعض جگہ فرماتے کہ: نہیں بھائی! مجھے معلوم نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خاتون سے شکست ماننا:

۷:... ’’عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مُصْعَبٍ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: لَا تَزِیْدُوْا فِیْ مُھُوْرِ النِّسَاءِ عَلٰی أَرْبَعِیْنَ أُوْقِیَۃً، (وَلَوْ کَانَتْ بِنْتُ ذِی الْغُصَّۃِ) یَعْنِیْ یَزِیْدَ بْنَ الْحُصَیْنِ الْحَارِثِیَّ، فَمَنْ زَادَ أَلْقَیْتُ زِیَادَتَہٗ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ۔ فَقَامَتِ امْرَأَۃٌ مِّنْ صَفِّ النِّسَاءِ طَوِیْلَۃً فِیْھَا فَطْسٌ، فَقَالَتْ: مَا ذَاکَ لَکَ! قَالَ: وَلِمَ؟ قَالَتْ: لِأَنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَقُوْلُ: ’’وَاٰتَیْتُمْ اِحْدَاھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا‘‘ فَقَالَ عُمَرُ: اِمْرَأَۃٌ أَصَابَتْ وَرَجُلٌ أَخْطَأَ۔‘‘

(ابن عبدالبر فی جامع العلم ج:۱ ص:۱۳۱)

ترجمہ:... ’’حضرت عبداللہ بن مصعبؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں یہ فرمایا کہ: عورتوں کا مہر چالیس اوقیہ سے زیادہ نہ باندھا کرو۔ اگرچہ قیس بن حصین کی بیٹی کا مہر ہی کیوں نہ ہو، جس نے اس سے زیادہ مہر باندھا وہ بیت المال میں جمع کرادوں گا۔ ایک خاتون کھڑی ہوگئی، وہ کہنے لگی: تم کیا بات کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ’’اگر تم نے مال کا ایک ڈھیر عورتوں کو مہر میں دے دیا ہو تو اس میں سے کوئی چیز نہ لو‘‘ حضرت عمرؓ نے فرمایا: عورت ٹھیک کہتی ہے، مرد سے غلطی ہوئی۔‘‘

حق مہر میں اکابر کا ذوق:

ہمارے حضرت مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ مہرِ فاطمی رکھتے تھے، جس نے حضرتؒ

سے نکاح پڑھوانا ہوتا حضرتؒ شرط لگاتے کہ مہرِ فاطمی پر نکاح پڑھاؤں گا۔ ایک سو اِکتیس تولہ تین ماشہ چاندی یہ مہرِ فاطمی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کا اور اپنی بیٹیوں کا یہی مہر رکھتے تھے، البتہ حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا ہماری ماں اُمّ المؤمنین یہ حبشہ میں تھیں، ان کے شوہر نے اِرتداد اختیار کرلیا تھا اور بعد میں مرگیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ کو لکھا کہ: میرا نکاح اُمِّ حبیبہ سے کردیا جائے، حبشہ کے بادشاہ نے جو صحابہؓ وہاں گئے ہوئے تھے ان کو بلایا، حضرت اُمِّ حبیبہؓ سے اجازت لینے کے لئے، بادشاہ نے اپنی باندی بھیجی اور حضرت اُمِّ حبیبہؓ نے اس خوشی میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کا پیغام بھیجا ہے، اس لونڈی کو کوئی چیز دے دی، نجاشی کو پتا چلا اس نے لونڈی سے کہا: واپس کردو! وہ چیز بھی واپس کرادی اور شاہی خاندان کی تمام عورتوں کو حکم دیا کہ حضرت اُمِّ حبیبہ کو تحائف دیں، ان کا مہر نجاشی نے چار ہزار رکھا تھا اور وہ مہر اپنے پاس سے ادا کیا تھا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا یہ باندی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کرکے ان سے نکاح کرلیا، حضرت صفیہؓ نے فرمایا: مجھے اور نہیں چاہئے یہ بہت ہے! ان کے علاوہ جتنی مستورات تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مہر مہرِ فاطمی ہی رکھا۔ تو حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شرط ہوتی تھی کہ مہرِ فاطمی رکھیں گے۔

ہمارے شیخ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلے میں عجیب وغریب لطائف بھی لکھے ہیں۔

بہرحال حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور فرمایا: عورتوں کا مہر زیادہ نہ رکھا کرو، اس لئے کہ اگر یہ کرامت کی چیز ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے، آپ نے اپنی ازواج کا اور اپنی بیٹیوں کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہیں رکھا۔

ایک خاتون کھڑی ہوگئی اور وہ کہنے لگی کہ: اے عمر! تم کیا بات کرتے ہو؟ ...حضرت عمرؓ امیر المؤمنین ہیں اور وہ ایک عام عورت ہے... کہنے لگی: عمر! تم کیا بات کرتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں: ’’وَاٰتَیْتُمْ اِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا‘‘... اگر تم نے مال کا ایک ڈھیر عورتوں کو مہر میں دے دیا ہو تو اس میں سے کوئی چیز نہ لو... اللہ تعالیٰ اجازت دیتے ہیں ڈھیر دینے کی، اور آپ منع کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ خاموش ہوگئے اور فرمانے لگے: عمر سے تو مدینہ کی عورتیں بھی فقیہ ہیں۔

حضرت علیؓ کا اپنی خطا کا اعتراف:

۸:...’’عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ كَعْبٍ الْقُرَظِيِّ قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنْ مَّسْأَلَةٍ فَقَالَ فِيْهَا، فَقَالَ الرَّجُلُ: لَيْسَ كَذٰلِكَ يَا أَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! وَلٰكِنْ كَذَا وَكَذَا، فَقَالَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: أَصَبْتَ وَأَخْطَأْتُ، وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔‘‘

(کنز العمال ج:۱۰ ص:۳۰۱، ۳۰۲، حدیث:۲۹۵۱۷)

ترجمہ:...’’محمد بن کعب القرظیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا، انہوں نے مسئلہ بتادیا، ایک آدمی کھڑا ہوکر کہنے لگا کہ: حضرت! یہ مسئلہ یوں نہیں ہے، بلکہ مسئلہ یوں ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ: تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے غلط کہا ہے۔‘‘

حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں، فرماتے ہیں کہ: تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے غلط کہا ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ‘‘ ہر علم والے کے اُوپر ایک علم والا ہے۔ یہ بڑی بات ہے، ہر علم والے سے اُوپر ایک علم والا

ہے، یہ سیّدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا جو کہ سورۂ یوسف میں ہے، اور سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ: ہر علم والے کے اُوپر ایک علم والا ہے، اس سے اُوپر ایک علم والا ہے، اس سے اُوپر ایک علم والا ہے، یہاں تک کہ معاملہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے، کیونکہ اس سے اُوپر کوئی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین سے بڑا آدمی کون ہوسکتا ہے؟ لیکن ایک چھوٹا سا آدمی ان کو کہتا ہے کہ: حضرت! مسئلہ اس طرح نہیں، مسئلہ تو اس طرح ہے۔ فرمانے لگے: تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے غلط کہا ہے۔

علم وتحقیق میں مباحثہ:

۹:... "عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ وَعُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَا يَتَنَازَعَانِ فِي الْمَسْأَلَةِ بَيْنَهُمَا حَتّٰى يَقُوْلَ النَّاظِرُ اِلَيْهِمَا: لَا يَجْتَمِعَانِ أَبَدًا۔" (کنز العمال ج:۱۰ ص:۳۰۱ حدیث:۲۹۵۱۳)

یعنی حضرت سعید بن المسیّبؒ جو اکابر تابعین میں سے ہیں اور بعض علماء نے کہا کہ سیّد التابعین ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھنے والے حضرات تابعین کہلاتے ہیں، اور ان تابعین کے سردار حضرت سعید بن المسیّبؒ تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، یہ فرماتے تھے کہ: میں نے دیکھا کہ حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو وہ دونوں کسی مسئلے میں بحث کرنے لگتے، گفتگو کرنے لگتے تو اتنا تیز وتند ہوجاتے کہ لگتا تھا کہ اب ان کی لڑائی ہونے لگے گی اور زندگی بھر نہیں بولیں گے، بس وہ گفتگو ختم ہوئی پھر بھائی بھائی ہیں۔

جدید تعلیم اور اس کے نتائج

علم دو قسم کے ہوتے ہیں:

ا:... ایک دُنیا کا علم ہوتا ہے، ۲:... ایک آخرت کا علم ہوتا ہے۔ دُنیا کے کاموں کی طرف راہ نمائی کرنے والا علم، دُنیا کا علم کہلاتا ہے، اس علم کے ذریعے ہم اپنے کھانے کمانے کے طریقے معلوم کرتے ہیں، مثلاً: تجارت کا علم ہے، صنعت کا علم ہے، دُکان داری کا علم ہے، یعنی زراعت، حرفت، صنعت اور تجارت کا علم، اور ایک علمِ معاد ہے، اور وہ ہے موت کے وقت سے لے کر ابد الآباد کی زندگی تک راہ نمائی کرنے والا علم، اس علمِ معاش کی حد ہے، اس علمِ معاد کی حد نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

۱:... ”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: کُوْنُوْا أَوْعِیَۃَ الْکِتَابِ یَنَابِیْعَ الْعِلْمِ وَسَلُوا اللّٰہَ رِزْقَ یَوْمٍ بِیَوْمٍ۔“

(حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۵۱)

ترجمہ:... ”ابونعیم نے حلیہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپؓ نے فرمایا: کتاب اللہ کے برتن بنو اور علم کے چشمے بنو، اور اللہ تعالیٰ سے رزق مانگو ایک دن کا ایک دن کے ساتھ۔“

۲:... ”وَأَخْرَجَ أَیْضًا عَنْہُ قَالَ: جَالِسُوا التَّوَّابِیْنَ فَإِنَّہُ أَرَقُّ شَیْءٍ أَفْئِدَۃً۔“ (حلیۃ الاولیاء ج:۱ ص:۵۱)

ترجمہ:... ”اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ: توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو، اس لئے کہ وہ لوگ سب سے زیادہ نرم دِل ہوتے ہیں۔“

۳:... ”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَنْ خَافَ اللّٰہَ لَمْ یُشْفَ غَیْظُہٗ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ لَمْ یَصْنَعْ مَا یُرِیْدُ وَلَوْ لَا

یَوۡمَ الۡقِیَامَةِ لَکَانَ غَیۡرُ مَا تَرَوۡنَ۔“

(کنز العمال ج:۱٦ حدیث:۴۴۳۷۵)

ترجمہ:... ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپؓ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، وہ اپنے غصّے کو ٹھنڈا نہیں کرتا، اور جو اللہ سے خوف رکھتا ہو وہ اپنے غصّے کو ٹھنڈا نہیں کرتا، اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں کرتا، اور اگر قیامت کا دن نہ ہوتا تو جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اس کے سوا کچھ اور دیکھتے۔“

یہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مواعظ ہیں۔ پہلی روایت میں دو چیزوں کی نصیحت فرمائی ہے:

علم کے برتن اور چشمے بنو:

۱:... ایک یہ کہ کتاب اللہ کے برتن اور علم کے چشمے بنو۔ جس طرح کسی برتن میں کوئی چیز محفوظ ہوتی ہے، ایسے ہی تمہارے قلب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب محفوظ ہو، کتاب اللہ کو اپنے قلب میں محفوظ کرو، اور علم کے چشمے بنو، جس طرح چشمے سے پانی پھوٹتا ہے اسی طرح تمہارے دِل سے جب بھی کچھ پھوٹے تو علم کی بات ہی پھوٹے، تمہاری زبان سے علم کی بات ہی نکلے۔

علم دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱:... ایک دُنیا کا علم ہوتا ہے، اور ۲:... ایک آخرت کا علم ہوتا ہے۔

دُنیاوی علم:

دُنیا کے کاموں کی طرف راہ نمائی کرنے والا علم، دُنیا کا علم کہلاتا ہے، اس

علم کے ذریعے ہم اپنے کھانے کمانے کے طریقے معلوم کرتے ہیں، مثلاً: تجارت کا علم ہے، صنعت کا علم ہے، دُکان داری کا علم ہے، یعنی زراعت، حرفت، صنعت اور تجارت کا علم، گویا دُنیا کی معیشت کے یہ چار ذرائع بیان کئے گئے ہیں۔

سب سے پہلا ذریعہ زراعت ہے، زراعت یعنی زمین سے پیداوار اُگانا۔

دُوسرا ذریعہ حرفت ہے، یعنی دست کاری، اپنے ہاتھوں سے محنت کرکے چیزیں ایجاد کرنا۔

تیسرا ذریعہ صنعت ہے، بڑی بڑی چیزیں جو ایجاد کی جاتی ہیں اور جن چیزوں کے بنانے کے لئے آلات اور مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو صنعت کہتے ہیں۔

چوتھا ذریعہ تجارت ہے، اور تجارت کا مطلب ہے چیزوں کا تبادلہ کرنا۔

تجارت کی ضرورت:

حق تعالیٰ شانہٗ نے دُنیا کی ساری چیزیں ایک آدمی کو نہیں دیں، کسی کو کوئی چیز دی ہے، کسی کو کوئی چیز دی ہے، کسی علاقے میں کوئی ایک چیز ہوتی ہے، دُوسری چیز وہاں نہیں ہوتی تو اس کی ضرورت اس علاقے والوں کو پیش آتی ہے، دُوسرے علاقے میں دُوسری چیز فراوانی سے ہوتی ہے تو پہلی چیز وہاں نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تجارت کا اِلہام فرمایا، یعنی جن جن ملکوں میں یا جن جن علاقوں میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہاں ان چیزوں کو لے جایا کریں، اور وہاں سے ایسی چیزیں منگوائیں جن کی ان علاقوں کو ضرورت ہے، اور اس کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے بر و بحر کے سفر کی بھی ہدایت فرمادی، تجارتی سفر ہوتے ہیں خشکی کے راستوں سے بھی اور دریا کے راستے سے بھی، اور یہ اَسفار قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں، جیسے جیسے

زمانے میں ترقی ہو رہی ہے ویسے ہی ان ذرائع مواصلات میں بھی ترقی ہو رہی ہے، پہلے لوگ بیلوں پر، اُونٹوں پر اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے، اب لوگ ہوائی جہازوں پر سفر کرنے لگے۔

بہر کیف! تجارت معیشت کا ایک بنیادی پتھر ہے، اور معیشت کا ایک ذریعہ ملازمت بھی ہے، یہ پانچواں ذریعہ ہے، لیکن اس کو مستقل طور پر ذریعہ نہیں سمجھا جاتا، یہ تو ایسے وقتی سی چیز ہے، پیداوار اور معیشت کے ذرائع صرف یہ چار ہیں۔

زراعت کی تعریف اور ضرورت:

زراعت: یہ ہے کہ کسان زمین کے جگر کو چیر کر اور اس پر اپنی محنت کی پونجی لگا کر اس کو اُگانے کے قابل بناتا ہے، گویا ایک چیز جو موجود نہیں تھی اس کو وجود میں لاتا ہے، اور یہ زراعت سب سے بنیادی چیز ہے، اس لئے کہ زمین اگر اپنی پیداوار ہی پیدا نہ کرے تو تم کہاں سے کھاؤ گے اور پیو گے؟ کیا تمہاری حرفتیں، تمہاری صنعتیں اور تمہاری تجارتیں سب ٹھپ نہیں ہو جائیں گی؟

کاشتکار حضرت آدم علیہ السلام کا جانشین:

یہ زراعت کا پیشہ ہمارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا، جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اُتارا گیا تو ان کو زراعت کا طریقہ سکھایا گیا، یعنی اس طرح وہ کاشت کریں، اس طرح بیج ڈالیں، کیونکہ زراعت کا طریقہ تو وہ جانتے نہیں تھے کہ کیسے کریں؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کو طریقہ سکھایا، پھر حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے ان کو اِلقا ہوتے رہے، اِلہام ہوتے رہے کہ یہ یہ طریقہ اختیار کریں، ظاہر بات ہے کہ نقل و حمل کے لئے بھی ضرورت پیش آتی ہوگی، اور وہ اکیلا آدمی کیا کرسکتا تھا، اس کو بھی کتنا کھانا تھا، بعد میں ان کی اولاد بڑھتی گئی، تو یہ زراعت کا پیشہ بھی ترقی کرتا گیا۔

غرضیکہ زراعت کا پیشہ یہ انسان کی معیشت میں سب سے پہلا اور بنیادی پتھر ہے، اور یہ جو کسان ہیں، محنت کرنے والے لوگ ہیں، جو زمین جوتتے ہیں، بیج ڈالتے ہیں، زمین پر محنت کرتے ہیں، یہ سب حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہیں، ان کے جانشین ہیں۔

زراعت کی فضیلت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت اور شجرکاری کی بہت ہی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، یوں فرمایا ہے کہ:

”کوئی شخص کھیتی کرے یا درخت لگادے، تو جب تک وہ کھیتی یا درخت قائم رہے اس سے کوئی پرندہ، کوئی جنگل کا جانور یا کوئی انسان کھائے گا، اس کسان کے لئے صدقہ لکھا جائے گا۔“

کھیتی اور پھلوں کو چڑیاں کھاتی ہیں، یہ اُڑنے والے جانور کھاتے ہیں، کبھی جنگل کے جانور آکر کے کھاجاتے ہیں، کبھی کوئی انسان بھی کھالیتا ہے، اس غلے یا پیداوار کے گھر آنے سے پہلے پہلے جتنے حیوان یا انسان کھائیں گے وہ سارے کا سارا اس کے حق میں صدقہ لکھا جاتا ہے، یہ بہت بڑی فضیلت ہے۔

حرفت و دست کاری کی فضیلت:

اسی طرح دست کاری یعنی حرفت لوگ اس کو عار سمجھتے ہیں، گویا ہاتھ سے محنت کرنا بابوپن کے خلاف سمجھا جاتا ہے، اور اس کو عیب و عار سمجھا جاتا ہے کہ اتنا بڑا آدمی ہاتھ سے محنت کرتا ہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

”مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ

عَمَلِ یَدَیْهِ۔" (مشکوٰۃ ص:۲۴۱، بحوالہ بخاری)

ترجمہ:... "سب سے پاکیزہ کھانا جو آدمی کھائے وہ اپنی ہاتھ کی کمائی کا ہے، اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتے تھے۔"

حضرت داؤد علیہ السلام تخت پر بیٹھے ہیں، سلطنت حاصل ہے لیکن سرکاری خزانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ بادشاہ کا بھی یہی معمول تھا، مغلیہ خاندان کا تخت ہے اور ماشاء اللہ ہمیشہ جہاد میں رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے، ٹوپیاں بنتے تھے اور قرآنِ کریم کی کتابت فرماتے تھے، عالمگیرؒ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے مصاحف، قرآنِ کریم کے نسخے اب بھی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اور جب عالمگیرؒ کا انتقال ہوا تو وصیت فرمائی کہ فلاں پوٹلی کے اندر کچھ رقم پڑی ہے اس سے میرا کفن دفن کیا جائے، اور فلاں پوٹلی میں ایک رقم پڑی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کردی جائے، وہ رقم میرے کفن دفن میں استعمال نہ کی جائے اس لئے کہ وہ قرآنِ کریم کی کتابت کی اُجرت ہے۔ دراصل بعض اہلِ علم اس کو جائز نہیں سمجھتے تھے کہ قرآنِ کریم کی کتابت کے پیسے لے کر استعمال کئے جائیں، چونکہ ایسی رقم کے استعمال میں علماء کا اختلاف تھا، کوئی اس کو جائز کہتا اور کوئی اس کو ناجائز کہتا، تو فرمایا کہ: میرا کفن دفن اس سے نہ کیا جائے۔

ہاتھ سے کمانا عار نہیں:

خلاصہ یہ کہ ہاتھ سے کما کر کھانا تو عار نہیں ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِیًّا اِلَّا رَعَی الْغَنَمِ، فَقَالَ أَصْحَابُهُ:

وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ! كُنْتَ أَرْعٰى عَلٰى قَرَارِيْطِ لِأَهْلِ مَكَّةَ۔"

(مشکوٰۃ ص:۲۵۸، بحوالہ بخاری)

ترجمہ:...''کوئی نبی ایسا نہیں ہوا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جی ہاں! میں نے بھی بکریاں چرائی ہیں، میں چند قیراط پر قریش کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔''

قیراط بہت معمولی سکہ کہلاتا تھا، جیسے پرانے زمانے میں دمڑی مشہور تھی، یعنی چند دمڑیوں کے عوض قریش کی میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اللہ کے نبیوں سے اللہ تعالیٰ نے بکریاں چروائی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بکریاں چرانا تو قرآنِ کریم میں مذکور ہے، آپؑ حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس سال بکریاں چرائی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں، بکریاں چرانا نبیوں کی سنت ہے، کوئی عار کی بات نہیں، اور سر پر ٹوکری اُٹھانا، محنت و مزدوری کرنا یہ بھی کوئی عار کی بات نہیں ہے، تم بہترین قسم کے لباس پہن کر سوٹ وغیرہ پہن کر کرسیوں پر بیٹھ کر لوگوں سے جو ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہو، یہ حرام کی کمائی ہے، غصب ہے، اور اگر تم لوگ ٹوکری اُٹھاؤ، اپنے ہاتھ سے محنت کرو، تو یہ حلال کی کمائی ہے، اس حرام کی کمائی کو عزت سمجھتے ہو اور حلال کی کمائی کو ذِلت سمجھتے ہو۔

جدید تعلیم بے کاری کا سبب:

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے تھے کہ: پتا نہیں مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے؟ انہوں نے کسبِ حلال کو عار سمجھنا شروع کردیا ہے، سینکڑوں

ہزاروں نوجوان بے کار پھر رہے ہیں، میاں! تم جا کر کوئی کام کرو۔ کہتے ہیں کہ جی ہم نے تو ایف ایس سی کیا ہے، بی اے کی تعلیم حاصل کی ہے، ایم اے کی تعلیم حاصل کی ہے، فلاں فلاں تعلیم حاصل کی ہے، اب کیسے ٹوکری اُٹھائیں؟ میں کہتا ہوں: تمہارا جاہل رہنا بہتر تھا، اور یہ نہایت جہالت کی بات ہے جو آج اخباروں میں باقاعدہ اس کی تشہیر ہو رہی ہے کہ تعلیم کو عام کرو، تعلیم کو عام اس لئے کریں تاکہ لوگ زیادہ بے کار ہو جائیں؟

اس زمانے کی دو جہالتیں:

دو جہالتیں اس زمانے میں بہت زیادہ رائج ہوگئی ہیں، ایک لڑکیوں کو تعلیم دینا، اور ایک تعلیم کو عام کرنا۔ اگر تمہاری تعلیم قوم میں اخلاق پیدا کر دیتی تو میں مانتا کہ یہ تعلیم بہت اچھی چیز ہے، واقعی بڑی اچھی چیز ہے، لیکن جتنی تعلیم بڑھتی ہے اتنا اخلاق بگڑتا ہے، اگر میں غلط کہتا ہوں تو آپ لوگ مجھے ٹوک سکتے ہیں کہ تم غلط کہتے ہو، میں دیکھتا ہوں عام اُجڈ قسم کے لوگوں کے اخلاق ان لکھے پڑھے لوگوں کے اخلاق سے اچھے ہیں، وہ کم از کم کسی کی تو مان ہی لیتے ہیں، اور تمہارے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود تمہارے اندر بداخلاقیاں پیدا ہوگئی ہیں، غرور ہے، تکبر ہے، حسد ہے، مار دھاڑ ہے، دوسرے کو نیچا دِکھانا اور اپنے آپ کو اُوپر دِکھانا، یہ سارے گندے اخلاق تمہیں اس تعلیم نے دیئے ہیں، اُستادوں کی پگڑیاں اُچھالنا، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا، اور شریف خاندان کی لڑکیوں سے عشق لڑانا، اس کے سوا تم کیا سکھاتے ہو؟ مجھے بتاؤ یہ تمہارے کالج اور یونیورسٹیاں اس کے سوا کیا سکھاتی ہیں؟ اگر تمہارا یہ علم لوگوں کو اخلاق سکھاتا، تہذیب سکھاتا، تو میں مانتا کہ واقعی تم نے علم سیکھا ہے، اخلاق اور تہذیب کے معنی چبا چبا کر باتیں کرنے کے نہیں ہیں، جس کو تم نے تہذیب سمجھ لیا ہے، اخلاق اور تہذیب یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اسے دیا جائے۔ چھوٹوں کے

ساتھ چھوٹوں کا سا معاملہ کیا جائے، بڑوں کے ساتھ بڑوں کا معاملہ کیا جائے، ماں باپ کے ساتھ ماں باپ جیسا حسنِ سلوک کیا جائے، ادب ہے، احترام ہے، یہ چیز اخلاق کہلاتی ہے، تہذیب کہلاتی ہے۔ کسی دیہاتی سے کسی نے پوچھا تھا کہ تمہارا لڑکا پڑھتا ہے کتنا لکھ پڑھ گیا ہے؟ اب وہ بے چارہ کیا جانے کہ کتنا پڑھ گیا ہے کتنا نہیں؟ دیہاتی جاہل کہتا ہے: جی وہ کافی پڑھ گیا ہے، کھڑے ہوکے پیشاب تو کرنے لگا ہے۔ بس تم کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سکھاتے ہو، پینٹ پہنو، کھڑے ہوکر پیشاب کرو!

تو میں نے کہا کہ یہ نعرہ لگانا کہ تعلیم کو عام کرو یہ جہالت ہے جو عام ہوگئی ہے، ہماری قوم بڑی جاہل ہے، یہ اُوپر کی سطح پر جتنے فساد مچا رہے ہیں یہ سب جاہل ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ اس سے جاہل اچھے ہوتے ہیں، یہ اپنے آپ کو پڑھا لکھا کہلانے والے سیاسی بحران پیدا کر رہے ہیں، قوم کو بے چینی میں مبتلا کر رکھا ہے، یہ سب کے سب جاہل ہیں، یہ پڑھے لکھے نہیں ہیں، یہ تو آکسفورڈ تک ہوکر آئے ہیں، معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ بڑی کوئی جہالت نہیں۔ دُنیاوی تعلیم کا عام کرنا گویا قوم کو تلقین کرنا ہے کہ بے کار بنو، کیونکہ اپنے تئیں جو پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ بے چارے دست کاری کے قابل نہیں رہتے، میں کہتا ہوں کہ سڑک پر بیٹھ کر جوتی گانٹھ لو یہ حلال کی روزی ہوگی، لیکن تمہیں تو تمہاری تعلیم سوائے مار دھاڑ کے اور سوائے نوکری اور ملازمت کے کچھ نہیں سکھاتی۔ اللہ کے نبی دست کاری کرتے ہیں، ان کو اس سے عار نہیں، بکریاں چرانے سے بھی عار نہیں ہے، اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے عار نہیں ہے۔

صنعت میں اِجتہاد کرو:

کوئی دست کاری کی چھوٹی موٹی صنعتیں لگالو، لیکن کوئی مجتہد قسم کا دِماغ ہو جو ان چیزوں کو ایجاد کرے اور قوم کے نوجوانوں کو اس راستے پر لگائے۔

تمہیں تو ایک ہی اِجتہاد سوجھتا ہے کہ مولوی دِین کو بدلیں، شریعت کو بدلیں، اِجتہاد کریں، یہ لوگ ہمیں تلقین کیا کرتے ہیں کہ اِجتہاد کرو، تم بھی کوئی اِجتہاد کرو نا!

تم میں سے کچھ نوجوان اُٹھیں اور اُٹھ کر ایسی چھوٹی موٹی صنعتیں لگائیں، جس سے اپنے گھر کی کفالت ہوسکے، ملک کو فائدہ ہو، نفع ہو، نوجوان کام پر لگیں، اب تو دہشت گردی کی وجہ سے کراچی میں سناٹا چھا گیا ہے، ورنہ میں دیکھتا تھا کہ نوجوانوں نے سڑکیں بند کی ہوئی ہیں، کرکٹ کھیل رہے ہیں، بس نوجوان اس کام کے لئے رہ گئے ہیں، بلے اُٹھائے پھرتے ہیں، سڑکیں بند کی ہوئی ہیں، کوئی گاڑی نہیں جاسکتی اور یا پھر کلاشنکوف اُٹھالی، میرے بھائی! کوئی ایسا کام کرو جو تمہارے لئے مفید ہو چاہے چھوٹا سا کام ہو، قوم کو بھی پیداوار ملے اور تمہیں بھی اپنے ہاتھ کی محنت ملے۔

لڑکیوں کی تعلیم گھر اُجاڑنے کا ذریعہ:

اسی طرح یہ جو کہا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو پڑھاؤ اور ان کو ملازمت دِلواؤ، میں پوچھتا ہوں: کیا تم نے لڑکوں کے لئے ملازمتیں پوری کردیں کہ اب ان سے بچ رہی ہیں جو تم لڑکیوں کو دوگے؟ لڑکیوں کو تو گھر کا کام ذمے کیا گیا ہے، اب یہ کتنی بڑی حماقت کی بات ہے کہ جس شخص کے ذمے گھر کی ذمہ داری ہے اس کو تو بے کار کرو اور جس کا نان ونفقہ مرد کے ذمے ڈالا گیا تھا، اس کو ملازمت دِلواؤ! نوجوان بے کار اور ہماری بچیاں برسرِ روزگار، اب تم ہی بتاؤ وہ اپنے شوہر کے پاس کیوں رہیں گی؟ اپنا گھر کیوں آباد کریں گی؟ جب لڑکی خودکفیل ہوگی اور اپنا بوجھ خود اُٹھاسکے گی تو وہ شوہر کے گھر میں پابند ہوکر رہنا کیوں گوارا کرے گی؟ ہاں! اس کے ساتھ عشق ومحبت کا افسانہ دو چار دن چلے گا بعد میں رنگ ڈھل جاتا ہے، میں جانتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا محتاج بنایا ہے اور اسی احتیاج

کی سریش کے ساتھ چپکا دیا ہے، یہ احتیاج کی سریش ہے جو مرد اور عورت دونوں کو چپکائے رکھتی ہے۔

مرد جانتا ہے کہ عورت کے بغیر گھر کی گاڑی نہیں چل سکتی، خانہ داری ہے، بچوں کی حفاظت ہے، بچوں کی پرورِش ہے، یہ عورت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور عورت جانتی ہے کہ جب تک سر پر سائیں کا سایہ نہیں ہوگا میری زندگی بے سایہ گزرے گی۔ دونوں ایک دُوسرے کے محتاج ہیں، قدرت نے ان دونوں کو محتاج بنایا ہے، اس کا شوہر بے روزگار اور لڑکی برسرِ روزگار، مجھے بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اِلہام کیا ہے، لوگوں کے دِل میں ڈالا ہے کہ اس طرح نظام بناؤ؟ ہماری حکومتیں تو منصوبہ بندیاں کرتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں فطری منصوبہ بندی کی ہوئی ہے، ان کی منصوبہ بندی پر معاملہ نہیں ہے، جس چیز کی احتیاج ہوتی ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دِل میں اس کا حل ڈال دیتے ہیں کہ یہاں یہ چیز پیدا کرو، مہیا کرو یا باہر سے لاؤ، تاجر لے آتے ہیں۔

تجارت کے لئے لائسنس ظلم ہے:

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ: بادشاہ اگر تجارت کرنے لگے تو رعایا کو بگاڑ ڈالے گا۔

آج ہماری ہر چیز اُلٹی ہوگئی ہے، آج تجارت ساری کی ساری گورنمنٹ کے قبضے میں ہے، اور جو تاجر بے چارے اپنی تجارت کر رہے ہیں وہ بھی گورنمنٹ کے دست نگر ہیں، گورنمنٹ سے اجازت ملنی چاہئے اور درآمد و برآمد بینک کے ذریعے سے تبادلہ ہونا چاہئے، بہت سے شعبے تو گورنمنٹ نے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں کہ گورنمنٹ ہی ان کی درآمد کرسکتی ہے دُوسرا کوئی نہیں کرسکتا، اور گورنمنٹ کا جو حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی نافرمانی کی وجہ سے قوموں کا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے، حکومت کا کام تو نظم ونسق بحال رکھنا

ہے، نظم ونسق کا بحال رکھنا اور ظالم کو مظلوم سے انصاف دِلانا، کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے، لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا، معیشت کے سلسلے میں جہاں کسی چیز کی ضرورت ہو وہاں ان کی امداد کرنا، سرکاری وسائل کے ذریعے لوگوں کی معاونت کرنا، یہ مملکت کا کام ہے۔

لیکن دورِ جدید میں حکومت کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ دُنیا کی ہر دولت اس فرعون کے ہاتھ میں ہو، کوئی آدمی بغیر لائسنس کے تجارت نہ کرسکے، کوئی دُکان داری نہ کرسکے، کوئی حیوانات کی پرورِش کرنا چاہے بغیر لائسنس کے وہ یہ کام نہ کرسکے، ہر چیز میں حکومت کا لائسنس اور اجازت نامہ لازمی ہے، گویا کنٹرول حکومت کا ہے، یہ سب اس کے نوکر ہیں، اور پھر حکومت جتنا چاہے ان کو حصہ دے اور جتنا چاہے اپنے پاس رکھے، اس ٹیکس کے معنی سوائے حصہ داری کے اور کیا ہیں؟ کماؤ تم اور عیش و عشرت اُڑانے کے لئے حکومت اپنا ٹیکس وصول کرے۔

مملکت کے زوال کا سبب:

ابنِ خلدون لکھتے ہیں کہ: کسی مملکت کے زوال کا باعث یہ بنتا ہے کہ عوام پستی چلی جاتی ہے، مہنگائی بڑھتی ہے اور مہنگائی کی وجہ سے مطالبات زیادہ بڑھتے ہیں، اور مطالبات کی وجہ سے ٹیکس زیادہ لگائے جاتے ہیں، جتنے زیادہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں اتنی ہی مہنگائی زیادہ بڑھتی ہے، جتنی مہنگائی زیادہ بڑھتی ہے اتنی ہی زیادہ تنخواہیں بڑھتی ہیں، جتنی زیادہ تنخواہیں بڑھتی ہیں اتنا ہی زیادہ ٹیکس بڑھتا ہے، یہ ایک چکر چلتا ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں کہ: کسی مملکت کی کسی حکومت کی سعادت مندی یہ ہے کہ اس میں کم سے کم ٹیکس ہوں اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسانیاں ہوں۔

ماہرینِ معاشیات پر مغرب سوار ہے:

آج یہ جتنے ماہرِ معاشیات ہیں اور حکومت کے دُوسرے شعبوں میں کام

کرنے والے لوگ ہیں، آپ نے کبھی ان کی زبان مبارک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، خلفائے راشدینؓ کا، اور بادشاہانِ عدل کا تذکرہ اور حوالہ نہیں سنا ہوگا، یہ جب بھی حوالہ دیں گے جرمنی، فرانس، برطانیہ اور امریکا کے مدبرین کا حوالہ دیں گے، ان کے ذہن پر مغرب اتنا سوار ہے کہ کبھی بھول کر بھی کسی معاملے میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ نہیں دیا، انہوں نے سوچا ہی نہیں، ان کا ذہن یہ بن گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بس ثواب و عذاب بیان کرنے کے لئے آئے تھے۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاحات نہیں فرمائیں؟ مگر تمہاری آنکھیں پھوٹ گئی ہوں تو میں اس کا کیا علاج کروں؟ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں آقا نے راہ نمائی نہ فرمائی ہو، اور اس کے اُصولِ موضوعہ ترغیب اور ترہیب کے ساتھ بیان نہ فرمادیئے ہوں، لیکن تمہارے لئے یہ چیزیں بالکل بے کار ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ جتنی لفاظی تم کرتے ہو اس کا نتیجہ خاک ہے…!

صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد بھی دُوسرے عادل سلاطین انہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں، مگر کبھی تم نے ان اکابر کی تاریخ کو اُٹھا کے دیکھا ہی نہیں، اگر دیکھا بھی ہے تو اس سے سبق نہیں لیا، اس سے راہ نمائی نہیں لی، تمہاری راہ نمائی کے لئے یہی مغرب والے رہ گئے ہیں، اس لئے کہ تمہارا ذہن بھی غیر مسلم تھا، تمہارا دِل بھی غیر مسلم ہے، تم زبان سے ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھتے ہو، مگر ذہن و دِل جب تک مسلمان نہ ہو تو کلمہ پڑھنے سے کیا فائدہ؟

علمِ معاش محدود ہے:

خیر! یہ تو ضمناً بات آگئی تھی، میں گفتگو اس میں کر رہا تھا کہ علم دو ہیں، ایک

علمِ معاش اور ایک علمِ معاد۔

علمِ معاش وہ ہے جو مرنے سے پہلے تک کی زندگی ہے اس میں رہنے سہنے کے طریقے سکھاتا ہے کہ یہ زندگی کیسے گزاریں؟ کیا کھائیں؟ کس طرح کھائیں؟

علمِ معاد کی حد نہیں:

اور ایک علمِ معاد ہے، اور وہ ہے موت کے وقت سے لے کر ابد الآباد کی زندگی تک راہ نمائی کرنے والا علم، اس علمِ معاش کی حد ہے، اس علمِ معاد کی حد نہیں، تمہارے اسکولوں اور کالجوں پر بھی لکھا ہوا ہوتا ہے:

”طلب العلم فریضة علٰی کل مسلم“

(مشکوٰۃ ص:۳۴)

ترجمہ:... ”علم کا حاصل کرنا ہر مسلم پر فرض ہے۔“

جھوٹ کہتے ہو! یہ علم تمہارا نہیں ہے، یہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگاتے ہو، تمہارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے یہ علم مراد نہیں ہے۔

”چین جاکر علم حاصل کرو“ غلط ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک اور تہمت گھڑی ہے کہ: ”أُطلبوا العلم ولو کان بالصین“ علم کو تلاش کیا کرو چاہے تمہیں چین جانا پڑے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا، چین تو ابھی پچاس سال پہلے تک جاہلیت میں ڈوبا ہوا تھا، یورپ بھی بے چارہ اپنی جہالت سے انگڑائی لے کر اُٹھا تھا، یہ مچھلیوں کے مچھیرے انگریز تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے تم پر ڈیڑھ سو سال حکومت کرکے گئے ہیں، یہ مچھلیوں کے مچھیرے تھے، یہ ڈاکو، بحری قزاق ہیں، سن ۱۹۸۲ء بلکہ اس سے پہلے میں پہلی دفعہ یورپ گیا مولانا محمد یوسف متالا صاحب نے بلایا تھا، تو

میں نے ان سے کہا کہ: حضرت! مجھے یہ بتائیے کہ یہ روشنی کا زمانہ، بجلی اور گیس اور جدید وسائل، رسل و رسائل، مواصلات ان تمام چیزوں کی عمر تو بہت تھوڑی ہے، اس سے پہلے اس ملک میں کون رہتا تھا اور کس طرح رہتا تھا؟ انگلینڈ کا ملک بھی کوئی رہنے کے قابل ہے؟ آج دُنیا سے یہ بجلی کے چکر ختم ہوجائیں تو وہاں کوئی رہ سکتا ہے؟ مولانا نے مسکرا کر فرمایا کہ: یہاں دو طرح کے لوگ رہتے تھے، ایک مچھیرے، مچھلیاں پکڑنے والے اور دُوسرے بحری قزاق، جو کوئی جہاز جاتا تھا اس کو لوٹ لیتے تھے، نہ وہاں زراعت ہے اور نہ کوئی اور چیز ہوسکتی ہے، سیب لگاتے ہیں، پھل آتا ہے بہت ہی اچھا، لیکن کوئی ذائقہ نہیں، جب پھلوں کو سورج کی روشنی ہی نہ پڑے تو ان میں مٹھاس کہاں سے آئے؟ میں نے کہا کہ: یہ مغربی دُنیا کے لوگ تو نہایت غیرمہذّب قوم تھی، اور اس امریکا غریب کا تو ڈھائی سو سال پہلے کوئی وجود ہی نہیں تھا، دُنیا کو معلوم ہی نہیں تھا کہ امریکا بھی کوئی ملک ہے، یہ مغرب بھی انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا، لیکن چین والے ابھی تک افیونی تھے، سو رہے تھے، یہ سب سے بعد میں بیدار ہوئے ہیں، ان کے بارے میں کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم حاصل کیا کرو چین جاکر، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت ہے!

یہ سب روٹی کا چکر ہے:

تم تو علم اسی کو سمجھتے ہو، حالانکہ یہ علم ہے ہی نہیں، محض کھانے پینے کا دھندا ہے، چاہے تمہارے سائنسی علوم ہوں یا تمہارے آج کے ترقی یافتہ علوم ہوں، یہ سب کے سب پیٹ کا چکر ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ گھسیارا بے چارہ گھاس کھود کر کے روٹی کھاتا ہے، تم بڑے بڑے ادارے بنا کر روٹی کھاتے ہو، چکر سارا صرف روٹی کا ہے اور کچھ نہیں...!

سائنس کی ’’برکات‘‘:

مجھے معاف رکھیں گے، تمہاری سائنس نے آدمی کو نفع سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے، تم کہو گے کہ یہ مولوی بہت تعصب برتتا ہے، میں مانتا ہوں کہ سائنس نے بہت نفع بھی پہنچایا، لیکن جتنا انسان اس زمانے میں تلملا رہا ہے اور جس قدر اس کی رُوح آج بے چین ہے، کبھی انسانی زندگی میں بے چین نہیں ہوئی ہوگی، اور آج کا انسان جتنا مظلوم ہے اتنا کبھی نہیں رہا ہوگا، آج کا انسان مسائل سے جس قدر دوچار ہے اس سے پہلے کبھی نہیں رہا ہوگا، اور یہ سب برکتیں ہیں تمہاری سائنس کی، تمہارے ترقی یافتہ علوم کی، تم نے نعرہ لگایا کہ ہم نے فلاں بیماری پر فتح پالی، فلاں بیماری پر فتح پالی، فلاں بیماری کا نشان ختم کردیا، چیچک کا نشان ختم کردیا، یا فلاں چیزیں ختم کردیں، قدرت نے کہا کہ: تم نہیں کرسکتے، ایسی ایسی بیماریاں ایجاد کریں گے کہ تمہارے باپ کو بھی ان کا پتا نہ چلے، نئی نئی بیماریاں آتی ہیں، ان پر بے چارے تحقیقات شروع کرتے ہیں، اور جب وہ قابو میں آنے کے قریب ہوتی ہے تو ایک نئی بیماری سر اُٹھالیتی ہے۔ یہ کینسر اب تو بہت پُرانی چیز بن گئی ہے، لیکن ہمارے یہاں کبھی نہیں جانی گئی تھی، حالانکہ ہماری طب کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے، یونانی طب میں سرطان کے نام سے یہ بیماری ہوتی تھی اور اس کا علاج بھی کیا جاتا تھا، لیکن اب جس کثرت سے یہ بیماری ہونے لگی ہے، اور اس نے دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، اب تو ہر دسویں آدمی پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ کینسر میں مبتلا ہے۔

اصل آخرت کا علم ہے:

تو اصل علم یہ ہے جو آخرت کی راہ نمائی کرے، قرآنِ کریم نے ایک جگہ اپنے بلیغ انداز میں فرمایا:

’’یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ

الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔" (الروم:۶)

ترجمہ:... "یہ لوگ دُنیا کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں، حقیقت اس کی بھی معلوم نہیں، اور آخرت سے بالکل ہی غافل ہیں، بے خبر ہیں۔"

دُنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک اندر، یعنی اس کا چھپا ہوا حصہ ہے، تم دُنیا کے ظاہر ہی ظاہر کو جانتے ہو، اس کے اندر کا تمہیں بھی معلوم نہیں، اور دعویٰ کرتے ہو خدا اور نبی کے مقابلے میں علم کا، تو مسلمان ایسا ہونا چاہئے کہ وہ کتاب اللہ کا برتن ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کے سینے میں محفوظ ہو، اس کے الفاظ بھی، اس کے معانی بھی اور اس کے انوار و برکات بھی اس کے سینے میں محفوظ ہوں، اس کے دِل سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی شعائیں پھوٹیں "ینابیع العلم" اور علم کے چشمے ہوں، جب بھی تمہاری زبان سے کچھ نکلے تو علم کی بات نکلے۔

ایک دن کا رزق مانگو:

دُوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ایک دن کے بدلے میں ایک دن کا رزق تلاش کرو، آج کماؤ کل کے کھانے کے لئے، بس! آج کی محنت کل کے لئے، کل کی محنت پرسوں کے لئے، ہوس نہ کرو، "سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں!" قدرتی طور پر ہر آدمی کے دِل میں اپنے بعد اپنے بیوی بچوں کا خیال ہوتا ہے، کسی حد تک ہونا بھی چاہئے، یہ فطری چیز ہے، لیکن ایسا تو نہ کرو کہ اپنی آخرت سے بالکل غافل ہوجاؤ، بھائی! آج کھالیا، آج کمالیا، کل کے لئے تو تم نے کچھ نہیں چھوڑا، پوری دُنیا کی زندگی کو ایک دن سمجھو، تم نے کما کر یہیں کھالیا یا کچھ تھوڑا بہت اپنے بچوں کے لئے چھوڑ گئے تو آنے والی زندگی کے لئے تمہاری محنت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اگلی زندگی پر ایمان ہی نہیں یا اگلی زندگی پر بھی ایمان ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لئے ہم نے

محنت کیا کی؟ یہاں تو یہ اُصول ہونا چاہئے تھا کہ ایک دن کی روٹی چاہئے تھی اور بس! ایک دن کی روٹی مل گئی ہے کافی ہے۔

ایک دن کی روزی کافی ہے:

میں نے تمہیں حدیث سنائی تھی نا!

"مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ اٰمِنًا فِیْ سَرْبِهٖ مُعَافًی فِیْ جَسَدِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتَ یَوْمِهٖ فَكَأَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَزَافِیْرِهَا۔" (مشکوٰۃ ص:۴۴۲)

ترجمہ:... "تم میں سے جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اپنی ذات کے بارے میں امن سے ہو، بدن دُرست ہو، اور اس کے پاس ایک دن کی خوارک ہو، تو یوں سمجھو گویا ساری دُنیا اپنے ساز و سامان کے ساتھ سمٹ کر اس کے پاس جمع ہوگئی ہے۔"

یعنی جو شخص صبح کرے اس حالت میں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے عافیت ہے، کوئی بیماری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے دِماغ کام کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے آنکھیں کام کر رہی ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہاتھ پاؤں کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا احسان ہے یہ وجود کی جو مشینری ہے کام کر رہی ہے، بس عافیت ہو، الحمدللہ! اور اپنے دِل میں امن اور اطمینان ہے کہ گھر میں کوئی خوف نہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، ایک دن کی روزی موجود ہے، شام تک بچے کھا سکتے ہیں، اتنی روٹی موجود ہے، فرمایا: گویا اس کے لئے ساری دُنیا اپنے ساز و سامان کے ساتھ جمع کردی گئی ہے، باقی ہوس ہے۔ بھائی! ایک دن کی روزی ضرورت ہے، علماء کہتے ہیں کہ تین دن کی روزی ہو کافی ہے، اور نیچے آجاؤ، باقی ہوس ہے۔ اور ہماری ہوس ہی پوری نہیں ہوتی، کسی شخص

کی آمدنی پہلے دس روپے تھی، گھٹتے گھٹتے ایک روپے رہ گئی، بس اس کی پریشانی دیکھنے کے لائق ہے، حالانکہ روٹی اب بھی چل رہی ہے، الحمدللہ کسی کا مقروض نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، لیکن وہ ٹھاٹ جو دس روپے والی تھی وہ نہیں ہے، بہت پریشان ہوتے ہیں، تو ایک دن کی روزی ایک دن کے بدلے میں تلاش کرو۔

توّابین کی معیت اختیار کرنا:

دُوسری روایت میں فرمایا کہ توابین کے پاس بیٹھا کرو، توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو، کیونکہ ان کے دِل بہت نرم ہوتے ہیں، اپنے گناہوں کو دیکھ دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں، اور گناہوں کا بوجھ ان کی کمر کو دُہرا کردیتا ہے، اور ان کی آنکھوں کو جھکا دیتا ہے، نہ یہ تن کر چلیں گے اور نہ آنکھ اُٹھا کر متکبرانہ انداز میں دیکھنے کے لائق ہوں گے، ان کے گناہوں کے احساس نے ان کو شرمندہ کردیا ہے، اور ان میں کبر کی بجائے عجز پیدا کردیا ہے، شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ: مدعی اپنے سوا کسی اور کو نہیں دیتا، اگر اللہ تعالیٰ تجھے چشمِ خدابین بھی بخش دیتے، یعنی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی نظر عطا فرمادیتا، تو تجھے دُنیا میں اپنے سے عاجز کوئی نظر نہ آتا، اور تو سمجھتا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں عاجز تر آدمی میں ہی ہوں، اور یہ بھی نظر آتا کہ سب سے زیادہ گناہگار بھی میں ہوں، تجھے نظر آتا کہ اگر میری بخشش ہوگئی تو اِن شاء اللہ سب کی بخشش ہوجائے گی، اگر اللہ تعالیٰ مجھ جیسے گناہگار کو بھی معاف فرمادیں گے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دُنیا بخشی جائے گی، یہ ہیں توابین، ان کے دِل نرم ہوتے ہیں، ان کے پاس بیٹھنا چاہئے۔

گیارھویں شریف

ولیوں کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا مقرّب اورمحبوب بندہ سمجھو، وہ بھی ہماری طرح بندے ہیں، اور ہم تو بندگی سے کچھ سرتابی کرلیتے ہیں، وہ نہیں کرتے، ہمارے اندرتو اَنا آجاتی ہے کہ میں بھی کچھ ہوں، ہم کبھی کبھی اپنی طرف ارادے اور اِختیارات کو منسوب کرلیتے ہیں، لیکن وہ نہیں کرتے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اس سلسلے میں چند متفرق چیزیں عرض کرنا چاہوں گا۔

شانِ اولیاء میں غلوّ، ولایت کا انکار:

ا:... ایک یہ کہ اولیاء اللہ کن کو کہتے ہیں؟ لوگ اولیاء کو مانتے ہیں، ولیوں کو ولی ماننا چاہئے، اور اولیاء اللہ کو ماننے کے یہی معنی ہیں کہ ہم اولیاء اللہ کو اولیاء اللہ مانتے ہیں، جیسے نبی کو نبی مانتے ہیں، اگر کوئی نبی کو خدا مانتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ نبی کو نہیں مانتا۔ اسی طرح اگر کوئی ولی کو ولایت کے اُوپر کا کوئی درجہ و مقام دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس نے ولی کو ولی نہیں مانا۔ تو اولیاء کے منکر وہ لوگ ہیں جو اولیاء اللہ کے معاملے میں غلوّ سے کام لیتے ہیں۔

اُولو العزم پیغمبر:

دیکھئے! حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر اور اُولوالعزم پیغمبر ہیں، پانچ پیغمبروں کو ''اُولوالعزم'' پیغمبر کہا جاتا ہے، وہ پانچ پیغمبر یہ ہیں:

ا:... حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

۲:... حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

۳:...حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

۴:...حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

۵:...ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ پانچ انبیائے کرام اُولوالعزم نبی کہلاتے ہیں، اور اس پر اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ یہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ہیں، گو ان کے درمیان بھی درجات کا اختلاف ہے۔

مسلمان تمام انبیاء کو مانتے ہیں:

تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُولوالعزم نبی اور رسول ہیں، اور حق تعالیٰ شانہٗ کے بہت ہی مقرّب بندے ہیں، ہم ان کو مانتے ہیں، لیکن عیسائی ہمیں کہتے ہیں کہ تم عیسیٰ کو نہیں مانتے، یسوع مسیح کو تم نہیں مانتے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمان تو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو مانتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بطورِ خاص مانتے ہیں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو خصوصیت کے ساتھ مسلمان مانتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

”أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِى الْأُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ، قَالُوْا: كَيْفَ يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: اَلْأَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِّنْ عَلَّاتٍ وَّأُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ فَلَيْسَ بَيْنَنَا نَبِيٌّ۔“ (مسلم ج:۲ ص:۲۶۵)

ترجمہ:...”انبیاء علیہم السلام علاتی بھائی ہوتے ہیں ...علاتی بھائی کہتے ہیں باپ شریک بھائی کو...ان کی مائیں الگ الگ ہیں لیکن دِین ان کا ایک ہے۔ اور مجھے سب سے زیادہ تعلق عیسیٰ ابن مریم سے ہے، اس لئے کہ میرے درمیان اور ان

کے درمیان کوئی نبی نہیں۔"

ماؤں سے مراد ہے شریعتیں، شریعتیں ہر نبی کی الگ ہوتی ہیں، لیکن دِین ان کا ایک ہے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ وہ تم میں نازل ہونے والے ہیں ان کو تم پہچان لینا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق کی وجہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حلیہ اور ان کے کارنامے بیان فرمائے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: مجھے سب سے زیادہ تعلق عیسیٰ ابن مریم ...علیہ السلام... سے ہے، دو وجہ سے:

ایک تو یہ ہے کہ میرے اور ان کے درمیان میں کوئی نبی نہیں ہوا، میرا زمانہ ان کے زمانے کے ساتھ ملا ہوا ہے، اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو اعلان کیا تھا منادی کی تھی:

"وَمُبَشِّرًا ۢ بِرَسُوْلٍ يَّـاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔" (الصّف)

ترجمہ:..."اور میں خوشخبری دیتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہوگا۔"

یوں اس کا مصداق ہے، اس میں اشارہ فرمایا ہے کہ میں ان کی منادی کا مصداق ہوں، ایک اور حدیث میں فرمایا کہ:

"أَنَا دَعْوَةُ اِبْرَاهِيْمَ وَبُشْرٰى عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ، وَرَأَتْ أُمِّىْ حِيْنَ وَضَعَتْنِىْ خَرَجَ مِنْهَا نُوْرٌ أَضَاءَ لَهٗ قُصُوْرُ الشَّامِ...." (کنز العمال ج:۱۱ ص:۳۸۴ حدیث:۳۱۸۳۵)

ترجمہ:..."میں تمہیں بتاؤں کہ میری ابتدا کہاں

سے ہوئی ہے؟... میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہوں اور عیسیٰ ابن مریم کی بشارت ہوں اور میں اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا تھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات روشن ہوگئے۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کعبہ شریف کی تعمیر فرما رہے تھے اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ دُعائیں بھی کر رہے تھے، ان میں سے ایک دُعا یہ تھی کہ:

’’رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ۔‘‘ (البقرۃ)

ترجمہ:... ’’ہمارے پروردگار! ان میں ایک رسول مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، اور ان کو کتاب وحکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے، ان کو پاک کرے۔‘‘

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں نے دُعا کی اور ان دونوں کی نسل میں کوئی نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہیں ہوا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے بھی انبیائے کرام علیہم السلام آئے وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شاخ سے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

ایک مرتبہ انصارِ مدینہ بیعت کے لئے مکۃ المکرّمہ حاضر ہوئے تھے، بیعت کرکے واپس مدینہ منوّرہ چلے گئے، وہاں جاکر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کیا، اس کو ایک پنجابی شاعر نے نہایت خوبصورت انداز میں موزون کیا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ:

اگے بنی اسحاق دی نسل وچوں بے شمار نبیاں زور لایا اے
تے اسماعیل دا خلف الرشید ہن او تاج رسولاں دا آیا اے

کہتا ہے کہ بنو اسحاق کی نسل سے بے شمار نبی آئے ہیں۔ اب حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خلف الرشید اور تاج رسولوں کا آیا ہے۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لئے فرمایا کہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہوں اور میں ابن مریم کی بشارت ہوں، ابن مریم نے میرے آنے کی بشارت دی اور میں اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے دیکھا تھا۔

انہوں نے خواب یہ دیکھا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو ان سے ایک نور نکلا ہے، جس سے شام کے محل روشن ہوگئے، فرمایا کہ میں اپنی والدہ ماجدہ کا وہ خواب ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق کی دو وجوہ:

الغرض: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے درمیان اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا، اس لئے میں ان کی بشارت کا مصداق ہوں۔

اور دُوسری وجہ یہ کہ وہ میرے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے میری اُمت میں آنے والے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے:

”کَیفَ أَنْتُم اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْیَمَ فِیکُمْ وَاِمَامُکُمْ مِّنْکُمْ۔“

(بخاری شریف ج:۱ ص:۴۹۰)

ترجمہ:... ”تمہاری کیسی شان ہوگی اس وقت جب تم

میں ابن مریم نازل ہوں گے۔“

افرادِ اُمت میں سے ایک اُمتی بن کر آئیں گے، اُمت میں شامل ہوکر آئیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا:

اِنجیل برنباس میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی، دُعا تو اور نبیوں نے بھی کی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول ہوگئی، اِنجیل برنباس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

”اے اللہ! اپنے بندے عیسیٰ کو یہ توفیق عطا فرما کہ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتے کے تسمے کھولنے والا بن جائے۔“

جوتے کا تسمہ کھولنے والا خادم ہوتا ہے نا! یعنی تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم بن جائے، چنانچہ اس اُمتِ محمدیہ کی خدمت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر محفوظ رکھا اور قربِ قیامت میں ان کا نزول ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مہدیؒ کی اقتدا میں:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے آسمان سے اُتریں گے، عین اس وقت آئیں گے جبکہ اِقامت ہوچکی ہوگی، اِمام مصلے پر کھڑا ہوچکا ہوگا، اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہنچیں گے، اِمام یعنی حضرت مہدی علیہ الرضوان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جائیں گے اور ان کو کہیں گے: اے رُوح اللہ! تشریف لائیے، نماز پڑھائیے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: نہیں! یہ اِقامت تیرے لئے ہوئی ہے اس لئے تم ہی اِمام بنوگے، تم ایک دُوسرے کے اِمام ہو، اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کا اِکرام فرمایا ہے کہ ایک جلیل القدر نبی آسمان سے نازل ہوکر سب سے

پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اُمتی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے، پھر بعد میں اِمام بنتا ہے۔ پھر وہ ہم میں شامل ہوجائیں گے، ہمارے اِمام ہوں گے، تمہارے اِمام ہوں گے، تم میں سے ہوکر۔

تو یہ دو خصوصیتیں ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جن کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سب سے زیادہ تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے ماننے میں فرق:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ہم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں، اتنا مانتے ہیں، اتنا مانتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا تعلق کسی سے بھی نہیں جتنا ابن مریم سے ہے۔ لیکن عیسائی ہمیں کہتے ہیں کہ تم عیسیٰ کو نہیں مانتے، یسوع مسیح کو نہیں مانتے، کیا نہیں مانتے؟ بیٹا نہیں مانتے!

عیسائیوں کا ماننا:

عیسائیوں کی نظر میں ماننا یہ ہے کہ تم اس کو خدا کا بیٹا کہو، اور یہ مانو کہ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! ساری مخلوق کے گناہوں کی گٹھڑی لے کر وہ صلیب پر چڑھ گیا، یہ عیسائیوں کا نجات کا عقیدہ ہے، یہ مانو تو تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے بنوگے۔ اگر ہم کہیں کہ وہ جلیل القدر نبی تھے، اللہ تعالیٰ کے مقدس رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کی دست برد سے محفوظ رکھا، قرآنِ کریم میں ہے:

"وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَنْکَ"

ترجمہ:... "جب میں نے روک دیا بنی اسرائیل کی پہنچ سے۔"

کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اُٹھالیا، عیسائی کہتے ہیں کہ تم نہیں مانتے۔

ولیوں کو ماننے کا انوکھا مفہوم:

ٹھیک یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہمیں کہتے ہیں کہ تم اولیاء کو نہیں مانتے، ہم اولیاء اللہ کو اولیاء مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم ولیوں کو نہیں مانتے، بھائی کیسے مانیں؟ کہتے ہیں کہ ولیوں کے ماننے کا معنی یہ ہے کہ تم "کُنْ فَیَکُوْن" کے اختیارات ولیوں کے سپرد کردو، اللہ تعالیٰ تو تمام کائنات کے مالک ہیں، تمام کائنات کے خالق ہیں، تمام چیزوں کے متصرف ہیں، تمام چیزوں کے ولی ہیں، تمام چیزوں کے اختیارات ان کے قبضے میں ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہے لیکن انہوں نے اپنے اختیارات اولیاء کے سپرد کردیئے ہیں، اب وہی نظام چلا رہے ہیں، بیٹا مانگنا ہو تو ولیوں سے مانگو، رزق مانگنا ہو تو ولیوں سے مانگو، اولاد مانگنی ہو تو ولیوں سے مانگو، مقدمے میں فتح مانگنی ہو تو جاکر اولیاء کی قبروں سے مانگو، غرض کہ ان کے خیال میں تمام کائنات ولیوں کے قبضے میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ سارے محکمے ان کے سپرد کردیئے۔ یہ ہے ان کے نزدیک ولیوں کے ماننے کا مطلب! تم سیدھا سیدھا یہ کیوں نہیں کہتے کہ خدا نے اپنی خدائی ان کو دے دی ہے؟ نہیں بھائی! یہ بات نہیں۔

ولیوں کو ماننے کا صحیح مفہوم:

ولیوں کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا مقرّب اور محبوب بندہ سمجھو، وہ بھی ہماری طرح بندے ہیں، اور ہم تو بندگی سے کچھ سرتابی کرلیتے ہیں، وہ نہیں کرتے، ہمارے اندر تو اَنا آجاتی ہے کہ میں بھی کچھ ہوں، ہم کبھی کبھی اپنی طرف ارادے اور اِختیارات کو منسوب کرلیتے ہیں، لیکن وہ نہیں کرتے۔

اولیاء اللہ کی توحیدِ حالی:

ایک بزرگ تھے وعظ کرنے کے لئے بیٹھے، فرمانے لگے: رات ہم نے دُودھ پیا تھا تو اس کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوگیا۔ فوراً اِلہام ہوا کہ دُودھ کون ہوتا

ہے درد کرنے کے لئے؟ اب تک تم حقیقت تک نہیں پہنچے۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں چیز سے یہ خرابی ہوگئی ہے، فلاں چیز سے خرابی ہوگئی ہے، فلاں نے مجھے ایسا کیا۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ:

دری نوا اے ہم شرک پوشیدہ است
کہ زیدم بیا درد و عمرو بخست

اس میں بھی ایک طرح کا شرک پوشیدہ ہے کہ تم یوں کہو کہ زید نے مجھے تکلیف پہنچائی اور عمرو نے مجھے زخمی کیا، زید، عمرو کون ہوتے ہیں؟ ارادۂ الٰہی کی کٹھ پتلیاں ہیں جو چاہے وہ کرتا ہے، اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا، تمام کارخانہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ناچ رہا ہے۔ کوئی پرندہ پَر نہیں مارسکتا، پھٹک نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ کے حکم اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر، آپ ایک قدم نہیں اُٹھاسکتے، یہ بات ہمارے عقیدے میں داخل ہے، کوئی مسلمان اس کا منکر نہیں، لیکن یہ صرف ہماری زبان پر ہے، مگر اولیاء اللہ کے دِل میں اُتر جاتی ہے یہ بات۔

اس لئے کسی بزرگ نے کہا تھا کہ: دھوکا نہ کھانا کہ توحید واحد گفتن کا نام نہیں، واحد دانستن کا نام ہے، زبان سے کہہ دینا اللہ ایک ہے، یہ توحید نہیں ہے، بلکہ دِل سے جان لینا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا نام توحید ہے، ہماری توحید صرف زبانی ہے، ہماری زبان تک محدود ہے، لیکن اولیاء اللہ کی توحید قال نہیں ہوتی بلکہ حال بن جاتی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان:

حضرت شیخ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مواعظ کا مجموعہ ''فتوح الغیب'' ہے ...اس کا ترجمہ بھی ہوچکا ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو اس کو پڑھو... اس کے ایک باب میں آپؒ فرماتے ہیں کہ: تمام کی تمام مخلوق عاجز اور بے بس ہے، معدومِ

محض ہے، معدوم کے معنی ہیں جس کا وجود ہی نہیں ہوتا، نہ ان کے ہاتھ میں نفع ہے، نہ نقصان ہے، نہ ذِلت ہے، نہ عزّت ہے، نہ رزق ہے، آگے لمبی تفصیل بیان فرمائی۔

جو خود کو عاجز کہیں ان سے مانگنا؟

اب جو بزرگ یہ بات بتا رہے ہیں کہ مخلوق کے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، مالک کے کرنے سے ہوتا ہے، اسی بزرگ کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہی سب کچھ کرتے ہیں، اور وظیفہ پڑھتے ہیں: ''یا عبدالقادر جیلانی شیئاً للّٰہ'' اے عبدالقادر جیلانی اللہ کے لئے کچھ دیجئے! باقاعدہ اس کا وظیفہ پڑھتے ہیں، جس طرح مسلمان ''لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ'' کا یا ''اللہ، اللہ'' کا وظیفہ پڑھتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں، یہ بے چارے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت عطا فرمائے، شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے نام کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ اس میں دو خرابیاں ہیں:

غیر اللہ کا وظیفہ:

ایک خرابی یہ ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے نام کا وظیفہ چھوڑ کر غیر اللہ کے نام کا وظیفہ پڑھنا شروع کردیا، وظیفہ اللہ تعالیٰ کے نام کا پڑھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب شخصیت کون ہوسکتی ہے؟ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک نام کا وظیفہ نہیں پڑھتے، ہاں! دُرود شریف کا وظیفہ پڑھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دُرود پڑھتے ہیں اور اس کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی کے نام کا وظیفہ نہیں پڑھا جاسکتا، ہماری شریعت میں، ہمارے دِین میں، ہمارے قرآنِ کریم میں، ہماری کتاب میں، ہمارے نبی نے صرف ایک پاک نام کا وظیفہ بتایا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاک نام کا وظیفہ پڑھا کرو۔

خدا کو بندے کا سفارشی بنانا:

دُوسری خرابی اس کو میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں، ورنہ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گی، ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کو سفارش کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا، بار بار فرمایا: بندۂ خدا! اللہ تعالیٰ کو بطور سفارش کے کسی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس فقرے سے اتنی اذیت ہوئی کہ ہم بہت پریشان ہوگئے، بار بار فرماتے: بندۂ خدا! تو نے اللہ تعالیٰ کو سمجھا نہیں، اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے سامنے بطور سفارشی کے پیش کیا جاتا ہے؟

اللہ کی گستاخی:

جب آپ کہتے ہیں: "یا عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے سامنے اللہ کا واسطہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو سفارش کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ کچھ دیجئے! مانگ رہے ہیں شاہ عبدالقادر جیلانی سے اور سفارش کے طور پر پیش کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کو، یہ کتنی گستاخی اور بے ادبی کی بات ہے!

بڑے کو چھوٹے کے لئے سفارشی؟

محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ میرے سامنے اللہ تعالیٰ کو پیش کرتے ہو، سفارش کے طور پر چھوٹے کو بڑے کے سامنے سفارشی لایا جاتا ہے؟ اللہ کے بندو! کچھ تو سمجھو بڑے کو! ساری کائنات کے بڑے کو مخلوق کے سامنے سفارشی بناتے ہو، تمہارے دِل میں خدا کا ادب نہیں ہے؟

غیراللہ کے لئے نیاز:

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شیخ تو فرماتے ہیں کہ تمام کائنات عاجزِ محض، معدومِ محض ہے، نہ کوئی کسی کو عزّت دے سکتا ہے اور نہ کوئی کسی کو ذِلت دے سکتا ہے، نہ رزق دے سکتا ہے، نہ کسی کی تکلیف کو دُور کرسکتا ہے، لیکن ہمارے دوست کہتے ہیں کہ ولیوں کو ماننا یہ ہے کہ سب کچھ انہی سے مانگو، نذر اور نیاز ان کے نام کی دو۔ جانتے ہو کہ نیاز کس لئے دیتے ہیں؟ نیاز اللہ تعالیٰ کے نام کی ہوتی ہے، جیسے قربانی ہے، ہم قربانی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے تقرّب کے لئے، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے، یہ لوگ ولیوں کے نام کی نیاز دیتے ہیں، ولیوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے۔ عقیدے بگڑے ہوئے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اگر گیارھویں نہیں دیں گے تو ہماری بھینسوں کا دُودھ ختم ہوجائے گا، یعنی یہ صرف کہنے کی بات نہیں ہے، عقیدہ ہے لوگوں کا! پیرانِ پیر ہماری بھینسوں کا دُودھ سلب کرلیں گے۔

گیارھویں پورے دِین سے اہم؟

تم نماز نہ پڑھو، تمہاری بھینسوں کو کچھ نہیں ہوتا، تم دِین کی کسی بات پر عمل نہ کرو، تمہاری بھینسوں کو کچھ نہیں ہوتا، تم ساری دُنیا کے گناہ کرتے رہو اس سے کچھ بگاڑ نہیں ہوتا، لیکن ایک دن تم گیارھویں نہ دو، تمہاری بھینسوں کا دُودھ خشک ہوجاتا ہے؟ تم ہی انصاف کرو! کہ نماز، روزہ اور دِین کے تمام فرائض سے بڑھ کر اس کو فرض سمجھا کہ نہیں سمجھا؟

پیرانِ پیرؒ وہابی تھے؟

بہت مدّت کی بات ہے، تیس سال پہلے کی بات ہے، ہمارے گاؤں میں ایک بڑھئی ہوتے تھے، مستری صاحب، وہ ذرا ان چیزوں کے قائل تھے، مست آدمی تھا بے چارہ، ایک دن مسجد میں بیٹھا تھا، میں نے ایسے ہی پوچھ لیا کہ مستری جی! وہابی

کس کو کہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ: جو گیارھویں نہ دے! بڑا بے تکلف سا آدمی تھا، سادہ آدمی تھا، میں نے کہا کہ: آپ کو معلوم ہے کہ پیرانِ پیر کب ہوئے ہیں جن کی گیارھویں دی جاتی ہے؟ کہنے لگا: مجھے تو معلوم نہیں! میں نے کہا کہ: میں بتاتا ہوں، پانچویں یا چھٹی صدی میں ان کی پیدائش ہوئی ہے، نوّے سال کی عمر میں چھٹی صدی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ کہنے لگا: اچھا! میں نے کہا کہ: دیکھو نا! پیرانِ پیر پیدا ہوئے ہوں گے، پھر وہ بڑے ہوئے ہوں گے، انہوں نے علم پڑھا ہوگا، پھر کسی شیخ کی خدمت میں رہ کر اللہ اللہ سیکھی ہوگی، اللہ تعالیٰ کا نام سیکھا ہوگا، اس کے بعد وہ بزرگ بن گئے، پھر ان کا انتقال ہوا، تو لوگوں نے ان کی گیارھویں دینی شروع کردی۔ کہنے لگا کہ: ہاں! یہ بھی ہے۔ میں نے کہا کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت پیرانِ پیر اپنی گیارھویں خود تو نہیں دیتے تھے نا! کہنے لگا کہ: نہیں! میں نے کہا کہ: جو گیارھویں نہ دے وہ وہابی ہے، لہٰذا پیرانِ پیر وہابی! اور حضرت پیرانِ پیر جو ان کے پیر و مرشد ہوں گے وہ اپنے مرید کے نام کی گیارھویں تو نہیں دیتے ہوں گے یا کہ دیتے تھے؟ اسی طرح اُوپر تک چلے جاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تو یہ سارے کے سارے وہابی، کیونکہ جو گیارھویں نہ دے وہ وہابی ہوتا ہے۔

چھٹی صدی کے بعد کی چیز دِین کیسے؟

خدا کے بندو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں عقل عطا فرمائی ہے، کچھ تو سوچو کہ چھٹی صدی کے بعد کوئی چیز آتی ہے وہ تمہارے دِین کا حصہ کیسے بن گئی؟ وہ تمہارے دِین میں کیسے داخل ہوگئی؟ اگر تم کہو کہ ہم ایصالِ ثواب کے لئے دیتے ہیں، حضرت پیرانِ پیر کی جو گیارھویں دیتے ہیں وہ ان کے ایصالِ ثواب کے لئے دیتے ہیں، بہت اچھا! میں پوچھتا ہوں کہ اگر دسویں کو دے دی جائے تو ثواب نہیں پہنچے گا؟ اور اگر بارھویں کو دے دی جائے، ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ کردیا جائے وہ نہیں پہنچے گا؟ یہ

گیارھویں تاریخ کی پابندی کس کے لئے ہے؟

شیطان کا دھوکا:

فرائضِ شرعیہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرّر کردیئے ہیں، اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لو! پنج گانہ نمازوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرّر کردیئے ہیں، اگر ظہر کی نماز ظہر سے پہلے پڑھوگے تو نماز نہیں ہوگی، اگر بعد میں پڑھو گے تو قضا ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ نے فرض نماز کے لئے ایک وقت مقرّر کردیا، روزے کا ایک وقت مقرّر کردیا ہے، اگر رمضان سے پہلے روزے رکھ لو تو وہ رمضان کے روزے نہیں ہوں گے، فرائض کے لئے اللہ تعالیٰ نے اوقات مقرّر کئے ہیں، کسی نفل کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی وقت مقرّر کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تمام عبادتیں مقرّر کی ہیں، ان میں جو فرائض تھے ان کے لئے خاص شرطیں مقرّر فرمائی ہیں، لیکن نفلوں کے لئے کوئی خاص وقت مقرّر نہیں فرمایا، اور تم نے گیارھویں کے لئے وقت مقرّر کرلیا، اور ختم شریف کے لئے تیجہ مقرّر کرلیا، دسواں مقرّر کرلیا، تو معلوم ہوا کہ یہ شیطان کا دھوکا ہے، یہ کہنا کہ ہم ایصالِ ثواب کے لئے کرتے ہیں یہ شیطان کا دھوکا ہے، شیطان کوئی نہ کوئی تأویل سمجھا دیتا ہے۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارھویں دی؟

اور پھر دُوسرا سوال یہ ہوگا کہ حضرت پیرانِ پیر کی گیارھویں کیوں دیتے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی کبھی دی؟

کبھی عائشہؓ کے لئے ایصالِ ثواب کیا؟

حضرت اِمامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا دیتا تھا، تو ایک دفعہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ناراض ہیں، میں نے بہت ہی عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ حضور! اگر مجھے ناراضی کی وجہ معلوم ہوجائے تو میں کم از کم اپنی اصلاح کرلوں، مجھے یہی معلوم نہیں کہ حضور مجھ سے کس بنا پر ناراض ہیں، مجھ سے غلطی کیا ہو رہی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفیقانہ محبت اور ناراضی کے لہجے میں فرمایا۔

اس سے پہلے عرض کردوں کہ ناراضی بھی دو قسم کی ہوتی ہے، ایک دوستوں سے ناراضی ہوتی ہے، اور ایک دُشمن سے ناراضی ہوتی ہے، دونوں ناراضیوں میں فرق ہے۔

فرمایا کہ: تم ہمارے لئے ایصالِ ثواب کرتے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا کھانا عائشہ کے گھر ہوتا تھا؟

مقصد یہ تھا کہ تم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ایصالِ ثواب میں شریک نہیں کرتے۔

عائشہؓ کے بغیر تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت پر نہ جاتے:

ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، حدیث میں قصہ آتا ہے کہ:

”عَنْ أَنَسٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ اِنَّ جارًا لِّرَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَارِسِیًّا کَانَ طَیِّبُ الرِّقِّ فَصَنَعَ لِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ جَاءَ یَدْعُوْهُ فَقَالَ: وَهٰذِهٖ لِعَائِشَةَ؟ فَقَالَ: لَا! فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا! ثُمَّ عَادَ یَدْعُوْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَهٰذِهٖ لِعَائِشَةَ؟ فَقَالَ: لَا! فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَهٰذِهٖ؟ قَالَ نَعَمْ فِی الثَّالِثَةِ فَقَامَ یَتَدَافَعَانِ

حَتّٰی أَتَیَا مَنْزِلَہٗ۔‘‘ (مسند احمد ج:۳ ص:۱۲۳)

ترجمہ:...’’حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابیؓ فارس کا رہنے والا تھا، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی، صحابیؓ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: عائشہ ساتھ جائے گی؟ ...آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ بے تکلف تھے، صحابہ گستاخ نہیں تھے، بے ادب نہیں تھے، بے تکلف تھے...صحابی نے عرض کیا: حضور! آپ اکیلے کی دعوت ہے، عائشہؓ ساتھ نہیں جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ہم نہیں جائیں گے! دُوسرے موقع پر وہ صحابی پھر حاضر ہوا، کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ ساتھ جائے گی؟ وہ صحابیؓ کہنے لگے: عائشہؓ نہیں جائے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: پھر ہم بھی نہیں جائیں گے! پھر تیسری مرتبہ حاضر ہوا کہ: یا رسول اللہ! آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ ساتھ جائے گی؟ اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا: اچھا عائشہؓ بھی ساتھ جائے گی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم ہیں فرماتے ہیں کہ: میں نے دونوں کو دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ ان کے گھر تشریف لے جارہے ہیں کھانا کھانے کے لئے ...جو ایک معمولی بے چارہ مزدور تھا...۔‘‘

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق نہیں؟

حضرت پیرانِ پیر کو تم نے ایصالِ ثواب کردیا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حق نہیں تھا؟ حضرت علیؓ سے روایت ہے:

”عَنْ حَنَشٍ قَالَ: رَأَيْتُ عَلِيًّا يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ لَهُ: مَا هٰذَا؟ فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْصَانِي أَنْ أُضَحِّيَ عَنْهُ فَأَنَا أُضَحِّيَ عَنْهُ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۲۸ بحوالہ ابوداؤد، ترمذی)

ترجمہ:... ”حضرت حنشؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ وہ دو قربانیاں کررہے ہیں، میں نے ان سے سوال کیا کہ دو قربانیوں کیوں کررہے ہیں؟ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ نے جواب دیا: مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی تھی کہ علی! جب اپنی قربانی کیا کرو تو میری قربانی ساتھ کیا کرو، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی قربانی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی بھی ساتھ کرتے تھے۔“

ہمارے شیخؒ کا معمول:

ہمارے شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ کا معمول تھا، باقاعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اپنے مشائخ کی قربانی بھی کرتے تھے، اور الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی توفیق عطا فرمائی، صرف اپنی قربانی پر اِکتفا نہیں کرتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو لازماً کرتا ہوں، باقی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادے، پانچ سات دس جتنی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں اکابر کی طرف سے قربانیاں کرتا ہوں۔

حج وعمرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے:

اب بات منہ پر آ گئی تو کہہ دیتا ہوں کہ جتنی مرتبہ بھی مدینہ طیبہ کی حاضری ہوئی ہے، مدینہ سے واپسی پر جب بھی میں نے اِحرام باندھا ہے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا اِحرام باندھا، میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے کسی اور کے نام کا اِحرام باندھتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اور اب تو میں نے عمرہ کیا، حج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شروع کردیا ہے، ہمارا کیا ہے ہمارا تو ان کے طفیل میں ہے، یہ سب کچھ اسی آقا کا کرم ہے۔ تم ہمیں کہہ دیتے ہو کہ وہابی ہیں، ہم تو تھوڑا سا آگے نکل جاتے ہیں، ہم کہتے ہیں اسی آقا کا فیضان ہے، انہی کی برکت سے اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں، جو کچھ بھی عطا فرماتے ہیں۔

اللہ ہی دینے والے ہیں:

ایک دفعہ ہمارے شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ لائل پور تشریف لائے ...یہ اس وقت فیصل آباد نہیں تھا، اس لئے کہ بہت دیر کی بات ہے... اور بہت بڑا مجمع تھا، شیخ نوّر اللہ مرقدہٗ کو عصر کے بعد زیارت کے لئے لایا گیا اور لوگ مصافحے کے لئے ٹوٹ پڑے، شیخ بیمار، کمزور، اب جو بے چارے انتظام کرنے والے تھے مجمع ان کے قابو سے باہر ہوگیا، شیخ کے ساتھ حضرت مولانا محمد یوسفؒ ...حضرت جی... بھی تھے، میں بالکل پاس بیٹھا تھا، اس تخت کے پاس تھا جس پر حضرتِ شیخ تشریف فرما تھے، حضرت مولانا محمد یوسف حضرت جی اچانک کھڑے ہوگئے ان کا کھڑا ہونا تھا، بلامبالغہ میں کہتا ہوں کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا، یہ میں نے ان کی کرامت دیکھی، نہ کسی سے یہ کہا کہ خاموش ہوجاؤ، بات سنو، کچھ بھی نہیں، ان کا کھڑا ہونا تھا کہ پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، شیخ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: ان بزرگوں سے کچھ نہیں ملتا جو کچھ ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے، لیکن جس شخص پر ان بزرگوں کی شفقت ہوجائے اللہ تعالیٰ عطا

فرمادیتے ہیں، اس لئے مصافحوں کی کوشش نہ کرو، بلکہ ان کو راحت پہنچانے کی کوشش کرو۔ بس اتنا کہا اور بیٹھ گئے، اب ایک آدمی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔

دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے نہ کسی فرشتے کے قبضے میں کوئی چیز رکھی ہے، نہ کسی نبی کے قبضے میں رکھی ہے، لیکن تعلق والوں کو دیتے ہیں، جن کا تعلق ان کے ساتھ ہوگا ان کو عطا فرماتے ہیں۔

ہمارے اور ان کے درمیان فرق:

ہم میں اور تم میں یہی فرق ہے، تم کہتے ہو کہ بزرگ دیتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ بزرگوں سے صحیح تعلق رکھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔ دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا تعلق ہوگا، اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے جتنا تعلق ہوگا، ان کی جتنی اقتدا کی جائے گی، ان کی جتنی پیروی کی جائے گی اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی جتنی پیروی کی جائے گی، حق تعالیٰ شانہٗ کی رحمتوں کے دریا اسی نسبت سے تیز ہوں گے۔

بزرگوں سے لینے کا طریقہ:

بزرگوں سے لینے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ان کے مزاروں پر جاکر ان سے دُعائیں مانگو، بزرگوں کو ماننے کا طریقہ وہ نہیں ہے جو عیسائیوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کیا ہے، بزرگوں کو ماننے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلو، ان کی دِل میں محبت پیدا کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو، دیکھو! کیا ملتا ہے۔

اللہ تک پہنچنے کا طریقہ:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ اکثر فرماتے تھے، حضرتؒ کے چھوٹے چھوٹے فقرے ہوتے تھے اور اکثر دُہراتے رہتے تھے، حضرتؒ فرماتے تھے

کہ: اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی اللہ والے کے دِل میں بیٹھ جاؤ۔

ایک چیونٹی کے دِل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں کعبہ تک پہنچ جاؤں، اس نے کبوتر کے پاؤں پکڑ لئے، اور کبوتر تھا حرم کا، حرم کے کبوتر کے پاؤں پکڑے اور اچانک پہنچ گئی، ورنہ چیونٹی کیسے پہنچتی؟ تم اللہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی اللہ والے کے دِل میں بیٹھ جاؤ، کسی اللہ والے سے تعلق قائم کرلو، کسی کے پاؤں پکڑلو، کسی کا دامن پکڑلو، پہنچ جاؤ گے۔

بدعات سے اللہ اور اولیاء کا تقرّب حاصل نہ ہوگا:

اللہ تعالیٰ سے یہ لینے کا طریقہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے، بدعات ایجاد کرکے، غلط رسمیں ایجاد کرکے، تم چاہتے ہو کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا تقرّب حاصل کرو، یہ نہیں ہوگا، نہ اللہ تعالیٰ کا تقرّب حاصل ہوگا، نہ اولیاء اللہ کا تقرّب حاصل ہوگا، اولیاء اللہ کا تقرّب حاصل ہوگا ان کی اقتدا کرتے ہوئے، ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، ان کی محبت دِل میں جماؤ، جیسے وہ بنے تھے ویسے بن جاؤ، نہ تمہاری شکل ان جیسی، نہ تمہارا عمل ان جیسا، تم ولیوں کو ماننے والے ہو؟ اولیاء اللہ سے محبت ہے تو ان جیسے بنو، ان کے نقشِ قدم پر چلو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کی نقل اُتارو:

میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل اُتارو، میں کہتا ہوں کہ اولیاء اللہ کی نقل اُتارو، اپنے اعمال کو ان حضرات کے اعمال کے سانچے میں ڈھالو، اپنے کاروبار کو ان کے کاروبار کے سانچے میں ڈھالو، اپنی شکلوں کو ان کی شکلوں جیسا بناؤ، اپنی تہذیب کو ان کی تہذیب جیسا بناؤ، اپنے رہن سہن کو ان کے رہن سہن کے مطابق بناؤ، پھر اِن شاء اللہ! دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تم پر کیسی ہوتی ہے، اور اولیاء اللہ کی محبت تم میں کیسی پیدا ہوتی ہے، تمہاری ایک

ایک بات اولیاء اللہ کے عمل کے خلاف ہے، دستور العمل کے خلاف ہے، اور تم گیارھویں دے کر سمجھتے ہو کہ پیرانِ پیر ہم سے راضی ہوگئے؟ ان لوگوں میں سے نہ ہونا جو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرکے اور نبی پر دُرود پڑھ کے دھوکا دینا چاہتے ہیں، جب تک اللہ تعالیٰ کے اَحکام پر اور نبی کی سنتوں پر عمل نہیں کروگے اس وقت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوں گے، پیرانِ پیر کے لئے گیارھویں کے وعدے نہیں ہوں گے۔

گیارھویں نہ دینے پر نقصان کی وجہ:

رہا تمہارا یہ شبہ کہ اگر ہم گیارھویں نہ دیں تو ہماری بھینسوں کا دُودھ خشک ہوجاتا ہے، بس میں تقریر ختم کرتا ہوں، لیکن اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے:

”عَنْ یَحْیَی بْنَ الْجَزَّارِ عَنِ ابْنَ أُخْتِ زَیْنَبَ اِمْرَأَۃُ عَبْدِاللہِ عَنْ زَیْنَبَ قَالَتْ: کَانَتْ عَجُوْزٌ تَدْخُلُ عَلَیْنَا تَرْقِی مِنَ الْحُمْرَۃِ وَکَانَ لَنَا سَرِیْرٌ طَوِیْلُ الْقَائِمِ وَکَانَ عَبْدُاللہِ اِذَا دَخَلَ تَنَحْنَحَ وَصَوَّتَ فَدَخَلَ یَوْمًا فَلَمَّا سَمِعْتُ صَوْتَہٗ اِحْتَجَبْتُ مِنْہُ فَجَاءَ فَجَلَسَ اِلٰی جَانِبِیْ فَمَسَّنِیْ فَوَجَدَ مَسَّ خَیْطٍ فَقَالَ: مَا ھٰذَا؟ فَقُلْتُ: رُقًی لِّیْ فِیْہِ مِنَ الْحُمْرَۃِ فَجَذَبَہٗ فَقَطَعَہٗ فَرَمٰی بِہٖ وَقَالَ: لَقَدْ أَصْبَحَ اٰلُ عَبْدِاللہِ أَغْنِیَاءَ عَنِ الشِّرْکِ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اِنَّ الرُّقٰی وَالتَّمَائِمَ وَالتَّوْلَۃَ شِرْکٌ، قُلْتُ: فَاِنِّیْ خَرَجْتُ یَوْمًا فَأَبْصَرَنِیْ فُلَانٌ فَدَمِعَتْ عَیْنِیَّ الَّتِیْ تَلِیْہِ فَاِذَا رُقِیْتُھَا سَکَنَتْ دَمْعَتُھَا وَاِذَا تَرَکْتُھَا دَمِعَتْ،

قَالَ: ذَاکَ الشَّیطَانُ اِذَا أَطَعتِہٖ تَرَکَکِ وَاِذَا عَصَیتِہٖ طَعَنَ بِاُصبُعِہٖ فِی عَینِکِ، وَلٰکِنْ لَوْ فَعَلتِ کَمَا فَعَلَ رَسُولُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ کَانَ خَیرًا لَّکِ وَأَجدَرُ أَنْ تَشفِینَ تَنضِحِینَ فِی عَینِکِ المَاءَ .....“

(سنن ابن ماجہ ص: ۲۵۲، ابواب الطب)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انہوں نے اپنی اہلیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گلے میں ایک دھاگہ پڑا ہوا دیکھا، گنڈہ ہوتا ہے نا! اس کو پڑھ کر ڈال دیتے ہیں، وہ جاہلیت کے زمانے میں ڈالتے تھے، انہوں نے اس طرح ہاتھ سے پکڑا اور کھینچ کر اس کو توڑ دیا، اور فرمایا: اے عبداللہ کے خاندان کے لوگو! تم شرک سے غنی ہو، تمہیں شرک کی ضرورت نہیں ہے۔ زینبؓ کہنے لگیں: یہ شرک ہے؟ کہنے لگے: ہاں شرک ہے! کہنے لگیں: آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ میری آنکھ میں تکلیف ہوجاتی تو میں فلاں یہودی سے دم کروا کر لاتی تھی تو وہ ٹھیک ہوجاتا تھا، اور آنکھ ٹھیک ہوجاتی تھی۔ فرمانے لگے: اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شیطان کا چکر تھا، جب تم شیطان کے دوست کے پاس جاتے تھے تو وہ اپنا تصرف ہٹا دیتا تھا اور بعد میں پھر تصرف کر کے آنکھ پر اثر کرتا تھا تو یہ شیطان کا چکر تھا۔

بت کے اندر شیطان:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بت توڑنے کا حکم فرمایا، وہ توڑ دیا گیا تو وہاں ایک عورت دیکھی بال اس کے بکھرے ہوئے، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون تھی؟ فرمایا: وہ شیطان تھی، جب لوگ جا کر سجدے کرتے تھے تو وہی اندر سے پکارتی تھی، ہاں! تمہاری مراد سن لی گئی، ہاں! تمہارا یہ کام ہوجائے گا۔ شیطان اندر سے بول رہا ہے۔ مزاروں کے اندر سے قبروں کے اندر سے اور آستانوں کے اندر

سے شیطان بول رہا ہے اور یہ شیطان کا چکر ہے کہ تم خلافِ شرع کام کرتے ہو تو تمہارا دُودھ جاری ہوجاتا ہے، اور جب تم یہ نہ کرو تو دُودھ سکھا دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا ہاتھ خشک ہونا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ آتا ہے کہ لوگ ایک درخت کی پوجا کرتے تھے، حضرتؓ نے کلہاڑا لیا اور مارا اس کو اور ہاتھ خشک ہوگیا، کلہاڑا مارنا تھا کہ ہاتھ خشک ہوگیا، اب تم جیسے کچے اعتقاد کا کوئی ہوتا تو فوراً توبہ کرنے لگتا کہ میں نے یہ کیا کیا؟ حضرتؓ نے دُوسرے ہاتھ میں کلہاڑا لیا اور درخت پر مارا تو درخت کٹ گیا اور دونوں ہاتھ ٹھیک ہوگئے۔ شیطان کا تصرف تھا تو رحمانی تصرفات کو اور شیطانی تصرفات کو سمجھو! یہ ایک مستقل علم ہے جو اللہ تعالیٰ اِلقاء فرماتے ہیں۔

نجات دینے اور ہلاک کرنے والے اعمال

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ترجمہ:... ''تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین ہلاک کرنے والی، پس تین چیزیں جو نجات دِلانے والی ہیں ۱:...اللہ تعالیٰ سے ڈرنا پوشیدہ میں اور ظاہر میں، جلوَت میں اور خلوَت میں۔ ۲:... حق بات کہنا خوشی میں اور ناخوشی میں، رضامندی کی حالت میں اور غصّے کی حالت میں۔ ۳:...میانہ روی اختیار کرنا مال داری کی حالت میں اور فقر کی حالت میں۔ اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں: ۱:...خواہشِ نفس یعنی وہ خواہش جس کی پیروی کی جائے۔ ۲:...وہ حرص جس کا کہا مانا جائے۔ ۳:...خودپسندی یعنی آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اور یہ تینوں میں سب سے زیادہ سخت چیز ہے۔ یعنی یہ آخری چیز ہلاک کرنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

مشکوٰۃ شریف میں اِمام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب ''شعب الایمان'' کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ... اِمام بیہقی رحمہ اللہ کی یہ کتاب ابھی حال ہی میں سات جلدوں میں چھپی ہے...

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ثَـلَاثٌ مُـنْـجِيَـاتٌ وَثَـلَاثٌ مُهْلِكَاتٌ، فَأَمَّا الْـمُـنْـجِيَـاتُ: فَتَقْوَى اللهِ فِى السِّرِّ وَالْعَـلَانِيَةِ، وَالْقَوْلُ بِالْحَقِّ فِى الرِّضَاءِ وَالسَّخَطِ، وَالْقَصْدُ فِى الْغِنٰى وَالْفَقْرِ، وَأَمَّا الْمُهْلِكَاتُ: فَهَوًى مُّتَّبَعٌ، وَشُحٌّ مُّطَاعٌ، وَإِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَهِىَ أَشَدُّهُنَّ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۴)

ترجمہ:... ''تین چیزیں نجات دینے والی ہیں اور تین ہلاک کرنے والی، پس تین چیزیں جو نجات دِلانے والی ہیں ۱:...اللہ تعالیٰ سے ڈرنا پوشیدہ میں اور ظاہر میں، جلوَت میں اور خلوَت میں۔ ۲:...حق بات کہنا خوشی میں اور ناخوشی میں، رضامندی کی حالت میں اور غصّے کی حالت میں۔ ۳:...میانہ روی اختیار کرنا مال داری کی حالت میں اور فقر کی حالت میں۔

اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں: ا:...خواہشِ نفس یعنی وہ خواہش جس کی پیروی کی جائے۔ ۲:...وہ حرص جس کا کہا مانا جائے۔ ۳:...خودپسندی یعنی آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اور یہ تینوں میں سب سے زیادہ سخت چیز ہے۔ یعنی یہ آخری چیز ہلاک کرنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔“

بس آج کی صحبت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی مختصر سی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمادیا ہے جو ہمیں دُنیا اور آخرت میں نفع دینے والی ہیں، یا ہمیں نقصان دینے والی ہیں۔

نادان بچہ اور عقل مند باپ:

ہماری حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ...بطور مثال کے بیان کرتا ہوں... وہی ہے جو ایک نادان بچے کی عقل مند باپ کے سامنے ہوتی ہے۔ بچہ اپنے نفع اور نقصان کو نہیں سمجھتا، اس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے، اس کا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، کھیلنے کو جی چاہتا ہے، دوائی کو جی نہیں چاہتا، مٹھائی کو جی چاہتا ہے، غرضیکہ جو چیز بھی اس کی طبیعت کو مرغوب ہو وہ اس کی طرف لپکتا ہے، اور جو چیز اس کا مستقبل بنانے والی ہے، وہ اپنی نادانی اور کم عقلی کی وجہ سے اس سے گریز کرتا ہے، ٹھیک اسی طریقے سے جو چیزیں دُنیا میں مستقبل کے لحاظ سے یعنی مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد یا میدانِ محشر میں ہمیں نفع دینے والی ہیں ہمارا یہ بچہ یعنی نفس ان کو قبول نہیں کرتا، چونکہ نفس بھی بچے کی مانند ہے، لہٰذا جو چیزیں نقصان دینے والی ہیں، یہ ان کی طرف دو وجہ سے لپکتا ہے:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی ناقص عقل کی بنا پر اپنے نفع اور نقصان کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ہمارا مستقبل بنے گا؟ اور کون سی چیزیں ہیں جن سے ہمارا مستقبل بگڑے گا؟ ہمارے یہاں معاشرے میں ایک اُصول

طے کرلیا گیا ہے کہ پیسہ آنا چاہئے خواہ حلال سے آئے یا حرام سے آئے، بس اس سے مستقبل بنے گا، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ زیادہ موٹاپا بھی بیماری ہے، اور اگر کسی ایک عضو میں مادّہ جمع ہوجائے تو پھوڑا بن جاتا ہے اور پھوڑا بعض دفعہ کینسر کی شکل اختیار کرلیتا ہے ...اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے...تو مال جمع کرکر کے موٹے ہوتے رہنا یہ مستقبل بنانے والی چیز نہیں ہے، یہ ہماری نادانی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا مستقبل ہے، یا ہمارا اور ہمارے بچوں کا مستقبل بن رہا ہے، ارے اس سے ہمارا مستقبل بن نہیں رہا بلکہ بگڑ رہا ہے۔تو میں نے کہا کہ ایک تو ہمیں اپنی ناقص عقل کی بنا پر یہی معلوم نہیں کہ کون سی چیزیں مستقبل میں ...دُنیا ہی کے اندر... ہمیں فائدہ دینے والی ہیں؟ اور کون سی نقصان دینے والی ہیں؟ یا کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے کرنے سے نزع میں آسانی ہوتی ہے؟ اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے کرنے سے نزع میں تکلیف ہوتی ہے؟ یا موت کی سختی زیادہ ہوتی ہے؟ کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے کرنے سے قبر بنتی ہے اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے کرنے سے قبر بگڑتی ہے؟

قبر کا ڈَر:

ہم نے قبر اور قبر کی شدّت، تلخی، اس کی راحت و عذاب کو گویا اپنے مستقبل سے نکال دیا ہے، حالانکہ حدیث پاک میں ہے:

”اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۵۸، بحوالہ ترمذی)

ترجمہ:...”قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔“

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جب کبھی قبرستان تشریف لے جاتے تو قبر کو دیکھتے ہی رونے لگتے، یہاں تک

کہ ریش مبارک تر ہوجاتی، ان سے عرض کیا گیا کہ: آپ جنت و دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر ان پر اتنا نہیں روتے جتنا کہ قبر کو دیکھ کر روتے ہیں؟ تو فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

”اِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِّنْ مَّنَازِلَ الْاٰخِرَةِ، فَاِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَاِنْ لَّمْ يُنْجَ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهٗ أَشَدُّ مِنْهُ.....“ (مشکوٰۃ ص:۲۶، بحوالہ ترمذی، ابن ماجہ)

ترجمہ:... ”قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، اگر یہاں بچ گیا تو اِن شاء اللہ آگے بھی بچ جائے گا، اور اگر یہیں پکڑا گیا تو آگے کی کیا اُمید؟“

اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ.“ (مشکوٰۃ ص:۴۵۸، بحوالہ ترمذی)

ترجمہ:... ”قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔“

ہمیں معلوم ہی نہیں کہ کن چیزوں سے قبر بگڑتی ہے؟ اور کن چیزوں سے قبر بنتی ہے؟ تمہاری کسی سائنس نے یہ فارمولا ایجاد ہی نہیں کیا، تم مریخ پر کمندیں ڈال لو، چاند تک پہنچ جاؤ، ساری فضاؤں کو مسخر کرلو، لیکن قبر کے اندر ڈیڑھ گز زمین کے نیچے کیا ہورہا ہے؟ آج تک تمہاری سائنس نے اس کے لئے کچھ ایجاد نہیں کیا۔

کن چیزوں سے آخرت بنتی اور بگڑتی ہے؟

لہٰذا کون سی چیزیں ایسی ہیں، جن سے آخرت بگڑتی ہے؟ اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے آخرت بنتی ہے؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں، اس کے لئے ضرورت ہے کسی مشفق باپ کی تعلیم وتربیت کی اور اپنی رائے کو چھوڑ کر ان کی اقتدا کرنے کی، لیکن وہ

چونکہ نفس کو شاق گزرتی ہے، کیونکہ یہ نفس شتر بے مہار رہنا چاہتا ہے، کوئی اس کو ٹوکنے والا، روکنے والا نہ ہو، اس لئے نہیں مانتا، تو جس طرح کہ ایک نادان بچہ اپنے شفیق اور عقل مند باپ کے سامنے روتا ہے، چیختا اور چلّاتا ہے اور ایسی چیزوں سے جو اس کا مستقبل بنانے والی ہیں، ان سے گریز کرتا ہے، اسی طرح نفس بھی آزاد رہنا چاہتا ہے، بس سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہماری وہی حیثیت ہے جس طرح ایک شفیق باپ نہایت شفقت کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور ان کو اچھی باتوں کی نصیحت کرنا چاہتا ہے اور بُری باتوں سے ان کو روکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"اِنَّمَا أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۲)

ترجمہ:..."میں تمہارے لئے ایسا ہی ہوں جس طرح کہ باپ اپنے بیٹے کے لئے ہوتا ہے۔"

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی تفصیل کے ساتھ بتلایا اور سمجھایا، یعنی وہ چیزیں جو ہمیں کام دینے والی ہیں ان کو بھی بیان فرمایا، اور جو چیزیں نقصان دینے والی ہیں ان کو بھی بیان فرمایا، اگر غور کیا جائے تو پورے دِین کا خلاصہ ہی یہ دو لفظ ہیں، کہ کن سے ہمارا مستقبل بنے گا؟ اور کن سے ہمارا مستقبل بگڑے گا؟ مستقبل میں ہماری یہ دُنیا کی زندگی بھی آجاتی ہے، موت اور موت کے بعد کی زندگی بھی آجاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی آجاتی ہے، بس یہی دو لفظ کہ کن چیزوں سے ہمارا مستقبل بنے گا؟ اور کن چیزوں سے ہمارا مستقبل بگڑے گا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک کو تفصیل سے بیان فرمایا، اس کے لئے مختلف عنوانات اختیار فرمائے، ایک ہی لگا بندھا عنوان اختیار نہیں فرمایا، کیونکہ لوگ مختلف سطح کے ہوتے ہیں، کچھ زیادہ عقل مند ہوتے ہیں، کچھ ہم جیسے غبی۔ ہر سطح کا عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تاکہ اُمت کے افراد کے ذہنوں

میں بات اُتر جائے۔

تو اس حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منجیات اور مہلکات کا عنوان ذکر فرمایا، یعنی تین چیزیں نجات دِلانے والی ہیں اور تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں۔ یہ عنوان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا ہمیں بتاتا ہے کہ ان چیزوں کو محفوظ کرنا اور پھر ان پر عمل کرنا کتنا ضروری ہے؟ بھائی! نجات کی کس کو ضرورت نہیں؟ اور ہلاکت سے کون نہیں بچنا چاہتا؟ تو جو چیزیں نجات دِلانے والی ہیں ان کو اِختیار کرنا اور جو چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں ان سے بچنا، یہ ہر شخص کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں بیان فرمایا ہے۔

نجات دینے والے اعمال:

نجات دِلانے والی چیزوں میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ سے ہر حال میں ڈرنا ہے، پوشیدہ میں بھی اور علانیہ میں بھی، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی، جلوَت میں بھی اور خلوَت میں بھی۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ: پورے دِین کی چوٹی اور اس کا سر اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوگا تو آدمی اپنی اصلاح کرے گا، اور جس کے دِل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو، وہ ایسا ہے جیسے بدن سے سر کاٹ دیا جائے تو وہ بے دھڑ لاشہ رہ جاتا ہے، اسی طرح دِین کے اندر سے اگر اللہ تعالیٰ کے خوف کو نکال دیا جائے تو کچھ بھی نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں بھی بہت ساری جگہ اللہ تعالیٰ نے ڈرنے کا حکم فرمایا ہے، عام طور پر آپ خطبوں میں اور خاص طور پر نکاح کے خطبے میں یہ آیت سنتے ہیں:

”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔“ (آل عمران:۱۰۲)

ترجمہ:... ”اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا

کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔“

دیکھو! تمہاری موت اسلام پر آنی چاہیے، اب مرنا تو اِختیار میں نہیں، مطلب یہ کہ اسلام کے ساتھ اس طرح چمٹے رہو کہ جب بھی موت آئے اسلام پر آئے، تو اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق کون ادا کرسکتا ہے؟ ارشادِ مبارک کا منشا تو یہی تھا کہ تم اپنے دائرے میں اپنی استطاعت کے دائرے میں جتنا اللہ تعالیٰ سے ڈر سکتے ہو، ڈرو! لیکن الفاظ یہ ہیں کہ: ”ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا۔“ تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق کون ادا کرسکتا ہے؟ اس پر دوسری آیت شریفہ نازل ہوئی:

”فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَأَطِيْعُوْا۔“ (التغابن:۱۶)

ترجمہ:... ”سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے جتنی تم میں طاقت ہے اور سنو اور مانو۔“

پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو سنو اور مانو۔ تو غرض یہ کہ بہت ساری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم فرمایا ہے اور اس کے فوائد بھی بیان فرمائے ہیں، چنانچہ ایک دوسری آیت میں ہے:

”وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا“ (الطّلاق:۲)

ترجمہ:... ”اور جو شخص ڈرے اللہ سے، اللہ تعالیٰ پیدا کردیتے ہیں اس کے لئے نکلنے کی صورت۔“

یہ دراصل سورۂ طلاق کی آیت ہے، جس میں اُوپر سے طلاق کا ذکر ہو رہا تھا، اسی کے زُمرے میں فرمایا گیا:

”وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ، وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔“ (الطّلاق:۲،۳)

ترجمہ:... ”اور جو شخص ڈرے اللہ سے، اللہ تعالیٰ پیدا کردیتے ہیں اس کے لئے نکلنے کی صورت، اور اس کو رزق دیتے ہیں ایسی جگہ سے کہ اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرّر کردیا ہے۔“

طلاق میں اللہ کا ڈر؟

طلاق کے مضمون کے ساتھ اس کا جوڑ یہ ہے کہ طلاق کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ غصّے میں آگئے میاں جی، اور چھوٹتے ہی سیدھے ایک، دو، تین، بیس، سو اور لاکھ طلاق کہہ دے، اور پشیمانی کے سوا نتیجہ کچھ بھی نہیں۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اس نے کہا: حضرت! میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، اب رُجوع کی کوئی صورت ہوسکتی ہے؟

ہمارے اہلِ حدیث بھائی ہوتے تو کہہ دیتے کہ ابنِ عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں، لہٰذا رُجوع کرلو۔ لیکن ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے یہ فتویٰ نہیں دیا بلکہ قرآنِ کریم کی یہی آیت پڑھی اور فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی صورتیں پیدا کردیتے ہیں۔ تو نے طلاق دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے

نکلنے کی کوئی صورت نہیں بنائی، تیری بیوی تجھ سے علیحدہ ہوگئی۔

ایک اور شخص آیا کہنے لگا کہ: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں۔ فرمایا کہ: طلاق تو تین ہی ہوتی ہیں، سو نہیں، طلاق کا آخری نصاب تین ہے، لہٰذا تین طلاق سے تو تیری بیوی بائنہ ہوگئی اور ستانوے طلاقوں سے تم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کا مذاق اُڑایا ہے۔ تجھے کس نے حق دیا تھا سو طلاق دینے کا؟ تو نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کھیل بنایا ہے۔

غصّے والی بات پر غصہ سنت ہے:

لوگ کہتے ہیں کہ بھئی مولوی غصہ بہت ہوتے ہیں۔ غصّے والی بات پر غصہ آنا چاہئے اللہ کے بندو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی غصہ ہوجاتے تھے، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق سبحان اللہ! لیکن غصّے والی بات پر غصہ ہوتے تھے۔ اُمّ المؤمنین ہماری ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وارضاہا فرماتی ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی بڑے دُشمن سے بھی انتقام نہیں لیا، جو کسی نے کیا سب معاف، اِلَّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو توڑا جائے، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حد کو توڑ دیتا تھا تو پھر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غصّے کی تاب نہیں لاسکتا تھا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آتا تھا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غصّے کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں، جن کو میں بیان کرسکتا ہوں، مگر یہ مضمون نہیں ہے۔

تو میں نے کہا کہ طلاق کے معاملے میں بھی تقویٰ سے کام لینا چاہئے، اب یہ بات بیچ میں آگئی ہے تو یہ مسئلہ بھی سمجھا دُوں۔

مسئلۂ طلاق میں غلط فہمی:

ہماری عوام یہ سمجھتی ہے کہ تین سے کم اگر طلاق دی جائے تو طلاق ہی نہیں

ہوتی، یہ ہمیشہ تھری ناٹ تھری کو استعمال کرنے کے قائل ہیں، یہ بات نہیں ہے، بھائی! تین طلاق کا مطلب ہے کہ تین طلاق آخری حد ہے، اس کے بعد کوئی حد نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ۔“ (البقرۃ:۲۲۸)

طلاق دو مرتبہ ہوتی ہے، یعنی ایک طلاق دے دی، چلو دُوسری دے دی، خیر ہے، ایک طلاق دینے کے بعد یا دو طلاقیں دینے کے بعد یا تو دستور کے مطابق بیوی کو روک لو، یعنی اپنے نکاح میں رکھو، نکاح نہیں ٹوٹا، طلاق ہوگئی لیکن نکاح نہیں ٹوٹا۔

درمیان میں دوسرا مضمون ہے، لیکن آگے چل کر پھر فرمایا:

”فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔“ (البقرۃ:۲۳۰)

ترجمہ:... ”اگر اس نے دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق دے دی تو وہ عورت اَب اس کے لئے حلال نہیں ہوگی جب تک کہ کسی اور شوہر سے نکاح نہیں کرتی۔“

طلاق اور رُجوع کا طریقہ:

یہ مطلب ہے تین طلاق کا، تو طلاق دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص طلاق دینا چاہتا ہو، وہ بیوی کے پاک ہونے کے بعد ...جبکہ میاں بیوی نہ ملے ہوں... ایک طلاق دیدے، جب تک اس خاتون کی عدّت نہیں گزرتی ...اور عدّت ہے تین مرتبہ عورت کا پاک ہوجانا اپنے اَیام سے... اس وقت تک شوہر کو اِختیار ہوگا کہ بیوی سے رُجوع کرلے، یعنی اگر اس کو طلاق دینے کے بعد افسوس ہوا یا بیوی کو افسوس ہوا، یا عزیز رشتہ داروں اور برادری والوں نے زور ڈالا یا بچوں کو دیکھ کر خیال آیا، غرض کوئی صورت بھی پیدا ہوگئی، اور وہ اپنی طلاق واپس لینا چاہتا ہے تو طلاق واپس لینے کی

گنجائش ہوگی، وہ طلاق تو استعمال ہوگئی، وہ تو واپس نہیں آئے گی، لیکن بیوی کو بغیر نکاح کے واپس لے سکتا ہے، یعنی نیا نکاح کرنے کی ضرورت نہیں، مطلب یہ کہ جب تک عدّت نہیں ختم ہوتی اس وقت تک اس کا نکاح باقی ہے۔

اور دو طلاق کا بھی یہی حکم ہے، یعنی اگر دو طلاقیں دی ہوں، تب بھی عدّت کے ختم ہونے تک اس کا نکاح باقی ہے، اگر چاہے تو بیوی سے رُجوع کرسکتا ہے، لیکن اگر کسی نے ایک طلاق دی تھی یا دو طلاقیں دی تھیں اور عدّت ختم ہوگئی، یعنی عورت تین مرتبہ اپنے اَیام سے پاک ہوگئی لیکن اس نے رُجوع نہیں کیا تو اَب نکاح ختم ہوگیا، اب یہ خاتون اس کی بیوی نہیں رہی، لیکن اب بھی اتنی گنجائش ضرور ہے کہ دوبارہ دونوں مل بیٹھیں اور نکاح کرلیں، تو دوبارہ نکاح کرسکتے ہیں کسی حلالہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لیکن اگر کسی نے ایک طلاق دے دی، دُوسری دے دی، اور تیسری بھی دے دی، تو اَب یہ کبھی بھی جمع نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ عورت عدّت ختم ہونے کے بعد دُوسرے شوہر سے نکاح نہ کرلے اور ازدواجی وظیفہ ادا نہ کرلے، پھر اگر وہ دوسرا شوہر مرجائے یا اپنی خوشی سے طلاق دیدے اور اس کی بھی عدّت ختم ہوجائے، اب اگر یہ خاتون چاہے تو پہلے شوہر کے پاس آسکتی ہے، یہ ہے حلالے کا مسئلہ۔

تین طلاق ایک نہیں ہوتی:

ہمارے یہاں یہ ہوتا ہے کہ تین طلاقیں ایک دم سے دے دیتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں غیرمقلدوں کے پاس، وہ بے چارے فتویٰ دے دیتے ہیں کہ ...اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے... تین طلاقیں ایک ہی ہوتی ہیں، تین بھی ایک ہوتی ہیں؟ ان سے کوئی پوچھے کسی دُنیا کی لغت میں ہے کہ تین کا معنی ایک کا ہے؟ ہم نے تو یہ عیسائیوں کی تکنیک سنی تھی، وہ کہتے ہیں کہ تین ایک ہوتے ہیں اور ایک تین ہوتے ہیں۔ تو غیرمقلد یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ تین ایک ہی ہوتی ہے، لہٰذا رُجوع کرلو، اور

وہ رُجوع کرلیتے ہیں، اور ساری عمران کے کہنے پر حرام کاری کرتے ہیں۔

غیرمقلدین کا فتویٰ اور قیامت کی جواب دہی:

میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے، وہ اپنے بارے میں کہنے لگے کہ: میں نے تین طلاقیں دے دی تھیں، غیرمقلدوں نے یہ فتویٰ بتایا، تو میں نے غیرمقلد مذہب اختیار کرلیا، لہٰذا اپنی بیوی سے رُجوع کرلیا۔ میں نے کہا کہ: اگر آپ نے غیرمقلد کا مذہب اختیار کرلیا تب بھی بیوی حلال نہیں ہوئی، اپنے نفس کو دھوکا نہ دو، نفس تمہیں دھوکا دیتا ہے اور تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، مگر بیوی پھر بھی حلال نہیں ہوئی، کیوں؟ میں نے کہا: جب تم نے طلاق دی تھی اس وقت تو تو حنفی تھا، اس وقت تو غیرمقلد نہیں تھا نا! طلاق تو حنفی عقیدے کے مطابق دی اور یہ حنفی عقیدہ نہیں ہے، چاروں اِماموں کا متفقہ فیصلہ ہے، اِمام ابوحنیفہ، اِمام شافعی، اِمام مالک اور اِمام احمد بن حنبل رحمہم اللہ چاروں اِماموں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک لفظ میں اگر تین طلاق دیں یا ایک مجلس میں تین طلاق دیں تو تین ہی ہوتی ہیں، ایک نہیں ہوتی۔ دیکھا نفس کی چوری کہاں سے ہوئی؟ پھر میں نے کہا کہ: دُوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے تو غیرمقلد مذہب اختیار کرلیا لیکن بیوی نے تو نہیں کیا، بیوی کا عقیدہ تو وہی پُرانا ہے، تو بیوی تیرے لئے کیسے حلال ہوگی؟ تو بعض لوگ تین طلاقیں دینے کے بعد بھاگتے ہیں غیرمقلدوں کے پاس اور ان سے فتویٰ لے آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ واقعتاً ہم نے فتویٰ حاصل کرلیا، میں دیکھوں گا کہ قیامت کے دن تمہیں یہ تمہارا فتویٰ بچاتا ہے کہ نہیں بچاتا؟ میں بھی دیکھوں گا اِن شاء اللہ! اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہو، اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، یہ دِین کا معاملہ ہے، تمہاری گردن پر کسی نے تلوار نہیں رکھی ہوئی، تم ویسے بے نکاح کے رکھے پھرو، مولوی بے چارہ تمہیں کیا کہے گا؟ مولوی کے پاس کوئی بندوق تو نہیں ہے، لیکن تمہیں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ یہ حلال وحرام کا مسئلہ ہے اور قیامت کے دن تمہیں اس کی جواب دہی کرنی ہے۔

حلالہ شرعی:

بعض لوگ کیا کرتے ہیں کہ حلالہ کرواتے ہیں، حلالے کا صحیح طریقہ تو میں نے بتادیا، قرآنِ کریم نے اس کو ذکر کیا ہے، چنانچہ یہ قرآنِ کریم کے الفاظ ہیں:

”فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ، فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔“ (البقرۃ:۲۳۰)

ترجمہ:... ”اگر اس نے تیسری طلاق دے دی تو اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ نکاح کرلے کسی اور شوہر سے اس کے سوا، اگر دُوسرا شوہر اس کو طلاق دے تو اَب ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں پھر دوبارہ مل بیٹھیں اگر یہ خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم۔“

قرآنِ کریم نے عدّت کو ذکر نہیں کیا اور نہ وظیفۂ اِزدواج کو ذکر کیا، مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ متعارف ہے کہ دُوسرے شوہر سے نکاح ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ عدّت نہ گزرے، اور بیوی حلال نہیں ہوگی جب تک کہ دوسرے شوہر سے وظیفۂ اِزدواج ادا نہ کرلے، خیر یہ تو قرآنِ کریم نے حلالہ ذکر فرمایا ہے، یعنی بیوی کسی دُوسرے شوہر سے نکاح کرلے جیسا کہ نکاح کئے جاتے ہیں، اور ایک مطلقہ جیسے نکاح کیا کرتی ہے، پھر نکاح کرنے کے بعد اگر کبھی اس دوسرے شوہر نے طلاق دے دی یا وہ مرگیا اور اس کی عدّت گزرگئی تو پہلے کے پاس نکاح کرکے آسکتی ہے اور جب تک یہ شرط پوری نہ ہو جب تک نہیں آسکتی۔

حلالہ غیرشرعی:

لیکن ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے؟ کہ کسی آدمی کو تلاش کرکے حلالہ کرواتے

ہیں، یعنی محض حلالہ کرنے کے لئے اس سے نکاح کرواتے ہیں، اور اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

”لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَہٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۲۸۴، بحوالہ ابن ماجہ، دارمی)

ترجمہ:...”حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت حلالہ کرنے والے پر بھی اور حلالہ کروانے والے پر بھی۔“

حلالہ غیرشرعی کا بطلان:

درمختار میں ایک عجیب مسئلہ لکھا ہے، وہ مسئلہ ذرا باریک ہے، لیکن خیر مسئلہ یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکی کا نکاح جوڑ میں ہونا چاہئے، یعنی لڑکا لڑکی کے جوڑ کا ہو، جس کو کفو کہتے ہیں فقہ کی زبان میں، اگر کسی لڑکی نے بے جوڑ رشتہ کرلیا خفیہ طور پر، چاہے گواہوں کی موجودگی میں کیا ہو، ماں باپ کو اطلاع نہیں کی تو یہ نکاح نہیں ہوا...جیسے عام طور پر لڑکیاں کرلیتی ہیں ماں باپ کی اجازت کے بغیر، یہ نکاح نہیں ہوتا...اگر لڑکا واقعتاً اس کے جوڑ کا ہے تو پھر ان کا باہم نکاح ہوجاتا ہے عاقلہ بالغہ لڑکی کا، لیکن غیرکفو میں نکاح نہیں ہوتا، چاہے عدالت میں ہی کیوں نہ کیا ہو۔

اب درمختار میں مسئلہ یہ لکھا ہے کہ حلالہ جو ہوتا ہے، عام طور پر یہ بے جوڑ نکاح کے ذریعے ہوتا ہے، یہ جو لوگ حلالہ کروایا کرتے ہیں، یہ کسی ایسے آدمی کو تلاش کرتے ہیں جو اس عورت کے جوڑ کا نہ ہو، اور کرتے بھی خفیہ طور پر ہیں، لہٰذا یہ نکاح تو منعقد ہی نہیں ہوتا، جب نکاح ہی نہ ہوا تو بیوی بھی حلال نہیں ہوگی، لہٰذا سرے سے حلالہ ہی نہیں ہوتا۔ خیر یہ مسئلہ تو درمیان میں آگیا ورنہ میں منبر پر فقہ کے مسئلے بیان نہیں کیا کرتا، اس لئے کہ اس کے سمجھنے میں ذرا مشکل ہوجاتی ہے، کیونکہ اگر کوئی خصوصی مجلس ہو اور اس میں کوئی مسئلہ بیان کیا جائے تو لوگ سمجھ لیتے ہیں، پھر اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو لوگ پوچھ لیتے ہیں، اس کے برعکس عام مجمع میں کوئی شخص بات

سمجھتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا، اس لئے عام طور پر مسائل بیان نہیں کئے جاتے، مگر چونکہ یہ مسئلہ بیچ میں آگیا تھا تو میں نے بیان کردیا۔ بھائی! پھر بھی اگر کسی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو تو مجھ سے بعد میں سمجھ لے، بغیر سمجھے یہ حوالہ نہ دے کہ مولوی صاحب نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔

تقویٰ کا تعلق طلاق سے:

تو میں نے کہا کہ تقویٰ کا تعلق طلاق سے بھی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نکلنے کی صورت پیدا کردیتے ہیں، تو نے تقویٰ اختیار نہیں کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے کوئی صورت پیدا نہیں کی، کیونکہ تو نے ایک دم سے تین طلاقیں دے دیں، ایک دم سے تین طلاقیں دینا گناہ ہے، اب یہ طلاق کی بات آگئی تو ایک بات اور کہہ دیتا ہوں۔

وکیلوں کا طلاق نامہ:

تم کسی وکیل سے جاکر طلاق لکھواؤ گے، یا کسی منشی سے، یہ جو عرضی نویس ہوتے ہیں جو عدالتوں اور کچہریوں کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں، ان بے وقوفوں کو ہمیشہ تین ہی طلاقیں لکھنا آتی ہیں، آدمی کہتا ہے کہ بھئی طلاق نامہ لکھوانا ہے، وہ اُٹھا کے تین طلاقیں لکھ دیتے ہیں۔

اور ایک فقرہ وہ ہر طلاق نامے کے شروع میں لکھتے ہیں کہ میری بیوی بڑی نافرمان ہے، یہ ہے، وہ ہے، اور گھر سے وہ زیور بھی چرا کر لے گئی، یہ بھی ہوگیا ہے، وہ بھی ہوگیا ہے، جھوٹے الزامات کی بھرمار کرتے ہیں اور اس کے آخر میں پھر تین طلاقیں لکھتے ہیں، اور ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں بقائمی ہوش و حواس طلاق دے رہا ہوں۔

مولوی سے رُجوع کرو:

میاں! اگر طلاق دینی ہے تو وکیل کے پاس نہ جایا کرو، مولوی کے پاس آیا کرو جو تمہیں طلاق دینے کا طریقہ بتادے گا، تمہارا گھر برباد نہیں ہوگا، اُجڑے گا نہیں، پہلے وکیل کے پاس جاکر تین طلاقیں لکھواتے ہو اور پھر مولوی کے پاس آکر فتویٰ پوچھتے ہو، اب مولوی بے چارہ کیا کرے؟ ہاتھ تو تم نے خود کاٹ لئے، ایک آدمی کے سینے میں گولی مارکر اس کو مارنے کے بعد پھر آکر پوچھتے ہو کہ اس کو زندہ کیسے کریں؟ پے در پے تین گولیاں لگنے کی وجہ سے اب جو مرچکا ہے تمہاری تیغِ جفا سے قتل ہوچکا ہے، مولوی بے چارہ اس کو کیسے زندہ کرے؟ اس لئے تمہیں مشورہ دیتا ہوں- خدا نہ کرے کہ کسی کے گھر میں ایسی صورت پیدا ہو اور طلاق کی نوبت آئے- کیونکہ طلاق اللہ تعالیٰ کی مبغوض اور ناپسندیدہ چیزوں میں سے ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ“

(مشکوٰۃ ص:۲۸۳، بحوالہ ابوداؤد)

ترجمہ:... ”جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں اس میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اللہ تعالیٰ کو طلاق ہے۔“

خدا کرے کبھی کسی مسلمان کے گھر میں اس کی نوبت نہ آئے، لیکن اگر کبھی اس کی ضرورت پیش آجائے تو بھائی! منشیوں، عرضی نویسوں یا وکیلوں کے پاس جاکر طلاق نامے کا نوٹس نہ دِلوایا کرو، پھر یہ ایسے بے وقوف ہیں کہ طلاق بھجوانے کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے تو طلاق کا صرف نوٹس دِلوایا تھا، طلاق دِلوانا تو میرا مقصود ہی نہیں تھا۔ میرے بھائی! آکر مسئلہ بھی تو پوچھ لیا ہوتا، وکیل تو تمہیں مسئلہ نہیں بتائے گا، وہ تو جو تم کہوگے وہ تمہاری بیوی کو نوٹس بھیج دے گا۔

ایوبی شریعت پر عمل نہ کرو:

اور اسی طرح ہمارے کونسلر صاحبان انہوں نے اپنی نئی شریعت بنا رکھی ہے، یہ میں اپنے کونسلر کی بات نہیں کر رہا بلکہ پورے ملک کے کونسلروں کی بات کر رہا ہوں بھائی! یہ ایوب خان کے زمانے سے شریعت چلی آ رہی ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہے اور ایک ایوب خان کی شریعت ہے، یہ بھی تین طلاقیں دینے کے بعد مصالحت کرواتے ہیں، میں ان بزرگوں کو بھی مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ حرام کو حلال کرنے کی کوشش نہ کرو، شریعت میں تین طلاقیں دینے کے بعد رُجوع کرنے کی یا مصالحت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ دیکھو اس نے کتنی طلاقیں دی ہیں؟ اگر ایوب خان کی شریعت یا پاکستان کا قانون تمہیں تین طلاقیں دینے کے بعد بھی مصالحت کروانے کی اجازت دیتا ہے، تب بھی اس پر عمل کرنا حلال نہیں ہے، حرام ہے، اس لئے کہ قیامت کے دن ایوب خان کی شریعت نہیں چلے گی اور قیامت کے دن پاکستان کا قانون نہیں چلے گا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت چلے گی، اس کے مطابق مسئولیت ہوگی۔

تقویٰ پر نجات کی صورت:

تقویٰ اختیار کرو تو نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا“ (الطّلاق:۲)

ترجمہ:... ”اور جو شخص ڈرے اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے نکلنے کی صورت پیدا فرما دیتے ہیں۔“

مخرج کہتے ہیں دروازے کو، راستے کو، آدمی کسی مکان کے اندر بند ہو اور نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نکلنے کا راستہ پیدا فرما دیتے

ہیں، جو شخص تقویٰ سے کام لے گا، اس کے لئے راستہ ضرور نکلنے گا۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سیّدنا یوسف علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے کیسا راستہ پیدا فرمادیا تھا؟ انہوں نے پوشیدگی اور تنہائی میں تقویٰ سے کام لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا، چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے:

”کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ۔“ (یوسف:۲۴)

ترجمہ:... ”یوں ہی ہوا تاکہ ہم ہٹائیں اس سے بُرائی اور بے حیائی، البتہ وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں۔“

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ یوں ہی ہوا تاکہ ہم ہٹادیں اس سے بے حیائی کو اور بُرائی کو، نہ یہ کہ ان کو نہیں ہٹائیں، پھر یہ نہیں فرمایا کہ ہم یوسف علیہ السلام کو بے حیائی کے کام سے باز رکھیں بلکہ یہ فرمایا کہ بُرائی کو اور بے حیائی کو یوسف سے ہٹائے رکھیں، بے حیائی اور بُرائی نبی کے دامن تقدس کو آلودہ نہ کریں کیونکہ وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے بُرائی کو ہٹائے رکھا، ان کی عصمت کو داغ دار نہیں ہونے دیا، اور پھر جب وہ دروازے کی طرف بھاگے تو دروازے کھلتے چلے گئے، اسی لئے مولانا رومی فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خی آں یوسف وارمی باید دوید

ترجمہ:... ”اگرچہ اس عالم میں کوئی رخنہ نہیں جہاں سے آدمی نکل جائے لیکن یوسف علیہ السلام کی طرح آنکھیں بند کرکے دوڑ کے تو دیکھو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے راستے پیدا کرتے ہیں۔“

تقویٰ سے کام لو اللہ تعالیٰ کے ڈر سے کام لو، پھر دیکھو کہ میرا اللہ اس گنبد بے در ...ایسا گنبد جس کے اندر کوئی دروازہ نہیں... اس کے اندر تمہارے لئے دروازے پیدا کرکے دِکھائے گا، مشکل سے مشکل معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے نجات کی کوئی صورت پیدا فرمادیں گے، بشرطیکہ تقویٰ کا دامن نہ چھوڑو، تو متقی کو ایک اِنعام یہ ملتا ہے۔

تقویٰ اختیار کرنے پر اِنعام:

تقویٰ اختیار کرنے پر دُوسرا اِنعام یہ ملتا ہے کہ:

''وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ'' (الطّلاق:۳)

ترجمہ:...''اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے رزق عطا فرمائیں گے کہ اس کو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا۔''

کبھی خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہاں سے رزق عطا فرمادیں گے، لیکن جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اگر یہ تقویٰ ہو یعنی پوشیدہ اور ظاہر میں اللہ کا خوف ہو، تو ایسی جگہ سے رزق ملے گا جہاں سے گمان بھی نہ ہوگا۔

اللہ ہر جگہ ہے:

مشہور قصہ ہے کہ کوئی صاحب ایک بزرگ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لئے آئے، بزرگ نے فرمایا کہ: تمہیں بیعت تو کرلیں گے لیکن ذرا یہ ایک مرغی ہمارے لئے ذبح کرلاؤ، لیکن ذبح ایسی جگہ کرنا جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو۔ وہ گئے، کچھ دیر کے بعد واپس آگئے اور کہنے لگے: حضور! مجھے تو کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جہاں کوئی نہ دیکھتا ہو، اگر آپ یہ کہتے کہ کوئی انسان نہ دیکھتا ہو، میں کوئی نہ کوئی جگہ ڈھونڈ لیتا، لیکن آپ نے تو کہہ دیا کوئی نہ دیکھتا ہو، اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ دیکھتا ہے، مجھے تو کوئی ایسی جگہ

ملی نہیں۔ فرمایا: بس تمہیں یہی سمجھانا تھا کہ تم کوٹھڑی کے اندر بند ہو اور مخلوق میں سے تمہیں کوئی نہیں دیکھ رہا، مگر اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے، اس وقت عین اس حالت میں تم سے انتقام لینے پر قادر ہے، جب آدمی کے دِل کے اندر یہ یقین راسخ ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ میری ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور یہ کہ وہ ہر جگہ انتقام لینے پر قادر ہے، اسی جگہ مسخ کرسکتا ہے، آدمی کو پتھر بنا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے۔

یہ جو زمانۂ جاہلیت میں صفا و مروہ پر اِساف اور نائلہ نام کے دو بت رکھے ہوئے تھے، یہ دراصل مرد و عورت تھے، انہوں نے بیت اللہ میں بدکاری کی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہیں پتھر بنادیا ...عبرت کے لئے... اور لوگوں نے ایک کو صفا پر اور دُوسرے کو مروہ پر رکھ دیا، پھر بعد میں چلتے چلتے وہ پیر بن گئے، اور پیر بننے کے بعد پھر خدا بن گئے۔ جیسے کسی گدھے کو دفن کردیا جائے تو لوگ کچھ عرصے کے بعد اس گدھے کی قبر کو بھی پوجنے لگتے ہیں، یقین نہ آئے تو تجربہ کرکے دیکھ لو، بلکہ میرے سامنے ہی تجربہ کرلو، چنانچہ ساری دُنیا کے سامنے گدھا دفناؤ اور وہاں قبر بنادو اور پکی قبر بنادو، اور ایک جھنڈا گاڑ دو، دس سال کے بعد اس پر نیازیں چڑھتے ہوئے خود دیکھ لینا۔ تو اللہ تعالیٰ قادر ہیں، قادرِ مطلق ہیں، اللہ تعالیٰ عفو اور درگزر سے کام لیتے ہیں، معاف فرمادیتے ہیں، ہماری غلطیوں پر مؤاخذہ جلدی نہیں فرماتے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، لیکن رحمت سے مغرور تو نہیں ہونا چاہئے، تو یہ دو باتیں ایک اللہ تعالیٰ کے محیط ہونے کا تصور اور دُوسری اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا تصور، یہ دونوں باتیں پیدا ہوں تو پھر تقویٰ ''فی السِّرّ و العلانیة'' پیدا ہوتا ہے۔

اصلاحی مواعظ (۸ جلدیں) ایک نظر میں

جلد اول

مقصد حیات دنیا نہیں۔۔آخرت
محبت رسول ﷺ
لیلۃ القدر کی برکات
فضائل اعتکاف
عظمت قرآن
توبہ کیسے کریں؟
حسد کا علاج
غیبت ایک اخلاقی برائی
دنیا کی حقیقت
صبر کے درجات

جلد دوم

حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ
انسان پر گزرنے والے ادوار
روضہ اقدس پر حاضری
شب برات۔۔ایک تحقیقی جائزہ
صبر و شکر
زبان کی حفاظت
بہترین تاجر کی علامت
خوف خدا اور فکر آخرت
قبر کی تیاری ضروری ہے
مقام بندگی اور دعاء کی حقیقت

جلد سوم

آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش
موذن کے فضائل
اعتکاف کے آداب
رجال آخرت
تبلیغ والوں کے لئے ہدایات
شیعان علی اور حضرات اہل بیت
غصہ کے اسباب اور اس کا علاج
حج کے انعامات
غدار کی سزا
جواہر پارے

جلد چہارم

حضورؐ کے سفر حج کی تفصیلات
فضیلت شیخینؓ
حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں
حضرت علیؓ کی شہادت
دو بڑے بدبخت
شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی چند دعائیں
ریاکاری اور اخلاص
۱۲ ربیع الاول اور اس کے تقاضے
مدرسہ کے چار بنیادی اصول
اللہ کی نعمتوں کا استحضار

جلد پنجم

بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری
جذبہ ایثار، حکمت و دانائی
حضرت ابو درداءؓ کی پانچ نصیحتیں
عورتوں کا فتنہ
بدعت کی حقیقت
قرآن سیکھ کر پڑھنے کے فضائل
صوفیاء کے اخلاق
شہادت کی فضیلت اور اقسام
موت کے وقت کے احوال
شاہراہ انسانیت کی روشن قندیلیں

جلد ششم

قرابت نبوی ﷺ کا فائدہ
مہاجرینؓ و انصارؓ کی فضیلت
خواجہ معین الدین چشتیؒ
آداب تعلیم و تربیت
جھگڑے کے اسباب
صبر، تمام مسائل کا علاج ہے
جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک
ظلم و ستم اور حرص کے نقصانات
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا
عذاب الٰہی سے بچاؤ کی صورت

جلد ہفتم

معرفت الٰہی
صحابہؓ کا ایمان سیکھنا
اوقات نماز کی حکمتیں
آخرت کی تیاری
تین طلاق کا حکم
زندگی کے مراحل
مسجد کی تعمیر و آبادی کا ذوق
مخلوق کے ساتھ حسن سلوک
حرام اشیاء کی خرید و فروخت

جلد ہشتم

سنت کے مطابق نماز پڑھنا
نماز۔۔مناجات الٰہی کا نام
اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
نیک لوگوں کی صحبت
عبدیت کاملہ
امت میں اختلاف کا سبب
جدید تعلیم کے نتائج
بغیر علم کے مسئلہ بتانا
گیارہویں شریف
تعلق مع اللہ اور تصوف